ماہنامہ

نئے افق

کراچی

گرد: آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھر دیا

گردش: محبت کے گھروں مجبوری... کی سسکیاں... ایک لازوال داستان حیات

خالی دامن: ایک خواہشوں کے غلام کا قصہ اس کی پیاس صرف ایک بوند تھی مگر وہ پورا دریا پی جانا چاہتا تھا

بیوک: ماورائی موضوع پر ایک خوبصورت...

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 نئے افق پبلی کیشنز برقی میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی......!!

جیسے جیسے موسم تبدیل ہو رہا ہے اور گرمی بڑھ رہی ہے وہیں بجلی کی قلت بھی بڑھتی جا رہی ہے اور لوڈ شیڈنگ کا عرصہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ آدھے گھنٹے سے ایک گھنٹہ اور پھر دو گھنٹے ہوا۔ اب تو دو گھنٹے بعد دو گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ جاری ہے اور کہیں کہیں تو آٹھ آٹھ نو نو گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے۔

اب سونے پر سہاگہ سرکاری دفاتر میں جہاں پہلے ہی کام نہیں ہوتا اب دو روز کی چھٹیاں کر دی گئی ہیں اور بازار جو کھلتے ہی بارہ سے ایک بجے تک تھے انہیں پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ سرِ شام یعنی آٹھ بجے بند کر دیے جائیں کیونکہ کچھ ہی دن جاتے ہیں کہ مغرب کی نماز ساڑھے سات بجے ہونے لگے گی ملازمت پیشہ افراد جو پانچ چھ بجے تک اپنی ملازمت فارغ ہو کر گھر پہنچتے ہیں اس کے بعد وہ کچھ دیر آرام کر کے اپنی ضروریات کے لیے سات بجے تک بازاروں کا رخ کرتے ہیں۔ اور اب یہ ہوگا کہ جب وہ بازاروں میں جائیں گے تو بازار آدھے سے زیادہ بند ہو چکے ہوں گے یا بند ہو رہے ہوں گے۔ بجلی بچے نہ بچے لیکن لوگوں کو ایک نئی پریشانی لاحق ہو جائے گی۔ بجلی کی کمی دور کرنے کا یہ کوئی منتقلی عمل تو نہیں ہے ہونا تو یہ چاہیے کہ دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح جیسے افرادی قوت میں اضافہ ہو ویسے ویسے ان کی ضروریات یعنی پانی بجلی گیس کی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا رہے لیکن وطن عزیز میں تو روایت ہی اور چل رہی ہے جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ویسے ویسے مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے اور مہنگائی کا عفریت ملک میں بے روزگاری غربت میں اضافے کا باعث بن رہا ہے اور غربت بے روزگاری ملک میں جرائم کا سبب بن رہے ہیں کیونکہ پاپی پیٹ تو ہر کسی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اسے بھی تو بھرنا ہی ہے چاہے حرام سے بھرے حلال مال سے ملک کے طول و عرض میں پھیلنے والی بدامنی جرائم میں اضافے کا سبب جہاں بے روزگاری اور مہنگائی ہے وہیں ملک کے شہر و دیہات میں ہونے والی لوڈ شیڈنگ بھی اس میں معاون مددگار رہے جرائم پیشہ یا خالی پیٹ سے مجبور افراد کو لوڈ شیڈنگ کی تاریکی انہیں دعوت دے رہی ہوتی ہے بجلی کمپنی نے تمہارے لیے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا ہے تمام راستے ہی نہیں تمام گھروں میں بھی اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

حکمران عوام سے قربانی پر قربانی مانگ رہے ہیں۔ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی صدارت میں ہونے والی توانائی کانفرنس میں وزیر اعظم نے ارشاد فرمایا ہے کہ عوام کو صوبوں کو قربانی دینا ہوگی۔ قوم یعنی

عوام اب تک اور کیا کر رہے ہیں۔ مسلسل قربانی در قربانی ہی دے رہے ہیں۔ حکمرانوں نے تو قوم کو قربانی کا بکرا بنا رکھا ہے کرپشن بدعنوانی لوٹ مار وہ کریں اور قربانی عوام دیں۔ بجلی کے بحران پر قابو پانے کے لیے حکمرانوں نے کرائے کے بجلی گھروں کا ہوا کھڑا کیا لیکن ہوا کیا ان کی آڑ میں قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہی گیا۔ بجلی کی کمی تو کیا پوری ہوتی الٹا بجلی کے نرخوں میں اضافہ کر کے قوم کو لوٹا ہی جا رہا ہے۔ جیسے جیسے تیل کی قیمتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے ادھر بجلی کے نرخوں میں بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ سپریم کورٹ نے بجلی کے بحران پر اور کرائے کے بجلی گھروں کے معاملہ پر کارروائی تو کی ہے لیکن حکمرانوں کو اس کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ وہ بڑی دیدہ دلیری اور پامردی سے عدلیہ کے احکامات کو پامال کر کے عدلیہ کو بے توقیر کرنے پر کمربستہ ہیں۔ دوسری طرف عدلیہ جس طرح تحمل صبر اور برداشت کا مظاہرہ کر رہی ہے وہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے لوگوں میں مایوسی پھیلنے کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے۔ کیونکہ اب تک نہ کوئی این آر او فیصلہ پر عمل درآمد ہوا نہ نیب کے مقدمات میں ملوث وزیر اعظم اور دیگران کے حالی موالیوں کے جرائم کے بارے میں کوئی فیصلہ یا عمل درآمد ہوا متاثرین اپنی چالاکیوں حیلے بہانوں سے تاریخ پر تاریخ حاصل کر کے اپنے مقدمات کو طول دے رہے ہیں۔ تاکہ حکمرانوں کی حکمرانی کا وقت خیریت سے پورا ہو سکے اور پھر آئندہ انتخابات کے بعد تو بات بدل بھی سکتی ہے نئے حکمران نئی حکومت کیا رنگ لاتی ہے یہ تو ابھی کسی کو خبر ہی نہیں لیکن موجودہ حکمران اپنی حکمت عملی سے اپنے خلاف مقدمات و الزامات کا دفاع قانونی موشگافیوں سے کر رہے ہیں۔

ملک میں بجلی کا بحران بڑھتا ہی جا رہا ہے ہر آنے والا دن اپنی ہیبت میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ جوں جوں موسم میں گرمی آ رہی ہے توں توں عوام کے غصے میں شدت آتی جا رہی ہے۔ کہیں حکمرانوں کی یہ بھی کوئی نئی حکمت عملی تو نہیں کہ عوام کو بجلی کے بحران سے اتنا پریشان کر دو کہ وہ ملک میں ہر [illegible] مہنگائی [illegible] گاری کی طر[illegible] [illegible] اور صرف بجلی بجلی ہی پکارتے رہیں۔ [illegible] ابھی [illegible] [illegible] کے [illegible] سے ملک میں بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ [illegible] طول [illegible] [illegible] باعث بن رہا ہے۔ لوگ تنگ آمد جنگ آمد کے [illegible] ہو چکے ہیں۔ مرض بڑھتا ہی جا رہا ہے جوں جوں اس کی دوا کی جا رہی [illegible] اللہ پاکستان کی حفاظت فرمائے اور بدعنوان بدنیت بے ایمان لوگوں سے وطن عزیز کی حفاظت [illegible] آمین۔



گفتگو

عمران احمد

غیرت و احسان

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم دوسروں کے مشوروں کے محتاج نہ بنو بلکہ خود صاحب [illegible] بنو اور بے بلائے ہوئے کسی کے گھر کھانا کھانے نہ جایا کرو۔ تم کہتے ہو کہ جو ہم سے نیکی کرے گا ہم بھی اس سے نیکی کر[illegible] کرے گا ہم بھی اس سے برائی کریں گے لیکن تم کو چاہیے کہ تم اپنے آپ کو اس بات کا عادی بناؤ کہ جو تمہارے ساتھ احسان [illegible] اس کے ساتھ احسان کرو اور جو تم سے بدی کرے تم اس سے بھی بدی نہ کرو بلکہ اس پر احسان کرو۔ (ترمذی۔ مشکوٰۃ)

عزیزان محترم..... سلامت باشد!

سمجھ نہیں آتا کیا گفتگو کریں۔ دل و دماغ سائیں سائیں کر رہا ہے۔ ہر چہرہ متغیر اداس اداس' ہر بچہ سہما سہما سا سوال کرتا نظر آ رہا ہے ہمارے شہر بلکہ پورے ملک کو کسی دشمن کی نہیں بلکہ خود ہماری نظر کھا گئی ہے۔ چند روز قبل اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر نظر سے گزری امریکہ کے ایک شہر میں ایک لڑکی نے شراب کے نشے میں اپنی والدہ سے تکرار کرتے ہوئے اس کے پالتو کتے کو کاٹ لیا جس پر وہ زخمی ہو گیا۔ عدالت نے کتے کو کاٹنے پر لڑکی کو قید و جرمانے کی سزا سنا دی۔ ایک دوسری خبر ہمارے شہر کی تھی لیاری میں آپریشن کے لیے جانے والی پولیس کی بکتر بند نے ایک کمسن بچے کو کچل کر زندگی سے محروم کر دیا۔ حکومت اور وزیر داخلہ نے اس کارنامے کے مرتکب سمیت آپریشن میں شریک تمام سپاہیوں کی دعوت کرتے ہوئے انہیں انعام کا مستحق قرار دے دیا۔ ایک اور مختصر خبر پنجاب کے کسی علاقہ کی ہے جہاں ایک بیروزگار باپ نے علاج کے لیے پیسے نہ ہونے کے باعث بیٹے کو کرنٹ لگا کر ہلاک کر دیا۔ اللہ ہمیں اپنے حال پر خود رحم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ناز سلوش ذشے..... میر پور آزاد کشمیر۔ قابل عزت عمران بھائی اور نئے افق کے ساتھیوں کو گمشدہ ناز سلوش ذشے کا سلام۔ امید ہے میری غیر موجودگی میں آپ سب لوگ ٹھیک رہے ہوں گے گو کہ کچھ لوگوں کے ساتھ حادثات بھی گزرے' کچھ کے پیارے ان کا ساتھ چھوڑ کر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے' کچھ کے ہاں خوشیوں نے قدم رکھا' کچھ ازدواجی رشتوں میں بندھ گئے' کچھ بیمار رہے' کچھ سفر کی حالت میں رہے' کچھ ناراض رہے اور کچھ میری طرح مصروفیات کے ہاتھوں قید ہو کر گفتگو سے گمشدہ ہو گئے۔ تو لیجیے جناب! آپ کی محبتوں نے پکارا اور میں حاضر۔ لاکھ مصروفیات آڑے آئیں مگر نئے افق سے جو تعلق جڑا ہے نا اس کا ٹوٹنا ممکن نہیں۔ سب سے پہلے تو ان لوگوں کی محبتوں کی بہت ممنون ہوں جنہوں نے مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں اور خطوط میں یاد رکھا اور جو نہیں رکھ پائے ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہوں گی۔ اس کے بعد ان 8'5 ماہ میں آنے والے نئے قارئین کو میرا خلوص بھرا سلام آتے رہا کریں۔ آپ سب سے ہی ہماری محفل میں رونق ہوتی ہے۔ سرور شاد بھی بہت لمبے عرصے بعد حاضر ہوئے۔ اسی طرح امیر حمزہ چاند بہت عرصہ غائب رہے (میری طرح)۔ شاید سہیل عمران نام کے ایک بھائی ہوتے تھے وہ بہت عرصے سے نظر نہیں آئے۔ میرے عزیز بھائی آکاش بخاری لگتا ہے کشمیری بہن کو بھول گئے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہی ہوں تلخیاں بھلا کر گفتگو میں حاضری دیں۔ اگر اس دفعہ آپ کا خط نہ آیا تو میں نے ناراض ہو جانا ہے۔ امی جان بھی آپ کو سلام اور دعائیں کہہ رہی ہیں۔ لیجیے ابن مقبول صاحب بھی پردہ نشین ہو گئے۔ اچھی بات نہیں ہے۔ راحیلہ تاج سے گزارش ہے کہ کہانیوں کے علاوہ بھی ایک آدھ خط بھی لکھ لیا کریں۔ ان ناموں کے علاوہ میرے وہ تمام پرانے ساتھی جو کبھی گفتگو کی زینت ہوا کرتے تھے کہاں ہو بھائی صاحبو......؟ لوٹ آؤ۔ 2012ء جہاں اتنے مسائل اور تبدیلیاں اپنے ساتھ لایا' وہیں نئے افق میں بھی خاطر خواہ تبدیلی ہوئی۔ جیسے کہ فہرست بہت منظم طریقے سے ترتیب دی گئی۔ رسالے کی قیمت 40 روپے کر دی گئی۔ خطوط میں ناموں کو واضح کر دیا گیا۔ ٹائٹل بھی جاذب نظر اور نئے افق کی کہانیوں کی عکاسی کرتا ہوا بنایا گیا۔ یہ سب مثبت تبدیلیاں ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ مثبت تبدیلیاں ہمیشہ عروج بخشتی ہیں۔ حسام بٹ بھائی نے ہمیں نئے افق میں جوائن کیا تو وہیں اے حمید اور یعقوب جمیل جیسے ہیروں سے ہم محروم ہوئے۔ ان کی کمی تو کوئی پوری نہیں کر سکتا مگر دعا ہے خدا ہمارے قلموں کو بھی انہی سی پختگی عنایت فرمائے آمین۔ شہناز بانو جی کراچی آنا اور 2 ماہ کے وقفے سے 2 بار آنا محض اتفاق ہی تھا۔ ایسے میں آپ کے ہاں آنے کا وعدہ پورا نہ کر پاتی تو زیادتی ہوتی۔ آپ کی محبتوں اور خلوص نے تو میرا دل جیت لیا قسم سے۔ باقی آپ کی کہانی ابھی تک پڑھ نہیں سکی ہوں۔ میری مصروفیات کا علم تو ہے نا آپ کو۔ فقیر

محمد بخش صابر انکل کو میرا سلام۔ جناب ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ ناچیز کو دعاؤں میں یاد رکھا۔ محمد ارشاد قریشی بھائی لیجیے میں نے آپ کا سلام قبول کرتے ہوئے حاضری دے بھی دی' کوشش کروں گی کہ اب باقاعدگی سے حاضری دیتی رہا کروں۔ سید عبداللہ شاہد بھائی آپ کے حیدر آباد کا روڈ تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہے۔ دسمبر اور فروری میں کراچی آنا ہوا۔ یقین مانیں کہ رات کو پونے ایک بجے میں نے "خوش آمدید حدود کراچی/سندھ" پڑھا۔ کزن ساتھ سو رہی تھی میں نے اس کو جگا کر کہا۔ بہن تم تو کہتی تھیں ہم صبح گیارہ بجے تک کراچی میں داخل ہوں گے۔ لو دیکھو کراچی آ گیا وہ بے چاری نیند میں تھی اٹھی اور باہر اندھیرا دیکھ کر کہنے لگی۔ دیکھتی رہو کب کراچی آتا ہے۔ میں پہلی پہلی بار کراچی جا رہی تھی۔ خوشی کے مارے نیند کا گمان تک نہ تھا۔ پر بھائی صاحب! آنکھیں سفید ہو گئیں مگر نہ حیدر آباد کا وہ لمبا شیطانی روڈ ختم ہوا نہ کراچی آیا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ آنکھ لگنے کے بعد بھی اگر باہر دیکھتی تو وہی لمبا روڈ' دونوں اطراف ریت' جھاڑیاں' ویرانی اف کراچی تھا کہ کلکتہ..... تب مجھے یاد آیا ماموں نے کہا تھا بیٹا جی پنجاب' سرحد' بلوچستان کے رستے تو منٹوں میں ختم ہوتے ہیں پر یہ جو سندھ کا رستہ ہے نا دیدے ترس جاتے ہیں پر کوئی نیا منظر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اسماء الحسنیٰ حسام بٹ کا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ خدا ان کو اور ہمت دے۔ اقرا میں شرم و حیاء کے موضوع پر احادیث کے مطالعہ سے ایمان تازہ ہوا۔ دستک کا موضوع بھی خوب رہا۔ گزشتہ چکر میں اتفاق سے مجھے بھی ایم کیو ایم کا حلقہ اور لوگ دیکھنے کو ملے۔ پر یقین مانیں وہ جگہ کیماڑی سے اتنی ہی دور ہے جتنا پنڈی سے میر پور۔ "سیوک" نئی کہانی لگی۔ مگر ابھی تک ایک بھی قسط کا مطالعہ نہیں کر سکی۔ "جواز" ایک نفسیاتی کیس تھا۔ مغربی ادب تھا مگر یقین مانیں انجام سر پر سے گزر گیا۔ "خونی ڈراما" پاکیزہ رشتوں کی کہانی تھی۔ بھائی کی محبت بہن کے لیے جتنی پاکیزہ تھی بہن کی محبت بھی اس کے مقابلے میں کچھ کم نہ تھی۔ بھائی بہن کے لیے سب کچھ کرنا چاہتا تھا اور بہن نے بھائی کو بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔ ویل ڈن راحیلہ۔ "گمنام" اپنی جگہ ایک اچھی کہانی تھی۔ مگر میں شہناز بانو سے اتفاق کروں گی۔ نئے افق کا مزاج جاسوسی اور سچی کہانیوں کا ہے۔ اس میں افسانوں کا تڑکہ لگا کر مزا خراب مت کریں۔ گو کہ افسانے اپنی جگہ بہترین ہیں۔ مگر آنچل میں اور بھی زیادہ اچھے لگیں گے۔ البتہ "کانچ کے رشتے" کا موضوع الفاظ کی ادائیگی رشتوں کی نزاکت ان سے بڑھ کر قرآنی آیت کا حوالہ۔ ان سب باتوں نے مل کر اس کہانی کو سچ میں معاشرتی ناسور کی کہانی بنا دیا۔ جھوٹے رشتوں کے بل پر [illegible] سبق آموز کہانی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ "[illegible]" کا موضوع اچھا تھا مگر مجھے اس کا طاہرہ کہانی کے ساتھ ٹھیک [illegible] کہانی رہی۔ کیوں؟ اس لیے کہ ایک بظاہر عام [illegible] 4 [illegible] کی خاطر ایک قابل ترس لڑکے سے جھوٹی [illegible] آخر میں انجام [illegible] ایک [illegible] دل چاہا [illegible] چار ہزار کی خاطر کسی کی زندگی داؤ پر لگانا کہاں کا انصاف ہے۔ مگر پھر بھی میں کہوں گی نازک جذبات سے گندھی یہ کہانی واقعی انعام کی مستحق ہے۔ "کرب مسلسل" وہی معاشرتی رویوں پر مبنی کہانی۔ "انوکھا انتقام" بھی عام سی رہی۔ اسے تو افسانہ ہونا چاہیے تھا' ویسے مجھے یہ سچی کہانی لگی تو نہیں۔ "تنہائی کا سانپ" اپنے پلاٹ کے ساتھ انوکھی اور دلچسپ رہی مگر ایک اعتراض بجا ہے ایک 50 سالہ خاتون نارووال جیسے علاقے میں موٹر بائیک کیسے چلاتی ہو گی؟ وہ کوئی نوجوان لڑکی ہوتی یا اس کے پاس ٹوٹی پھوٹی ہی سہی ایک عدد گاڑی ہوتی تو پھر بھی ماننے والی بات تھی۔ انجم فاروق ساحلی اس بات کی وضاحت ضرور کیجیے گا۔ آخر میں ذکر یعقوب بھٹی کی "امید سحر" کا۔ یقین مانیں الفاظ کم پڑ گئے ہیں اس کہانی کی تعریف کو۔ اوپر سے یہ کہانی آئی بھی ان دنوں ہے جب سیاچن میں ٹنوں برف تلے ہمارے کئی بھائی برف کے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ امید سحر سے واقعی ایک امید پیدا ہوئی ہے کہ جہاں یہ دونوں اس برفانی کھائی سے باہر آ سکتے ہیں وہیں ان بہادر نوجوانوں سے بھی کچھ بعید نہیں کہ کوئی زندہ بھی ہوں۔ کیونکہ اس رب تعالیٰ کے ہاں کچھ بھی بعید تو نہیں۔ وہ اصحاب کہف کو تین سو سال تک زندہ رکھ سکتا ہے تو ادھر بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرا بھوجا ایئر لائن کی پہلی اندرون ملک پرواز کا حادثہ یقین مانیں سن کر اتنا شاک لگا کہ ابھی تک سنبھل نہیں پائی۔ اسی طیارے میں جامعہ بنوریہ کے معلم عطاء اللہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ سوار تھے۔ جامعہ بنوریہ میں میری بھابی برسوں سے معلمہ کا فرض سر انجام دے رہی تھیں۔ انہی کی زبانی ایک عظیم عالم کا پتا چلا تو دل خون کے آنسو رویا۔ خدا ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ آپ کی دعاؤں کی طالب۔

محمد اسلم جاوید ..... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی' ہمیشہ سلامت رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب۔ السلام علیکم آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں بک اسٹال پر اپنے محبوب پرچے کے تازہ شمارے سے ملاقات ہوئی جسے دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا ایسا دلکش پرچہ نکالنے پر [illegible] مبارک باد قبول کریں۔ نئے افق پہلے سے زیادہ قارئین میں مقبول ہے۔ اس بار سرورق پھیکا سا تھا ذرا سرورق پر توجہ دیں' قاری سرورق [illegible] پرچہ خریدنے پر مجبور ہوتا ہے۔ آپ ہم سے ہزاروں میل دور ہونے کے باعث میرے دل کی دھڑکنوں میں بسے رہتے ہیں۔ جو

دوست احباب مجھے یاد کرتے ہیں میں تہہ دل سے ان کا بے حد مشکور ہوں۔ آئندہ بھی میری تحریریں پڑھ کے اپنی رائے سے نوازیں گے۔ خوش بو سخن میں غزل اور خط شائع کرنے پر میں بے حد ممنون ہوں امید آئندہ بھی یاد فرمائیں گے۔ پرچے کا ہمیں بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ ویسے نئے افق کے تمام سلسلے یادگار ہیں خصوصاً گفتگو اقرأ اور دستک ذوق آگہی بزم سخن اسماء الحسنیٰ خوش بو فن مترجم کہانیاں ناقابل فراموش واقعات اور سلسلہ وار کہانیاں اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں۔ جن تحریروں سے میں متاثر ہوا ان میں گردش گم نام امید سحر سیوک بازی گر کرب مسلسل انوکھا انتقام کانچ کے رشتے وغیرہ اگر آپ پرچے میں کچھ تبدیلیاں کریں تو پرچہ پہلے سے زیادہ مقبولیت حاصل کر سکتا ہے۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ کسی قریبی شمارے میں شائع کر دیں بشرطیکہ آپ کا تعاون ساتھ رہے۔ موسم آہستہ آہستہ بدل گیا۔ شدید معاشی بحران ہے۔ جس سے ہر آدمی پریشان ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی الجھن کا شکار ہے۔ قدم بہ قدم آپ نے میری حوصلہ افزائی کی ہے بہت بہت شکریہ۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے سدا آپ کی زندگی میں خوشیوں کا راج رہے آپ کے گلشن میں ہمیشہ رنگ برنگے پھول مہکتے رہیں۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ حافظ

ریحانہ سعیدہ...... لاہور۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم! اللہ ہمارے ملک کو سلامتی دے اور ہمارے حال پر رحم کرے کیونکہ 1947ء میں دی گئی قربانیاں تو رنگ لائیں اور پاکستان بن گیا لیکن اب ہم جو دقتاً فوقتاً قربانیاں دے رہے ہیں۔ اس سے ہمارے ملک میں تو انقلاب ہی آنا چاہیے کبھی سیاچن گلیشیر پر فوجی جوانوں کی قربانی کبھی بھوجا ایئر لائن کے ذریعے 127 جانوں کی قربانی جبکہ حکومت اور اقتدار اعلیٰ کے مالک مغلیہ شہنشاہوں کی طرح عیاشیوں میں مبتلا ہیں پتا نہیں ہماری یہ انفرادی اور اجتماعی قربانیاں کب رنگ لائیں گی۔ پچھلے دنوں زرداری صاحب نے اجمیر شریف پر ڈالرز اور چاندی کی انگوٹھیوں کا نذرانہ دیا۔ جناب محترم یہی نذرانہ اگر وہ داتا دربار یا لعل شہباز قلندر کے مزار پر دیتے تو آدھا کراچی اور آدھا لاہور دو وقت کی روٹی کھا لیتا۔ خیر یہ خوش آئند بات ہے کہ حکمران جب عملی طور پر قوم کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو مزاروں پر جا کر دعائیں ہی مانگتے ہیں۔ خیر یہ تو تھے پاکستان کے سیاسی حالات۔ جناب رسالہ ملا ایک پراسرار سے سرورق کے ساتھ۔ آج کے پرآشوب دور میں جب بھول جانا آسان ہے اور یاد رکھنا مشکل۔ تو جناب جن ساتھیوں نے مجھے یاد رکھا میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ خورشید پیرزادہ کی سیوک اچھی تحریر ہے اور طاہرہ نے تو جب سے پڑھی ہے ہر کام سے پہلے مجھے کہتی ہے ایسے سیوک ہمیں بھی مل جائیں تو مزا آ جائے۔ جواز کی سمجھ نہیں آئی حالانکہ سائیکولوجی میں نے بھی پڑھی ہے۔ خونی ڈراما راحیلہ تاج کی منفرد کہانی تھی۔ اسماء قادری کا موضوع بھی اچھا تھا۔ نوشاد صاحب ذہن میں رکھیے گا کہ آپ نے ایسا لکھاری نہیں بننا جو پروفیشنل ہو کرب مسلسل میں کوئی نظم و ترتیب نظر نہیں آئی۔ انجم فاروق نے حساس موضوع پر بہت اچھی کہانی لکھی ہے۔ یہ شرعی کام آج کل جس طرح ہوس و زر کا ذریعہ بنتا ہوا ہے۔ آپ نے اس کی اچھی ترجمانی کی ہے امید سحر کا اختتام اچھا ہوا ہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔ اللہ حافظ

نوید اسلم..... منین آباد۔ محترم عمران احمد السلام علیکم امید ہے بخیریت ہوں گے۔ کافی عرصے بعد محفل گفتگو میں واپسی ہوئی ہے۔ دراصل مصروفیت اتنی تھی کہ لکھنے کا وقت ہی نہ ملا۔ کافی عرصے بعد سرور شاذ اور امیر حمزہ چاند کو دوبارہ گفتگو میں حاضر دیکھا تو دل نے کہا کہ جو مرضی ہو جائے اس بار ضرور محفل گفتگو میں حاضری دیں گے تاکہ دوست احباب بالکل ہی نہ مجھے بھول جائیں۔ تو سب سے پہلے معروف رائٹر یعقوب جمیل صاحب کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور سچے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور سوگواران کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ناظم بخاری صاحب جہاں آپ کی شادی کا پڑھ کر خوشی ہوئی وہیں آپ کے والد صاحب کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ اللہ دتہ عابد صاحب آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ سرور شاذ نے تو آپ کو ایڈوانس میں مبارک دے دی تھی لیکن ہم نے سوچا کہ تسلی ہونے کے بعد مبارک دیں گے آپ کی شادی میں معروف رائٹر سرور شاذ منین آباد کے معروف شاعر امیر حمزہ چاند عبدالحکیم صاحب اصغر علی صاحب اور احمد علی کیف صاحب کے ساتھ خوب محفل جمی اور کافی انجوائے کیا۔ امیر حمزہ چاند صاحب ہمیں آپ کے دوسرے شعری مجموعے کا انتظار ہے جلد خوشخبری دو۔ اصغر علی ناصر صاحب اب آپ بھی محفل میں واپس آ جائیں۔ اس ماہ صرف گفتگو ہی پڑھ سکا ہوں۔ جس میں شہناز بانو صاحبہ شبنم ارشاد صاحبہ سرور شاذ صاحب فقیر لنگاہ صاحب اور دوسرے ساتھیوں نے اپنی گفتگو سے محفل گفتگو کو چار چاند لگائے ہوئے تھے آئندہ ان شاء اللہ ریگولر لکھنے کی کوشش کروں گا اور رسالے پر تبصرہ بھی آئندہ ماہ ہی ہوگا تب تک کے لیے اجازت۔ اللہ نگہبان

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ امید قوی ہے کہ آپ مع اپنے محنتی اسٹاف کے اللہ کریم کی رحمت کے سائے میں ہوں گے۔ پراسرار ٹائٹل والا نئے افق کا مئی کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے ایک بہت بڑے المیے کی نشان دہی کی ہے۔ ہم مسلمان (شاید ہم اصل میں وہ نہیں ہیں) ایک دوسرے کو دکھ دے کر اور نقصان

پہنچا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ورنہ تو جب مسلمان دوسرے مسلمان کو السلام علیکم کہہ دیتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمہارا مسلمان بھائی ہوں۔ مجھ سے تیری عزت و ناموس مال و دولت اور جان بالکل محفوظ ہیں۔ شاید آج کل ہم نے اس لیے ایک دوسرے کو سلام کرنا چھوڑ دیا ہے کہ دوسرا شخص کہیں اپنی جان و مال عزت آبرو کے محفوظ ہونے کا گمان نہ کر بیٹھے۔ مسلمان تو مسلمان بھائی کے لیے بہت نرم گوشہ رکھتا ہے مگر آج کل اس کے بالکل برعکس ہے میرا ایک شعر ہے

ہو غیر سے ملنا تو بریشم کی طرح نرم
اپنوں کے لیے صورت فولاد ہے مومن

اسماء الحسنیٰ میں حسام بٹ صاحب نے اللہ کریم کے صفاتی نام وہاب کے فیوض و برکات سے ایمان کو تازہ فرمایا۔ اقرأ میں جناب طاہر قریشی صاحب نے شرم و حیا کی فضیلت کو بااحسن طریقہ سے اجاگر فرمایا۔ گفتگو میں محترمہ شہناز بانو صاحبہ اس بار آپ کو کرسی صدارت ملنے پر دلی مبارک باد۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں خواہ وہ حقیقی ہوں یا منہ بولے۔ ہمارے یہاں ایک شخص کی تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا وہ تینوں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتیں اور کبھی کبھی بچے ایک دوسرے کے ساتھ لڑ جھگڑ بھی پڑتے پھر اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو ایک بیٹا عطا فرما دیا۔ بچے کی پیدائش کے چند روز بعد بچیاں پھر کسی بات پر لڑ پڑیں۔ تو بڑی بہن نے لڑنے والی ہمجولی سے تنگ کر کہا اب او منہ سنبھال کر بات کر اب ہمارا بھی بھائی آ گیا ہے۔ سرور شاذ بھائی آپ کا آنا سر آنکھوں پر دراصل نئے افق کے قارئین اور لکھاری سگے بہن بھائیوں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں برابر کے شریک ہیں۔ محترمہ قمر آراء جہاں نے بڑے دکھ کی باتیں سنائی ہیں۔ محترمہ مسلمان ہونا تو بہت بڑی بات ہے مسلمان ہونا تو انسانیت کی معراج ہے۔ لیکن جو ہمارے کرتوت ہیں ان سے تو ہمارا انسان ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا خداوند کریم ہمیں شعور عطا فرمائے آمین۔ اس دفعہ عصمت اقبال عین صاحبہ مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں۔ موصوفہ شارٹ ہینڈ کی ماہر لگتی ہیں۔ امیر حمزہ محترم غزل پسند فرمانے پر شکر گزار ہوں۔ بشیر احمد بھٹی صاحب تبصرہ پسند فرمانے کا شکریہ۔ ریاض [illegible] صاحب حوصلہ افزائی کا شکریہ آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مندی کی دولت عطا فرمائے آمین۔ مجاہد ناز عباسی کا تبصرہ [illegible] صابر لنگاہ کا پرچے پر منفرد انداز کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے [illegible] غزل پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔ [illegible] کا تبصرہ حسب سابق بڑا جاندار اور شاندار تھا۔ [illegible] لوگ اپنے سینوں میں درد مند دل رکھتے ہیں وہ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ موصوف انہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ جناب سید عبداللہ شاہد نے بھرپور تبصرے کے ساتھ گفتگو کو اختتام تک پہنچایا ویسے بھی ان کے تبصرے پر تبصرہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اللہ کریم انہیں بہت عزتیں عطا فرمائے آمین۔ اس بار خوش بوئے سخن عمر اسرار کا انتخاب تھا۔ مجاہد عباسی نقوی طاہرہ جبین تارا ماہ نور ریحانہ سعیدہ اور جناب صابر لنگاہ کی نظمیں خوب رہیں۔ محترم ڈاکٹر واجد نگینوی صاحب کی غزل کو آپ نے بے ترتیب کر دیا۔ پروف ریڈنگ فرما لیا کریں۔ محمد عثمان علی نے محسن نقوی صاحب کی غزل کا انتخاب کیا۔ مگر غزل ان کے نام سے چھپ گئی۔ میثم علی آغا وسیم اختر محمد اسلم جاوید محمد عبداللہ عاطر اور سلمیٰ غزل کی غزلیں خوب رہیں۔ فہد بھائی ناراض نہیں ہونا۔ شاعری میں ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے آپ کے اندر ایک اچھا شاعر چھپا ہوا ہے۔ سب کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد۔ پیارے نئے افق کی پیاری پیاری محفل میں بہت پیار سے پڑھنے والوں دوستوں لکھنے والوں اور ان لوگوں کو جو اپنی محنت اور ذہانت سے ایک مہینے کی جدوجہد کر کے کانٹ چھانٹ کے بعد ایک خوب صورت دیدہ زیب عمدہ ڈائجسٹ ہمیں ہر ماہ پڑھنے کو ہمارے شہروں تک پہنچاتے ہیں۔ سارے اسٹاف کو اور خصوصاً جناب محترم عمران قریشی صاحب مشتاق احمد قریشی صاحب طاہر قریشی صاحب کو بہت بہت سلام ہو۔ محترم یعقوب جمیل اللہ کو پیارے ہو گئے سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ انہوں نے ادب کے لیے بہت کام کیا اور پڑھنے والوں کو یادگار ناول ڈرامے دیے۔ جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ اللہ پاک ان کے گھر والوں کو صبر عطا فرمائے آمین۔ محبوب ماہنامے میں محبتیں ہی محبتیں ملی ہیں مگر ہم نے قلم گھسیٹ گھسیٹ کے ایک نہیں بلکہ تین چار کہانیاں لکھ ماری تھیں۔ لکھ تو ماریں افق کے دیس بھی بھیج دیں جن کا کوئی اتا پتا نہیں (عمران قریشی صاحب میرے کان میں چپکے سے بتا دیں کہ ان کا کیا بنا) ایک آدھ شائع ہونے کے لائق ہے یا اس نالائق کا کہانی کار بننے کا سپنا ادھورا ہی رہ جائے گا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ افق کی تبدیلیوں میں ایک تبدیلی یہ ہوگی کہ عبدالمالک کیف کی کہانیوں کے لیے اک نیا گوشہ ہوگا۔ خیر چھوڑیے ایک نظر تبصرہ اور تبصرہ نگاروں پر ڈالتے ہیں۔ محمد فہد جتوئی بہت دنوں بعد آئے کیا حال چال ہیں۔ جناب تم ہی غائب ہو ہم تو کبھی کبھی حاضر رہتے ہیں۔ طاہرہ جبیں تارا بھی حاضر رہیں۔ ناظم بخاری بڑے عرصے بعد محفل میں آئے جناب کو شادی مبارک ہو۔ محمد اسلم جاوید بشیر احمد بھٹی مجاہد ناز

انجم فاروق ساحلی بھی اپنے خطوط کے ساتھ حاضر رہے۔ ریاض بٹ حسن ابدال' بٹ صاحب آجکل کہاں ہیں کبھی ہمیں بھی یاد کرلیا کریں۔ عبدالحکیم ساجد بھائی کیسے مزاج ہیں۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ' محمد شفاعت حسنین صابر لنگاہ' مع فیملی گروپ ... نئے افق میں عقیدت کے ساتھ حاضری لگواتے ہیں اور ہم سب سے محبت رکھتے ہیں۔ سب کو بہت ہی عقیدت و محبت سے سلام ... اپنے کچھ لمبے خط کے ساتھ نمایاں رہے۔ بہت خوب صورت پیرائے میں تبصرہ کرڈالا اگر تھوڑا سا ہمارے لیے بھی لکھتے تو آپ کا قلم رک نہیں جاتا تھا۔ خیر عبداللہ شاہد بھائی اللہ پاک آپ کو خوش رکھے آمین۔ محمد ارشاد قریشی اسلام آباد نے بھی حاضری لگوائی اور ان کی باتوں سے مستفید ہوئے۔ اور آخری خط منیر احمد ساغر کا تھا۔ جناب کو بھی بہت محبت سے سلام اب کچھ نئے افق پر تبصرہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ٹائٹل کی تو سمجھ نہیں آئی۔ یہ خوفناک ڈائجسٹ کے جیسے ٹائٹل کیوں چھاپے جارہے ہیں۔ ہمارے ڈائجسٹ پر کیا صنف نازک کے خوب صورت ... اچھے نہیں لگتے؟ ایسے ٹائٹل کا کیا فائدہ کہ ہم جیسا نازک دل ڈر کے مارے ڈائجسٹ ہی نہ لے اور پڑھنے سے محروم رہے۔ ابتدائیہ بدلیوں سے مزین تھا۔ یعنی الگ الگ کیٹیگریز بنی ہوئی تھی جنہیں مغربی ادب' افسانے' ناول' سچی کہانیاں' مستقل سلسلے میں تقسیم کیا گیا تھا۔ دستک میں 'مشتاق احمد قریشی' کی باتیں تحمل سے سنیں اور حالات سے باخبر ہوئے۔ اسماء الحسنیٰ میں اللہ تعالیٰ کے پاک نام کی تعریف کے ساتھ اس پیارے اسم مبارک کے بارے میں فضائل و خواص بھی بتائے گئے۔ جن کے کرنے سے انسان کے اچھے اعمال میں اضافہ کے ساتھ دنیا سنور سکتی ہے۔ ایسے ہی اقرأ جس میں طاہر احمد قریشی کی جانب سے کالم لکھتے ہیں جس میں ہم سب کو دین و دنیا کی مفید باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔ جن سے دل میں لگے زنگ کو کھرچنے میں مدد ملتی ہے۔ کہانیوں میں بیت المقدس' الماس ایم اے کی اچھوتی تحریر جس سے ہمیں تاریخ کے گزرے لمحوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے اور اس وقت کے مسلم سلطان و خلفاء نے کس طرح کفر کی طاقتوں کو ملیامیٹ کیا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ کیا ظلم کیے گئے۔ سب حقائق جاننے کو مل رہے ہیں۔ بازی گر کی کمی شدت سے محسوس کی۔ امید سحر نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ یعقوب بھٹی نے کمال کے مناظر ناول میں تخلیق کیے تھے۔ جیسے کہ پڑھنے والا خود وہاں ہو۔ اعتبار شرط' عائشہ خان کی لکھی کہانی بھی بہت خوب تھی۔ واقعی شہر کے لڑکے لڑکیاں ایک جیسے اسٹائل رکھتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ لڑکا جارہا ہے یا کہ لڑکی۔ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ خوش بو سخن میں محمد اسلم جاوید' عصمت اقبال عین' وسیم اختر' خیثم علی آغا' ریحانہ سعیدہ' منیر احمد ساغر' محمد عثمان علی' پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی' عالیہ انعام' قمر جہاں' عبدالرحمان ساغر اور ریاض حسین قمر نے خوب بنسایا۔ ذوق آگہی میں بے حس سماج کے بے رحم رویے میری لکھی گئی تحریر پر میرا نام نہ تھا بہت افسوس ہوا ایسا تو نہ کریں ہماری محنت پر پانی تو نہ پھیریں کیونکہ ہم سیاہی والے پین سے لکھتے ہیں۔

عالیہ انعام الحق ... کراچی۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ترقی اور کامیابیوں سے خوب نوازے اور آپ کی ہمت پر سدا بہار رہے۔ امید کے جگنو اور ایک ... لفظوں کے پھول لیے پھر سے حاضر خدمت ہوں۔ بڑا دل کرتا ہے کہ ابتدا میں کھلکھلاتے ہوئے لفظوں کا استعمال کروں ہی شاعر کی طرح یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی خوش بو جیسی بات کروں مگر ارد گرد پھیلی تباہی' بے رونقی' بے وقعت ہوتی زندگی' خون ہوتی خواہشیں' بے سبب ہوتی آرزوئیں' دفن ہوتی ہوئی انسانی قدریں' موت کا رقص عریاں' آسیب زدہ گلیاں' کاندھوں پر جوان لاشے تو دل بس یہ سوچتا ہے کہ بس ... ان کی سچائی کا دیکل بن جاتا ہے کہ اب سعی کا امکان اور نہیں۔ کراچی کا لہو لہو وجود صبح شام گرتی لاشیں کہیں کوتاہیوں کے سایہ ... احتجاج کے ریوڑ کہیں بھوک کے طفیل بکتی ہوئی امیدیں' کہیں عزتوں کے اٹھتے ہوئے جنازے کہیں معصوم کلیوں جیسے بچپن' ... ظلم کی پھانسی کمان پر ... اور کہیں ... ناامیدی کے سیاچن گلیشیر میں گم ہوئی کتنی ہی آرزوئیں اور خواہشیں کہ جن کے لیے کہیں ماں کا آنچل دعا بنا ہوا ہے۔ کہیں کسی نازک بچپن کے دل میں کھلونے کی ضد کی طرح مچل رہا ہے۔ کہیں کسی بہن کا مان لڑکھڑا رہا ہے۔ کہیں کسی کا سہاگ سسک رہا ہے۔ کہیں کسی بچی کا روشن مستقبل امید کے دیے کی طرح ٹمٹمار رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری آزمائشوں کو ختم کردے کہ ہم بڑے گناہ گار ہیں اس کی کسی بھی آزمائش کے قابل نہیں اللہ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے آمین۔ عمران بھائی سرورق کے حوالے سے کچھ لکھنا چاہوں تو ذہن میں ایک پرانے گانے کی گونج بازگشت کرنے لگتی ہے کہ میں بولوں گا تو بولو گے کہ بولتا ہے۔ عمران بھائی پھر بھی ایک جملے میں بات ختم کروں گی کہ یکسانیت کی انتہا ہو گئی ہے۔ نئے شمارے کے دھوکے میں اکثر پرانا اٹھا لیتے ہیں۔ دستک میں حالات حاضرہ پر مشتاق انکل کی سیر حاصل گفتگو پڑھنے کو ملی لگا کہ ہمارے خیالات کو زبان ملی مگر غلطی سے عنوان کچھ غلط پرنٹ ہو گیا ہے۔ کراچی میں چینوٹی برادری کی بھرمار ہے۔ مگر یہاں پر بات یقیناً چینوٹی کی ہورہی ہے۔ "گفتگو" میں رونقیں تو ہر سطر پہ لگی ہوئی ہیں۔ شاذ بھائی کی واپسی نے تمہیں چار چاند لگادیے۔ بھائی صاحب آپ کو کافی بار پکارتی رہی ہوں۔ شکر ہے کہ جواب تو آیا۔ دل مگر بریل دعا گو رہا ہے کہ آپ سے ایک تعلق تو بنایا ہے۔ آپ کو بھائی مانا ہے آپ کی ناراضی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ وجہ سمجھ نہیں آتی جب آپ

مانتے ہیں کہ آپ سمجھوتہ نہیں کرپاتے۔ لڑ پڑتے ہیں تو اس کا اعتراف ہی ہمیں یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے اللہ آپ کو خوشیوں سے نوازے اور آمد کا یہ سلسلہ پھر مت روک دیجیے گا۔ شہناز باجی آپ سے شرمندہ ہوں آپ بھی سوچتی ہوں گی کہ بڑا بھاؤ کھاتی ہے مگر کیا کروں بڑی خواہش ہے آپ سے ملنے کی بس جب اللہ کا حکم ہوا یہ ملاقات بھی ہو ہی جائے گی۔ عینی کی مختصر آمد اچھی رہی۔ قمر جہاں صاحبہ کی باتوں سے دل کو کافی رنجیدہ ہوا اللہ ان کی مشکل آسان فرمائے ان کی تکلیف کو دور فرمائے آمین۔ ان کے خیالات کی روانی میں ہم بھی بہتے چلے گئے معاشرتی کوتاہیوں کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بخش انکل آپ کی بے لوث محبت دل کو بھیجیں کہ اس دنیا سے بھی زیادہ بڑا کردیتی ہے۔ بڑا مان دیتی ہے۔ جس کا شکریہ ہرگز بھی ادا نہیں کروں گی اور مزید کی خواہش ہی نہیں بلکہ ضد کروں گی۔ "اسماء الحسنیٰ اور اقرأ" دونوں بابرکت سلسلے ہمارے لیے راہنما ثابت ہو رہے ہیں۔ ہماری خوش بختی ہے کہ ایسی تحریریں ہمیں راہ ہدایت دینے کے لیے موجود ہیں۔ ورنہ ہم تو ٹھہرے سدا کے بھٹکے ہوئے۔ پہلے بات ہو جائے دونوں ناولوں کی' امید سحر اپنی پہلی قسط سے ہی ہم پر اپنا جادو چلانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اس ناول کی تعریف اس کے جذبات کا وسیع کینوس ہے جہاں الفت' رقابت' چاہت' نفرت' رعونت' احتراز اور سب سے بڑھ کر وطن سے محبت کے جو جذبے آنچ دیتے ہوئے ملے انہوں نے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگادیے۔ "سیوک" ایک بہترین ناول قرار پایا۔ پڑھنے والے بہت سے ذہن سوچیں گے کہ ایسا کب ہوتا ہے جو اس تحریر میں دکھایا گیا ہے مگر ہم جو سنڈریلا جیسی فیری ٹیلز کے دلدادہ ہیں بہت متاثر ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی ہر سچائی کو بھول کر ہر منطق کو بالائے طاق رکھ کر پریوں اور جنوں کی کہانیوں کو ایمان بنا لینے کو دل کرتا ہے کہ سچائی کی کڑواہٹ کو یہ میٹھی میٹھی سی تحریریں کافی افاقہ پہنچاتی ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ذکر ہو جائے سچی کہانیوں کا۔ معتوب میں ایک انتہائی پرانا موضوع لے کر بات شروع کی گئی ماحول اور کردار ایک دوسرے سے بری طرح متصادم اور مضحکہ خیز حد تک ناقابل فہم تھے بس اصلاحی جملوں کی بھرمار بلکہ تکرار تھی۔ "کبڑا" حساس دل میں درد کی لہر کی طرح اتر جانے والی تحریر تھی۔ معاشرتی بے حسی کا ... زندگی کس طرح ہوتی ہے اس کا انداز بیاں بے حد پرتاثیر اور قابل تعریف تھا۔ "کرب مسلسل" بس اوسط درجے کی ... طویل سلسلہ الجھن کا باعث بنا۔ "انوکھا انتقام" ایک کمزور مرد کی جھوٹی طاقت کے اظہار کی ... ایک ... اور معمولی سا جملہ اس کی انا کے بت کو ریزہ ریزہ کردے اور وہ نام نہاد بہادری ایک ... "کمائی کا سانپ" بہت سے ایسے حالات و واقعات کا مجموعہ تھی جو کہ ... تو ناقابل قبول ٹھہرتی ہیں۔ مغربی ادب سے منتخب "جواز" میں عقلمندی اور مرکزی خیال کے انوکھے پن نے متاثر کیا۔ "خونی ڈراما" چونکا دینے والے انجام کی ایک بھرپور تحریر تھی۔ دونوں افسانے "گمنام" "در" کانچ کے رشتے" بہترین تھے۔ حالانکہ مجھے افسانے کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتے مگر لکھنے والے کے قلم نے ہمیں بڑی خوب صورتی سے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ مستقل سلسلوں کے حوالے سے رائے دینے سے قاصر ہوں کہ تا حال یہ سلسلے شامل مطالعہ نہیں ہو سکے ہیں۔ جس کے لیے بہت نادم ہوں۔ بزم سخن' خوشبو سخن اور ذوق آگہی تمام سلسلے ہی قابل تعریف ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں کہ دعاؤں کی ضرورت زندگی میں ہر شے سے زیادہ ہوتی ہے اجازت دیں۔ اللہ حافظ

مجاہد ناز عباسی ...... سنجر پور۔ محترم جناب عمران بھائی السلام علیکم سدا خوش رہو پھولوں کی طرح مسکراتے رہو۔ ہمیشہ آپ کے آنگن میں خوشیوں کی بہار رہے آمین۔ اس بار بھی ہمیشہ کی طرح شمارہ ٹائم پر ملا۔ اور جب شمارہ کھول کر ورق گردانی کی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ کافی جگہوں مثلاً گفتگو' خوش بو سخن اور ذوق آگہی میں اپنا نام پایا۔ عمران بھائی میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ نئے افق کے ساتھ تو اب زندگی بھر تک ساتھ رہے گا۔ اب تو یہ میگزین ہماری جان بن گیا ہے اور اپنی جان سے کوئی دور نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اسے کوئی چھوڑ سکتا ہے اور ماشاء اللہ جتنے بھی افق کے رائٹرز ہیں بہت اچھے ہیں کچھ رائٹرز کے ساتھ تو میرا فون پر رابطہ ہے وہ بہت مخلص ہیں اور اب تو نئے افق میں مزید نکھار آ گیا ہے کیونکہ افق میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں جو مجھے بہت اچھی لگیں اور کچھ رائٹرز جو عارضی طور پر غائب ہو گئے تھے وہ بھی واپس آ گئے ہیں امید کرتا ہوں مزید جتنے بھی رائٹرز جو حاضری نہیں دے رہے بہت جلد محفل میں حاضر ہوں گے۔ خاص کر احمد علی کیف صاحب۔ بھائی لوٹ آؤ کہاں گم ہو۔ یہ محفل آپ کے بنا ادھوری ہے۔ یا پھر ایسا تو نہیں کہ آپ مجھ سے خفا ہیں کیونکہ جب سے میں نے نئے افق میں لکھنا شروع کیا ہے تب سے آپ غائب ہوئے ہیں۔ میں تمام رائٹرز سے اپیل کرتا ہوں کہ کبھی سفر میں جاتے ہیں مثلاً کراچی سے لاہور یا لاہور سے کراچی تو راستے میں ہمارا شہر صادق آباد (سنجر پور) آتا ہے۔ تو جو رائٹر بھی کہیں لمبے سفر پر جائے تو وہ مجھ سے رابطہ ضرور کریں اس نمبر پر 0306-2877737 کیونکہ اس رائٹر کو اپنے چھوٹے بھائی کی ... در کھانی پڑے گی میں اپنے تمام رائٹرز بھائیوں کو ایڈوانس انوائٹ کررہا ہوں۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے کراچی میں

بھتہ خوری کے معاملے پر بحث کی۔ گفتگو میں صدارتی کرسی آپی شہناز بانو کے پاس تھی۔ آپی مجھ سے قسط وار تحریر نہیں پڑھی جاتی کیونکہ میں زیادہ انتظار کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ پورا مہینہ انتظار کرتا ہوں گردش کا لیکن پھر بھی جب پڑھتا ہوں تو آخر میں لکھا ہوتا ہے کہ (باقی آئندہ ماہ) لیکن یہ کب لکھا جائے گا کہ (ختم شد) یا پھر آپ گردش کا اینڈ مجھے فون پر ہی بتا دیں۔ یقین مانیں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ (سوری مذاق کر رہا ہوں) بہر حال میں گردش بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ مجھے بہت پسند ہے۔ شبنمی ارشاد کیسی ہیں آپ ویلکم! سرور شاذ' قمر جہاں' عبدالحکیم ساجد کیسے مزاج ہیں آپ کے۔ عصمت اقبال عین آپ مزید لکھتی رہیں۔ امیر حمزہ اور بشیر احمد بھٹی صاحب کے تبصرے کافی مختصر لیکن بہت اچھے تھے۔ ریاض بٹ صاحب السلام علیکم! انکل فقیر محمد بخش صابر صاحب کیسے ہیں آپ۔ انکل آپ کے ایس ایم ایس آتے رہتے ہیں۔ بہت پسند آتے ہیں مجھے۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کو ہمیشہ اپنی امان میں رکھے آمین۔ محمد اسلم جاوید' ریاض حسین قمر اور سید عبداللہ شاہد آپ کو بھی میری طرف سے نہایت ادب و احترام سے السلام علیکم! محمد ارشاد قریشی صاحب آپ کے بھی ایس ایم ایس مجھے ملتے رہتے ہیں۔ جو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ عالیہ انعام الٰہی نے بھی ثابت کر دیا کہ وہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں باجی آپ کے لکھنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ اسماء الحسنٰی پڑھ کر علم میں مزید اضافہ ہوا۔ اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے "شرم وحیا" کے موضوع پر ہمیں بہت معلومات دی۔ بزم سخن کا سارا انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔ خوشبوئے سخن میں ریاض حسین قمر' طاہرہ جبیں تارا' ڈاکٹر واجد نگینوی' ماہ نور' میثم علی آغا' ریحانہ سعیدہ اور فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ ذوق آگہی کا بھی سارا انتخاب بہت پسند آیا۔ بچی کہانی فی الحال صرف ایک پڑھی ہے۔ جو بہت پسند آئی۔ طاہر جبیں تارا کی 'معتوب' آخر میں تمام جواب عرض اسٹاف اور تمام جواب عرض رائٹرز کو میری طرف سے سلام۔

سید عبداللہ شاہد حیدر آباد۔ السلام علیکم میں خدائے لم یزل سے امید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور میرے وطن پاکستان کی تمام وحدتوں' جہتوں اور رفاقتوں کے ساتھ تنظیم اتحاد اور اخوت کے لیے اور نئے افق کی خوش منظری' ترقی وسربلندی اور شاد کامی کی غرض سے سرگرم عمل ہوں گے۔ دیگر آپ کے رفقاء برادر محمد اقبال بھٹی' جناب طاہر قریشی' برادر عفان احمد' جناب اسرار احمد صاحب' محترمہ روبینہ احمد صاحبہ' خوشبوئے سخن کے نئے انچارج جناب عمر اسرار اور ہمارے بزرگ وسرپرست محترم جناب بابا محمد مشتاق احمد قریشی صاحب کی خدمت میں سلام اور دعائیں قبول کیجیے گا۔ اس دفعہ اپریل کا تازہ شمارہ وقت پر مل گیا تھا۔ اللہ عزوجل کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ آپ نے میری گزارشات کو خاطر نگاہ سمجھا ورنہ نقار خانے میں طائر کی فریاد کون سنتا ہے۔ سرورق بہت پسند آیا۔ ذیل میں درج قیمت کا نوٹس دے کر آپ نے بوجھل اور سست لوگوں کی مشکلات کو آسان کیا ہے۔ میں مشکور ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یاد آوری کا یہ انداز برقرار رہے گا۔ اگلے صفحے پر "روحانی مسائل کا حل" کے سلسلے کی غرض سے کوپن دیکھا آپ نے خلق خدا کی خدمت اور سہولت کے لیے یہ روحانی علاج و معالجہ کا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اللہ عزوجل جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ اس مرتبہ دستک میں بابا مشتاق احمد قریشی' کراچی چیونٹیوں بھرا کباب' کے عنوان سے شہر کراچی کے زخموں کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ اس بار آپ کی اجازت سے پہلے گفتگو میں خاطر طبع رکھنے والے ساتھیوں اور دوست احباب سے بات چیت کروں گا یہ خوش قسمتی کی بات سمجھتا ہوں کہ اس مرتبہ کی پر رونق اور چہکتی مہکتی محفل میں میرے تاخیر سے بھیجے خط کو شامل کر لیا گیا تھا۔ ورنہ اس حسرت سے سوچتا رہ جاتا کہ سید محفل میں بھی احباب موجود تھے لیکن تم کہاں غائب رہ گئے۔ پرخلوص دوستوں کے درمیان زندگی اور نئی ذمہ داریوں کا احساس بہت قیمتی ہوتا ہے نا اس لیے عمران بھائی! خیر مسند اول پر میری پیاری بجیا محترمہ شہناز بانو جلوہ افروز تھیں۔ بجیا صدارتی کرسی پر اپنے حساس اور پرمغز جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بہت سوٹ کرتی ہیں اور اپنی باتوں سے دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ بجیا ایک لحاظ سے آپ کی فکر مندی درست بھی ہے لیکن آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ اللہ عزوجل کے رحم و کرم سے سب اچھا ہو جائے گا۔ آپ کے لفظوں سے مجھے ارشد اور اسعد کی یاد آئی۔ جیسے ماں اور بڑی بہن کی محبت وشفقت کا دلگداز جذبہ انسان کو سچی خوشی اور حلاوت سے سرشار کر دیتا ہے۔ اس کی نیم دلانہ آنکھوں میں تشکر و تفخر سے آنسو ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ آپ کے جملوں سے میری کیفیت بھی کچھ ایسی تھی۔ میری ایک چھوٹی بہن اور چھوٹا بھائی ہے۔ دونوں شادی شدہ اور گھر بار والے ہیں۔ میں حیدر آباد میں تنہا ہی رہتا ہوں۔ میری جس وقت شادی ہوئی تو اٹھارہ انیس سال کا اسمارٹ نوجوان تھا غالباً اسی وجہ سے بیوی سے عشق کر بیٹھا تھا۔ لیکن اس کی بے وفائی نے جس دکھ اور صدمے سے دوچار کیا وہ ناقابل بیان ہے۔ اپنی خاک کی دربدری پر کوئی انسان کب تک خون کے آنسو بہا سکتا ہے۔ صبر و استقامت کی تمام حدیں ختم ہو جاتی ہیں کہ جب سوچتا ہوں کہ اس ظالم عورت کو گھر سے گئے چودہ سال گزر گئے ہیں اور اب تو بچوں کے چہرے بھی مندمل ہو گئے ہیں۔ یاد کرتا ہوں تو سر درد میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ غم سے آنکھوں میں اشک امڈ آتے ہیں۔ اس لیے خود کو مصروف کیے رکھتا ہوں کہ زندگی اور خوشیوں کا احساس تازہ اور سدا بہار رہے۔ 35 سال کے لگ بھگ عمر ہو گئی ہے کوچنگ سینٹر میں ریاضی اور انگلش پڑھاتا ہوں۔ جس کی وجہ سے عزت سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔ کبھی ڈسٹرب ہو جاتا ہوں تو بہن اور بھائی کے بچوں سے ملنے چلا جاتا ہوں۔

کوئی قریبی دوست مل جائے تو پھر اچھا وقت گزر جاتا ہے۔ ان دنوں طبیعت اچھی نہیں ہے اس لیے میرے لیے دعا کیجیے گا۔ شبنمی ارشاد محترمہ آپ پاکستان میں نہیں تھیں تو کیا کوہ قاف اپنی پری وش سہیلیوں سے ملنے چلی گئی تھیں۔ تم بھلکڑ ہو "اقرار گناہ" پر میں نے تبصرہ لیا تھا۔ لیکن تم جوابی شکریہ اور ستائشی جملے محمد ارشاد قریشی صاحب کے لیے ادا کر رہی ہو۔ صفحات کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے تم نے یہ غلطی کی ہے۔ یا خیال ہے قریشی صاحب آپ نے شبنمی کے تحسین آمیز جملے پڑھ کر سر پکڑ لیا تھا نا۔ یار سرور شاذ تم کیا بچپن سے ضدی طبیعت کے مالک ہو؟ اب کیا میں 2008ء سے اب تک شائع ہونے والی تمام کہانیوں کے نام لکھوں! تم آ گئے ہو تو اچھی بات ہے میں بھی بھاگ کر منہ چھپانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بلکہ مستقل لکھوں گا اور ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔ کیا خیال ہے تم بھی یہی چاہتے ہو نا تو پھر تم سے ڈن کرتا ہوں۔ قمر جہاں' شرم وحیا کے حوالے سے جن ملبوسات کو تنقید کا نشانہ بنایا آج کی خواتین کو ان سے پکی توبہ کرنا چاہیے تب ہی مردوں کی نگاہوں میں ان کے لیے احترام بحال ہو سکتا ہے۔ آپ کی صحت یابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ عبدالحکیم ساجد' میاں نظر مت لگاؤ۔ یار جب تم لمبا ترنگا خط لکھو گے نا تو مجھے کیا ضرورت پڑیں کہ لمبے ترنگے خط لکھنے کی! عصمت اقبال عمر کے لحاظ سے شاید ابھی تم کم عمر ہو اس لیے دوسروں سے سبق لینے اور دینے میں احتیاط کرتی ہو۔ اگر تمہیں سیلف میڈ بننا ہے تو لازمی اس کے نشیب وفراز سے گزرنا پڑے گا۔ امیر حمزہ' میرے مزاج اچھے ہیں آپ سنایئے لمبی غیر حاضری کے بعد محفل میں قدم رنجا فرمائے ہیں۔ سنتے ہیں کہ آپ کی شاعری کی کتاب نے پنجاب کے بڑے شہروں میں دھوم مچائی تھی۔ بھئی حیدر آباد میں تو مجھے ڈھونڈے سے بھی میسر نہیں آئی۔ ریاض بٹ آپ نے سفید بالوں کی خوش گوار انداز میں توضیح فرمائی۔ گفتگو کا حسن اور لطف دو چند ہو گیا اور سنایئے مجاہد ناز' ماہی تم نے میرے لکھنے کے انداز کو پسند کیا بہت شکریہ! بزرگوار فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب جواب مرحمت کرنے کا شکریہ۔ عالیہ انعام الٰہی اس مرتبہ بھرپور مدلل اور جامع جواب تبصرے کے ساتھ انفرادیت کا احسان دلا رہی ہیں۔ ان کے علاوہ محمد اسلم جاوید' محمد ارشاد قریشی' محترم ریاض حسین قمر صاحب پرخلوص دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ بشیر احمد بھٹی صاحب ان تمام دوستوں کے تبصرے بھی محفل کی شان میں اضافہ کر رہے تھے۔

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ' محمد شفاعت حسنین صابر لنگاہ' محمد ثقلین صابر لنگاہ لاہور موڑ پرانا خانیوال۔ آج مورخہ 23 اپریل کو بعد از دوپہر برخوردار محمد ثقلین صابر لنگاہ کے پیارے پیارے ہاتھوں میں سجا ہوا اور ملتان شریف سے خرید کر لایا گیا تحفہ نئے افق بجوالقیہ محمد بخش صابر کو ملا۔ تحفہ وصول پا کر دلی خوشی ہوئی۔ لسٹ مضامین میں نیا رنگ خوب صورتی اپنائے ہوئے۔ مبارک ہو۔ تحفہ کا آفتاب (ل) جو ہن میں شامل دستک' گفتگو' اسماء الحسنٰی' اقرا' سچی کہانیاں' ترجمہ شدہ انتخاب' افسانے' ناول اور مسلسل سلسلے وار کہانیاں شامل تھیں۔ بہ تحریر کار رنگ نرالا' دینی میں پروئی ہوئی مالا کی طرح اور عمران صاحب کی سوچ انتخاب کیا کہنے سجاوٹ کے واہ واہ سبحان اللہ۔ اور اس لسٹ میں فقیر محمد بخش صابر لنگاہ۔ کی دونوں تحریروں خوف خدا' بدلے کی آگ کو سجاوٹ نہ دی گئی۔ اس سجاوٹ کو سجانے کا سہرا جناب عمران صاحب کے ہاتھ میں ہے کہ وہ سجاوٹ دیتے ہیں یاردی کی نوکری کو خوشی کا موقع جواب دہی دیں گے۔ تو انتظار ہے بھائی۔ "دستک" مشتاق احمد قریشی صاحب پر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ دل کے دروازے پر دستک تو ہوتی رہتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب کو راہ مستقیم پر چلائے اور ہم سب ملک پاک کی خدمت اور خوشحالی وترقی کے لیے ہم قدم ہو کر چل سکیں۔ آمین ثم آمین۔ گفتگو میں شامل صدارتی رنگ مسز شہناز بانو صاحبہ سے لے کر آخری نمبر سید عبداللہ شاہد صاحب تک کل 16 عدد بہن بھائیوں نے گفتگو کی ہر اک بہن بھائی نے اپنے اپنے انداز میں خوب سے خوب تر لکھا۔ پڑھ کر سنایا اور اس محفل میں گیارہواں نمبر فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کو عمران صاحب نے دیا دلی خوشی ہوئی۔ تمام عزیزان کو میرا یعنی فقیر محمد بخش صابر لنگاہ اینڈ لنگاہ فیملی گروپ آف نئے افق کا دلی سلام محبت اور دعائیں عرض ہیں قبول فرمائیں۔ دیگر از اں مجھ فقیر محمد بخش صابر اور گروپ آف لنگاہ نئے افق کو جن جن عزیزوں نے یاد کیا دعائیں دیں عزت کے لفظوں سے جن میں پیار ہی پیار سمویا ہوا تھا کا بہت بہت شکریہ۔ تراش خراش کے ٹکڑوں پر بھی عمران صاحب ضرور نظر ثانی کر لیا کریں کہ یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بعض اوقات سبق آموز ہوتے ہیں اور جو ٹکڑے اس دفعہ پڑھنے کے لیے ملے انہوں نے دل خوش کر دیا۔ اسماء الحسنٰی میں حسام بٹ صاحب نے اور اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے دینی اسباق اور حدیث نبوی مصارف مولانا محمد منظور نعمانی' شرم وحیا روایت زید بن طلحہ' حضرت عبداللہ بن عمر' ایمان کے پھل کا سبق پڑھ کر دل میں نور کی روشنی پھیلا دی۔ روحانی مسائل کا حل کا کوپن پڑھ کر خوشی ہوئی ہم بھی آگے چل کر زندہ رہے تو اس سے فیض اٹھائیں گے شکریہ ادارے کا۔ حسام بٹ صاحب کی سلسلہ وار موتیوں کی لڑیوں کی طرح پروئی ہوئی داستان بازی گر شہناز بانو صاحبہ کی دل میں اتر جانے والی سلسلہ وار تحریر گردش اپنی اپنی جگہ تیزی اور میلان کو بڑھا رہی ہیں۔ محمد یعقوب بھٹی صاحب کا خوب صورت رنگ امید سحر ناول عشق وفرض کی راہ پر محو سفر لوگوں کی جن پر کہا گیا ہے کہ عشق نہ پچھے ذاتاں پاتاں عشق نہ پچھے رنگ روپ' کوئی کسی کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو اور باقی امید سحر رہ جاتی ہے۔ مصنف وادارہ

مبارک باد کے اور عشق زندہ باد کے مستحق رہے۔ سچ بیانیوں میں طاہرہ جبیں تارا کی معتوب، قمر جہاں صاحب کی کرب مسلسل، نوشاد عادل صاحب کی کبڑا، عبدالمالک کیف صاحب کی انوکھا انتقام اور انجم فاروق ساحلی صاحب کی تنہائی کا سانپ جہاں پر سبق آموز تحریریں رہیں وہیں پر جرم وسزا خوشی اور غم کے رنگوں کو بھی اجاگر کر گئیں۔ خورشید پیرزادہ صاحب کا ناول مطالعہ کے لیے ملا سیوک اور جو باقی آئندہ پر رکھا اگلے ماہ کا انتظار رہے گا۔

عصمت اقبال عین ..... منگلا ڈیم! محترم عمران بھائی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ بمعہ اپنے اسٹاف خیریت سے ہوں گے۔ اس وقت جب میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں باہر ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے اور سامنے درختوں پر بیٹھے پرندوں کی خوبصورت آوازیں کانوں میں رس گھول رہی ہیں۔ خاص طور پر کوئل کی مسحور کردینے والی آواز اور ان گھنے درختوں کے پیچھے نیلے پہاڑ اور سرمئی آسمان دلکش نظارہ پیش کررہے ہیں۔ ہر طرف بارش اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوش بو پھیلی ہوئی ہے۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا سے میرے اوراق ادھر ادھر رقص کررہے ہیں۔ اس وقت یہی دل چاہ رہا ہے کہ اپنا ایذل اور کینوس لے کر باہر چلی جاؤں اور فطرت کے اس سحر انگیز حسن کو قید کرلوں۔ اس دلنشیں موسم کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ عمران بھائی روحانی مسائل اور ان کے حل کے عنوان سے آپ جو سلسلہ شروع کرنے لگے ہیں امید ہے اسماء الحسنٰی کی طرح وہ بھی پسندیدہ سلسلہ ہوگا۔ اس مرتبہ سچی کہانیاں ساری اچھی تھیں لیکن کرب مسلسل اور انوکھا انتقام نمبر لے گئیں۔ جواز اور خونی ڈرامہ بھی خوب تھیں۔ بزم سخن، ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن کا سارا انتخاب اچھا تھا لیکن خوشبوئے سخن میں صدارتی مقام محترم ریاض حسین صاحب نے حاصل کیا۔ مبارک باد وصول کریں۔ عبداللہ عاطر صاحب کافی عرصہ کے بعد آپ کی غزل پڑھنے کو ملی اچھی لگی۔ اس مرتبہ کرسی صدارت پر شہناز باجی تشریف فرما تھیں۔ شہناز باجی بڑے افسوس کی بات ہے مجھ سے خط لکھنے میں تاخیر کیا ہوئی آپ نے فوراً ہی اپنے بھائی سے راز و نیاز کی باتیں شروع کردیں۔ کوئی بات نہیں۔ شہنی ارشاد صاحب! کیسی ہیں کافی عرصہ کے بعد گفتگو میں شامل ہوئیں اچھا لگا۔ قمر جہاں صاحبہ آپ بھی طویل تبصرے کے ساتھ شامل تھیں۔ آپ کی کہانی کرب مسلسل اچھی تھی۔ عبدالحکیم ساجد صاحب، مجاہد ناز عباسی صاحب اور محمد ارشاد قریشی صاحب آپ کو میری غزل اچھی لگی جس کے لیے آپ کا شکریہ۔ محترم محمد بخش صاحب امید ہے خیریت سے ہوں گے آپ نے میری غیر حاضری کو محسوس کیا شکریہ۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا کرم فرمائے۔ آمین

ناظم بخاری ..... لودھراں۔ محترم عمران احمد قریشی صاحب! السلام علیکم! صدا سلامت رہیں۔ بہت سی نیک تمنائیں اور دعائیں آپ کے نام۔ اس بار نئے افق خریدا اور محبوب محفل میں پہنچتے تو بہت سے دوستوں کو خود سے ہم کلام ہوتے دیکھا۔ محترمہ شہناز بانو اس قدر اپنائیت اور خلوص سے نوازنے کا شکریہ۔ آپ کی محبت سے میں نے اپنی مسز کو آگاہ کردیا تھا ان کی طرف سے بہت سی دعائیں اور سلام قبول کیجیے۔ آپ نے کہا کہ میں ایک اچھا رائٹر ہوں اور اس خوشی سے دل آباد کرلوں تو عرض ہے کہ مجھے اب خوش فہمیاں اچھی نہیں لگتیں۔ میں اپنے قلمی قد وقامت اور کوتاہیوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔ اس کے باوجود حوصلہ افزائی کرنے کا شکریہ۔ محفل میں مستقل آنے کا وعدہ نہیں کرسکتا مگر کوشش ضرور کروں گا۔ شہنی ارشاد بابا کی وفات پر تعزیت کرنے اور شادی کی مبارک باد دینے کا شکریہ۔ سدا خوش رہیں اور اچھے سے اچھا لکھتی رہیں۔ سرور شاذ بھائی آپ کا حکم سر آنکھوں پر کوشش کروں گا۔ دونوں باتوں کا شکریہ۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب دعائیں اور مبارک باد دینے کا شکریہ۔ رہ گئی موبائل دوستی کی بات تو ہماری شرط وفا یہی ہے۔ ملا کرو گے، ملا کریں گے۔ عالیہ انعام الٰہی! پیاری بہن آپ کی باتوں کے جواب میں کیا کہوں؟ کچھ کہنے سے گریزاں ہوں صرف اتنا کہ ہمیشہ خوش رہیں، شاد رہیں، آباد رہیں۔ اتنے خلوص سے نوازنے کا شکریہ۔ مجاہد ناز عباسی بہت شکریہ آپ سے تو ویسے بھی موبائل دوستی ہے یہ دوستی سدا برقرار رکھنا۔ محمد ارشاد قریشی برادر آپ کے خلوص کا میں ہمیشہ مقروض تھا ہوں اور رہوں گا۔ آپ کی اور ہماری موبائل دوستی کو دو سال سے بھی اوپر ہوگئے ہیں آپ کے اتنے میسج آتے ہیں اتنے ..... اتنے کہ اگر آپ تھوڑا میسج کے معیار کا خیال کریں تو کیا ہی بات ہو۔ جاوید احمد صدیقی صاحب موبائل پر حوصلہ افزائی کرنے کا شکریہ۔ آپ کی باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر وعدہ نہیں کرتا۔ ہمیشہ خوش رہیں۔ بہت سی دعائیں آپ کے لیے۔ بھائی محمد مراد! آپ موبائل پر رابطے میں رہ کر کہاں غائب ہوگئے ہیں پلیز رپلائی۔ قمر جہاں، عبدالحکیم ساجد، عصمت اقبال، امیر حمزہ، بشیر احمد، ریاض بٹ، اسلم جاوید، ریاض قمر اور عبداللہ شاہد آپ سب کے لیے بہت سی دعائیں اور سلام آپ سب کے تبصرے خوب صورت اور معیاری تھے۔ کہانیوں میں جو تحریر سب سے ٹاپ پر رہی وہ اسماء قادری کی "کانچ کے رشتے" تھی۔ اس سبق آموز اور دل کو موہ لینے والی تحریر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ "سیوک" خورشید پیرزادہ کی ایک نارمل سی تحریر تھی۔ جس پر مصنف کی گرفت بھی بس نارمل ہی سی ہے۔ اگر کڑے مزاج و معیار کو مدنظر رکھا جائے تو یہ تحریر کچھ خاص نہیں لگی۔ طاہرہ جبیں تارا کی کہانیاں ہمیشہ سے ہی مجھے کچھ خاص نہیں لگی ہیں۔ مگر اس بار ان کی تحریر میں کچھ دم تھا۔ تحریر پر گرفت بھی ٹھیک تھی اور لفظوں کا چناؤ بھی اچھا تھا۔ لہٰذا ان کی تحریر بہت بہترین لگی۔ وہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ "انوکھا انتقام"

...المالک کیف ہلکی پھلکی تحریر تھی اچھی لگی۔ "تنہائی کا سانپ" انجم فاروق کی بہترین تحریر تھی۔ بس وہ اختتام میں عجلت سے کام نہ لیتے تو ...ہوتا۔ "کبڑا" نوشاد عادل کی بس نارمل سی تحریر لگی۔ "کرب مسلسل" قمر جہاں کی بالکل پسند نہیں آئی اور اس شمارے کی سب سے بور ترین کہانی راحت وفا کی "گمنام" ثابت ہوئی۔ مصنفہ کافی پرانی لکھنے والی ہیں مگر ابھی تک وہ اپنا کوئی خاص مقام بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہیں۔ ان کی چند ایک تحاریر میں پڑھ چکا ہوں "جواز" بالکل پسند نہیں آئی۔ البتہ "خونی ڈرامہ" پسند آئی۔ سلسلے وار کہانیوں کے لیے معذرت... اللہ حافظ

ابن شاہین ..... واہ کینٹ السلام علیکم! قابل احترام عمران احمد صاحب بمعہ اہل وعیال تمام حاضرین، قارئین، مصنفین، مشتملین، دعائیں کو ابن شاہین کی طرف سے سلام اور دعائیں۔ اللہ آپ سب کو اور ہمیں اپنے حفظ وامان میں رکھے آمین۔ نئے سلسلے شروع کرنے پر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں خاص طور پر "روحانی مسائل اور ان کا حل" سلسلہ بہت اچھا رہے گا گوکہ ابھی شروع نہیں ہوا بہرحال اگلے ماہ ہوسکتا ہے کہ جاری ہوجائے انتظار رہے گا۔ قابل محترم یعقوب جمیل کی وفات کا سن کر دلی افسوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے آمین۔ گفتگو میں کرسی صدارت پر شہناز بانو آنٹی تشریف فرما ہیں۔ جنہوں نے بھی اپنوں کو یاد کرلیا اور سچ بات بھی یہی ہے کہ کبھی اپنوں اپنوں کو ہی یاد کرتے ہیں اور میرے چند ماہ غائب رہنے سے تو سب نے میرا نام تک بھلا دیا خیر کوئی گلہ نہیں جب ایک گھر میں بسنے والے اپنے ہوکر بھی کسی اپنے کو یاد نہیں کرتے تو پھر اور کوئی کیسے یاد کرسکتا ہے اور ویسے بھی اس دور میں تو کسی کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو یاد کرے اور یادوں میں اگر کوئی یاد رہ بھی جائے تو وہ صرف بڑے نام ہی ہوتے ہیں۔ باقی عام لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا جب تک کہ اس میں کوئی توجہ طلب بات نہ ہو اخیر شہناز آنٹی کو میری طرف سے سلام اور دعائیں اور ایک گزارش کہ زنجیر کی طرح گردش میں بھی رنگ بھر دیں۔ گوکہ وہ پہلے سے ہی زبردست ہی ہے۔ دوسرے نمبر پر شہنی صاحبہ اور تیسرے نمبر پر کافی عرصے سے غائب سرور شاذ صاحب حاضر تھے ان کو میرا اسلام اور سرور صاحب کی مسز کو بھی سلام قبول ہو اور بھی بہت سے لوگ شامل گفتگو تھے سب کو سلام اور جو نہیں شامل تھے ان کو بھی سلام اور دعائیں۔ فقیر صابر انکل آپ کو بھی میرا اسلام مع فیملی۔ انکل آپ سے گلہ ہے مجھے کہ آپ نے مجھے اپنی صاحبزادی کہا اور پھر اس صاحبزادی کا نام لینا بھی بھول گئے۔ خیر آپ مجھے یاد کریں یا نہ کریں میں تو ہر پل آپ کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگتی ہوں اور اپنے لیے دعا کی گزارش کرتی ہوں۔ اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے شرم وحیا کے موضوع پر روشنی ڈالی جو کہ آج کل کے دور میں مفقود ہوتی جارہی ہے۔ نہایت ہی اہم موضوع تھا پڑھ کر اچھا لگا۔ کہانیوں میں صرف بازی گر اور گردش پڑھی ہیں کیونکہ وقت کی نہایت کمی ہے۔ خوشبوئے سخن میں مجاہد ناز، محمد فہد بھیا کی غزل اچھی لگی۔ فہد بھیا اپنی بھولی بسری بہن کا سلام قبول کیجیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اس کے علاوہ طاہرہ جبیں، ماہ نور، محمد اسلم جاوید، محمد عبداللہ، فقیر محمد بخش انکل اور میثم علی آغا کی شاعری اچھی لگی۔ ذوق آگہی میں بھی کچھ زبردست تھا سوائے ہنسنا منع ہے کہ اس مرتبہ کے لیے اتنا ہی کافی ہے آخر میں سب کو میرا اسلام۔ اسی کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں تکلیف دہ باتوں کے لیے سب سے معذرت اور دعا کی تاکید۔ اللہ ہم سب کا اور ہمارے پاکستان کا حامی وناصر ہو آمین

جاوید احمد صدیقی ..... راولپنڈی۔ محترم مدیر قابل احترام عمران جی! السلام علیکم: کچھ عرصہ کی غیر حاضری کے بعد محفل گفتگو میں حاضر ہوں۔ جن قارئین نے یاد رکھا ان کا بے حد شکر گزار ہوں اور میں بھی سب کو یاد کرتا رہتا تھا۔ بہرحال غیر حاضریاں ہوا کریں گی مگر ناتا تو رہے گا۔ نئی ترتیب، نئے طرز اور کہانیوں کے حساب سے انقلاب آگیا ہے۔ جو میرے تصور میں تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ مسلمان کے دل کو دنیاوی کاموں میں اندھوں کی طرح گرنے سے بچانے کے لیے آپ کی بیان کردہ حدیث ہی کافی ہے۔ ہمیشہ کی طرح دستک بھی دل پر دستک دے گئی۔ روحانی علاج کے ساتھ سخت ترین عمل کی ضرورت ہے۔ فہرست دیکھی جان پڑگئی۔ ابتدائیہ، سچی کہانیاں، بدیسی ادب کا نچوڑ، نئی چیز منفرد دو افسانے (انہیں جاری رکھیں اور ان کا معیار بہتر سے بہتر کرتے رہیں) ناول، مستقل سلسلے واہ زبردست کیا پھولوں کی کیاری سجائی ہے اور رنگ برنگ پھول اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ قابل صد تحسین یہ اضافے ہیں ایک تو روحانی مسائل کا حل اور اسماء الحسنٰی۔ اس کے لیے حسام بٹ مبارک باد کے مستحق ہیں ہاں ایک تجویز ہے کہ جو عربی کی عبارت پڑھنے کے لیے لکھی جائے اس پر اعراب ضرور لگائیں تاکہ غلطی کا احتمال ذرا بھی نہ رہے۔



اسماء الحسنٰی ۱

حسام بٹ

یوں تو اللہ تبارک تعالیٰ کے اَن گنت صفاتی نام ہیں جن میں سے بیش تر کا علم صرف اسی عَـلِیْمُ الْخَبِیْرُ کو ہے۔ میں کوئی عالم فاضل یا مفتی نہیں ہوں لہٰذا کسی علمی بحث کو چھیڑنا یا تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینا میری علمی ہمت اور بساط سے باہر ہے اور یہاں پر یہ میرا مقصود اور موضوع بھی نہیں۔ میں دین کی واجبی سی سُوجھ بُوجھ رکھنے والا ایک عام سا دنیا دار انسان ہوں۔ البتہ اس بات پر مجھے فخر ہے کہ اس ذاتِ باری نے مجھے جتنا بھی علم و ہنر عطا کیا ہے اس کا درست استعمال جانتا ہوں اس کے باوجود بھی اگر اس کارِ خیر کے دوران مجھ سے کہیں کوئی بھول چُوک یا بے ادبی ہو جائے تو وہ رؤف الرحیم میری چھوٹی بڑی ہر خطا کو معاف فرمائے جس کے اسماء الحسنٰی پر قلم اٹھانے کی میں نے جرأت کی ہے۔

قارئین کی آسانی اور سہولت کے پیشِ نظر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مستند روایت کو بنیاد بنا کر ماہنامہ ''نئے افق'' کے لیے اس تعمیری و اصلاحی اور دنیا و آخرت کے معاملات کے لیے یکساں مفید سلسلے کا آغاز کرتا ہوں۔

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله تسعه و تسعين اسماما ئة الا واحدا من احصاها دخل الجنة.

ترجمہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں۔ جس نے ان ناموں کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا۔

میں بھی ''نئے افق'' کے ان صفحات پر قادرِ مطلق کے انہی ننانوے یعنی ایک کم سو اسماء الحسنٰی کا تذکرہ کروں گا۔ اپنی جائز اور نیک حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس کے صفاتی ناموں سے پکارنا اور اس ذاتِ پاک کی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہونا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ہر عبادت کے بعد دعا کرنا ایک لازمی عمل ہے۔ حدیث کے مطابق ''دعا'' ہر نوعیت کی عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تفصیل اور تشریح سے قبل میں دعا کے معاملے پر روشنی ڈالنا نہایت ہی اہم اور ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان لطیف روحانی تقاضوں کو پورا کیے بغیر دعا کی قبولیت کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کو پانی کی جگہ تیزاب پلائیں اور اس سے پھر بھی خوش ذائقہ پھل یا خوش نما پھول کی توقع رکھیں۔ اگر درج ذیل راہ نما اصولوں کی حرمت کا پاس کرتے ہوئے دعا کی جائے تو اسے روح الامین کے پَر لگ جاتے ہیں۔

● ہر دعا کے ساتھ اول آخر حسبِ توفیق درود شریف پڑھنا نہایت ہی کار آمد اور ضروری ہے۔ اس عمل سے آپ کی دعا کے ساتھ اللہ کے محبوب کی تائید بھی شامل ہو جاتی ہے۔

● کسی بھی دعا سے پہلے نیکی اور بھلائی کا کوئی کام کرنا چاہیے۔ اگر کسی بڑی نیکی کا موقع میسر نہ ہو تو انسانوں کی گزرگاہ سے کوئی پتھر یا کانٹا ہی ہٹا دیں یا مسکرا کر کسی کو سلام ہی کر ڈالیں۔

● ناممکن اور ناجائز کاموں کے لیے دعا کرنا جائز نہیں۔ وہ ذاتِ کریم مثبت صفات کا مالک ہے۔ اس سے ہمیشہ بھلائی، خیر اور تعمیری مقاصد کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔

● اگر حصولِ مقصد میں دیر ہو رہی ہو تو بددل یا مایوس ہرگز نہ ہوں بلکہ پوری دل جمعی سے دعا کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس مالک الملک کی رحمت سے مایوس ہونا گناہِ عظیم ہے۔

● اگر کسی دعا گو شخص کی نیت صاف، دل شفاف، کھانا پینا اور لباس رزقِ حلال کا رہینِ منت ہو تو رحمتِ خداوندی اس کی دعا مکمل ہونے سے پہلے ہی جوش میں آ جاتی ہے۔

واجد

معانی: غنی، بے پروا، بے نیاز، بردبار

تاثیر: اسمِ جمالی

اعداد: 14

مفرد عدد: 5

د	ج	ا	د
4	3	1	6

ورد: یا واجد

فضائل و وظائف:۔

☆ اگر کوئی شخص خلوت میں کثرت کے ساتھ یا واجد کا ورد کرے تو......

۱:۔ وہ دنیاوی غم اور دکھ سے بے نیاز ہو جائے گا۔

۲:۔ اسے فراخی اور تونگری حاصل ہوگی۔

۳:۔ اس کا دل نورِ توحید کے ساتھ منور ہو جائے گا۔

☆ اگر کوئی شخص رات کو سونے سے قبل ایک سو مرتبہ یا واجد پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک دے اور اس عمل کو پابندی کے ساتھ جاری رکھے تو......

۱:۔ اللہ تعالیٰ اسے دولتِ دنیا سے مالا مال فرمائے گا۔

۲:۔ اس کی صحت قابلِ رشک اور عمر دراز ہوگی۔

۳:۔ اسے نیند پُرسکون اور خواب سہانے آئیں گے۔

☆ اگر کوئی چھیاسٹھ مرتبہ یا واجد پڑھ کر پانی پر دم کرے اور پھر یہ پانی کسی غصہ ور اور جھگڑالو شخص کو پلائے تو......

۱:۔ رفتہ رفتہ جھگڑالو شخص کا غصہ جاتا رہے گا۔

۲:۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمیزدار اور خوش اخلاق بن جائے۔

۳:۔ اس کے انداز و اطوار میں عجز و انکسار شامل ہو جائے گا۔

☆ اگر کوئی شخص نمازِ فجر کے بعد نہایت پابندی کے ساتھ ایک سو ایک مرتبہ یا واجد پڑھنا اپنا معمول بنا لے تو......

۱:۔ اس کی نگاہ میں وسعت اور سوچ میں پاکیزگی پیدا ہو جائے گی۔

۲:۔ وہ غمِ روزگار سے بے پروا اور بے نیاز ہو جائے گا۔

۳:۔ اسے امید سے زیادہ حاصل ہوگا اور ہر بگڑی بن جائے گی۔

☆ اگر کوئی شخص چالیس روز تک، رات کے آخری پہر کسی مخصوص وقت پر روزانہ ایک ہزار مرتبہ یا واجد کا ورد کرے اور پھر چالیس روز کے بعد کسی بھی وقت دن میں ایک سو بار یہی اسمِ مبارک پڑھ لیا کرے تو......

۱:۔ وہ شیطانی حملوں سے محفوظ رہے گا۔

۲:۔ وہ خیر و شر میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

۳:۔ اللہ تعالیٰ اسے گناہوں سے بچنے اور نیکی کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا کرے گا۔

۴:۔ اس کا ہاتھ کبھی پیسے سے خالی نہیں رہے گا۔

۵:۔ ہر شخص اس کی تعریف اور احترام کرے گا۔

میرا معبود محض ربّ المسلمین ہی نہیں بلکہ وہ ربّ العالمین ہے۔ لہٰذا غیر مسلم حتیٰ کہ اس کے وجود سے انکاری افراد بھی اسماء الحسنٰی کے فیوض و برکات سے کماحقہٗ استفادہ کر سکتے ہیں۔

● غیر مسلم افراد متذکرہ بالا اسمِ مبارک کو اپنے جائز اور نیک مقاصد کے حصول کے لیے طلوعِ آفتاب سے پہلے والے ایک گھنٹے میں یا غروبِ آفتاب کے بعد والے ایک گھنٹے میں کسی بھی وقت بیان کردہ تعداد اور طریقے کے مطابق پڑھ سکتے ہیں۔

● منکرِ خدا حضرات و خواتین جب جی چاہے اور جتنا جی چاہے اس اسمِ پاک کو پڑھ سکتے ہیں۔ ان کی ہر تعمیری تمنا اور مثبت خواہش ان شاء اللہ ضرور پوری ہوگی۔ میرا پروردگار ان کا بھی خالق، مالک اور رزاق ہے۔

☐

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

(۲۲۵)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا ایمان کی ایک شاخ ہے (یا ایمان کا ثمرہ ہے) اور ایمان کا مقام جنت ہے' اور بے حیائی و بے شرمی بدکاری میں سے ہے اور بدی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔

(مسند احمد' جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث میں اور اس سے پہلی حدیث میں بھی جو "الحیاء من الایمان" فرمایا گیا ہے بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ شرم و حیا شجر ایمان کی خاص شاخ یا اس کا ثمرہ ہے' صحیحین کی ایک دوسری حدیث میں (جو کتاب الایمان میں گزر چکی ہے) فرمایا گیا ہے۔ "والحیاء شعبۃ من الایمان" (اور حیا ایمان ہی کی ایک شاخ ہے) بہرحال حیا اور ایمان میں ایک خاص نسبت اور خاص رشتہ ہے' اور یہ سب اسی کی تعبیریں ہیں...... اور اسی کی ایک تعبیر وہ بھی ہے جو اس سے بعد والی حدیث میں آ رہی ہے۔

(۲۲۶)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کہ:۔ حیا اور ایمان یہ دونوں ہمیشہ ساتھ اور اکٹھے ہی رہتے ہیں' جب ان دونوں میں سے کوئی ایک اٹھالیا جائے تو دوسرا بھی اٹھالیا جاتا ہے۔

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ ایمان اور حیا میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ اگر کسی آدمی یا کسی قوم میں سے ان دونوں میں سے ایک اٹھالیا جائے تو دوسرا بھی اٹھ جائے گا' الغرض کسی شخص یا جماعت میں حیا اور ایمان یا تو دونوں ہوں گے یا دونوں میں سے ایک بھی نہ ہوگا۔

(۲۲۷)

(ترجمہ) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ حیا صرف خیر ہی کو لاتی ہے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) بعض اوقات سرسری نظر میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ شرم و حیا کی وجہ سے آدمی کو کبھی کبھی نقصان بھی پہنچ جاتا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اسی شبہ کا ازالہ فرمایا ہے' اور آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ شرم و حیا کے نتیجہ میں کبھی کوئی نقصان نہیں ہوتا' بلکہ ہمیشہ نفع ہی ہوتا ہے' حتیٰ کہ جن مواقع پر ایک عام آدمی کو عامیانہ نقطہ نظر سے نقصان کا شبہ ہوتا ہے وہاں بھی اگر ایمانی اور اسلامی وسیع نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بجائے نقصان کے نفع ہی نفع نظر آئے گا۔

یہاں بعض لوگوں کو ایک اور بھی شبہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شرم و حیا کی زیادتی بعض اوقات دینی فرائض ادا کرنے سے بھی رکاوٹ بن جاتی ہے' مثلاً جس آدمی میں شرم و حیا کا مادہ زیادہ ہو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے فرائض ادا

ل وتبلیغ کرنے اور مجرموں کو سزا [illegible] اہم دینی کاموں میں بھی [illegible]

یہ شبہ دراصل ایک مغالطہ پر مبنی ہے' انسان کی طبیعت کی جو کیفیت اس قسم کے کاموں کے انجام دینے میں مانع ہوتی ہے وہ دراصل حیا نہیں ہوتی بلکہ وہ اس آدمی کی ایک فطری اور طبعی کمزوری ہوتی ہے' لوگ ناواقفی سے اس میں اور حیا میں فرق نہیں کر پاتے۔

(۲۲۸)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ اگلی نبوت کی باتوں میں سے لوگوں نے جو کچھ پایا ہے اس میں سے ایک یہ مقولہ بھی ہے کہ:۔ جب تم میں شرم و حیا نہ ہو تو پھر جو چاہو کرو۔"

(صحیح بخاری)

(تشریح) انبیائے سابقین کی پوری تعلیمات اگرچہ محفوظ نہیں رہیں لیکن ان کی کچھ سچی پکی باتیں ضرب المثل کی طرح ایسی مقبول عام اور مشہور عام ہوئیں کہ سیکڑوں ہزاروں برس گزرنے پر بھی وہ محفوظ اور زباں زد خلائق رہیں۔ انہیں میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے جو حضورؐ کے زمانہ تک بطور ضرب المثل لوگوں کی زبان پر چڑھی ہوئی تھی۔ "اذا لم تستحی فاصنع ما شئت"' جس کو فارسی میں کہا جاتا ہے "بیحیا باش و ہرچہ خواہی کن"' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تصدیق فرمائی کہ یہ حکیمانہ اور ناصحانہ مقولہ اگلی نبوت کی تعلیمات میں سے ہے۔

(۲۲۹)

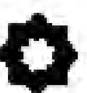
(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسی اس سے حیا کرنی چاہیے۔ مخاطبین نے عرض کیا:۔ الحمد اللہ! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔ یہ نہیں (یعنی حیا کا مفہوم اتنا محدود نہیں ہے جتنا کہ تم سمجھ رہے ہو) بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو افکار و خیالات ہیں ان سب کی نگہداشت کرو' اور پیٹ کی اور جو کچھ اس میں بھرا ہے اس سب کی نگرانی کرو (یعنی برے خیالات سے دماغ کی اور حرام و ناجائز غذا سے پیٹ کی حفاظت کرو) اور موت اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہونی ہے اس کو یاد کرو' اور جو شخص آخرت کو اپنا مقصد بنائے وہ دنیا کی آرائش و عشرت سے دستبردار ہو جائے گا' اور اس چندروزہ زندگی کے عیش کے مقابلہ میں آگے آنے والی زندگی کی کامیابی کو اپنے لیے پسند اور اختیار کرے گا۔

پس جس نے یہ سب کیا' سمجھو کہ اللہ سے حیا کرنے کا حق اس نے ادا کیا۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس سلسلہ کی پہلی حدیث کی تشریح میں حیا کے معنی کی وسعت کی طرف جو اشارہ کیا گیا تھا' ترمذی کی اس حدیث سے اس کی توثیق ہی نہیں بلکہ مزید توضیح و تشریح بھی ہو جاتی ہے' نیز حدیث کے آخری حصہ سے ایک اصولی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اللہ سے حیا کرنے کا حق وہی بندے ادا کر سکتے ہیں جن کی نظر میں اس دنیا اور اس کے عیش و عشرت کی کوئی قیمت نہ ہو اور دنیا کو ٹھکرا کے آخرت کو انہوں نے اپنا مطمح نظر بنالیا ہو اور موت اور موت کے بعد کی منزلیں ان کو ہمہ وقت یاد رہتی ہوں' اور جس کا یہ حال نہ ہو وہ خواہ کیسی ہی باتیں بناتا ہو' اس حدیث کا فیصلہ ہے کہ اس نے اللہ سے حیا کا حق ادا نہیں کیا۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)



سلوک

خورشید پیر زادہ

جب زندگی کے راستے کٹھن ہوجائیں' منزل نگاہوں سے اوجھل ہوجائے' جب ہوائیں مخالف ہوجائیں' دل کا خون آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلے' اپنے پرائے بن جائیں تو انسان جیتے جی مرجاتا ہے۔ ہر سانس اسے دشمن محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ خود دنیا کے لق و دق صحرا میں تنہا بھٹکنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا اس کی سوچیں اس سطح پر آگئی تھیں کہ وہ کسی بھی لمحے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کرسکتی تھی مگر پھر اچانک حالات پلٹا کھا گئے کچھ نادیدہ ہستیاں اس کی دوست بن گئیں اور پھر کانٹوں بھرے راستے پھولوں کی سیج بنتے چلے گئے۔

ماورائی موضوع پر ایک خوب صورت ناول جس کی ہر سطر آپ کو چونک جانے پر مجبور کردے گی

سلیکھا موسی کی رچائی ہوئی سازش کے بارے میں تو چاچی جی بھی پوری طرح سے نہیں جانتی تھی۔ جتنا انہیں بتایا گیا تھا اتنے سے ہی وہ پریشان تھیں۔ مگر موسی کی بات کو ماننا ان کی مجبوری تھی۔

دوسرے دن چاچا جی کے آفس چلے جانے کے بعد انہوں نے آشا کو بلا کر کہا ”میں دیدی کے ساتھ مندر جاؤں گی۔ آج تو بھی میرے ساتھ چل۔ جا اشنان کرلے اور تیار ہوجا۔“

یہ تو بڑی عجیب بات تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کبھی مندر نہیں گئی تھی۔ سلیکھا موسی جب نہیں ہوتی تھیں تب اکثر چاچی جی اسے اپنے ساتھ مندر لے جایا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ جانا بھی نوکروں جیسا ہی ہوا کرتا تھا' پھر بھی اسے برا نہیں لگتا تھا۔

لیکن سلیکھا موسی کے رہتے ہوئے یہ پہلا موقع تھا کہ اسے مندر چلنے کے لیے کہا گیا تھا۔

”مجھے کیا......“ اپنا سر جھٹک کر وہ مندر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ روی موجود نہیں تھا کہ وہ اسے بتاتی۔ کتنا چاہنے لگی تھی وہ روی کو۔ ”چلو ٹھیک ہی ہے کہ وہ اس وقت یہاں نہیں اپنی ڈیوٹی پر ہے۔ اس کے بتانے پر وہ کتنا چڑاتا۔ بھگوان سے کیا مانگو گی' یہ پوچھتا۔“

مگر اس کا دل چاہتا تھا کہ اپنی ایک ایک بات روی کو بتائے۔ انہی سوچوں میں گم وہ تیار ہوگئی۔

سلیکھا موسی اور چاچی جی کے ساتھ وہ باہر آئی۔ تھوڑی ہی دور درگا ماں کا مندر تھا۔ چاچی جی درگا ماں کی بھگت تھیں۔ وہاں پوجا کے بعد آرتی کے لوٹنے سے پہلے سلیکھا موسی نے پجاری جی کے پاس جا کر کچھ باتیں کیں' چاچی جی' آشا کے ساتھ کچھ دوری پر تھیں۔ پھر موسی بھی آگئیں اور وہ مندر کے گیٹ سے باہر آگئیں کہ اب تو گھر ہی لوٹنا تھا لیکن آشا چونک پڑی' وہ دونوں دوسری طرف جارہی تھیں۔ آشا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب یہ کہاں جا رہی ہیں۔ موسی نے ایک ٹیکسی کی اور تینوں اس میں بیٹھ گئیں۔ پتہ نہیں کہاں جارہی ہیں چاچی جی اور موسی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ تھوڑی فکر مند بھی تھی۔

سلیکھا موسی تو کبھی چاہتی ہی نہیں تھیں کہ اسے کام سے کبھی ایک پل کی بھی چھٹی ملے لیکن آج وہی اسے ساتھ لے کر گھوم رہی تھیں اور یہ بات اسے ہضم نہیں ہورہی تھی۔

”اوہ میں بھی کتنی شکی ہوتی جارہی ہوں۔“ وہ ٹیکسی سے باہر کا منظر دیکھ دیکھ کر خوش بھی ہورہی تھی اور سوچے بھی جارہی تھی۔

”آج لوٹ کر روی کو سب بتاؤں گی کہ کہاں کہاں گھومی۔ وہ کار میں گھومتا ہے تو میں بھی ٹیکسی میں گھوم رہی ہوں۔“

ٹیکسی سے پیچھے بھاگتے ہوئے بازار اور عمارتیں کم ہوتی جارہی تھیں۔ اب اکا دکا کھیت بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ تبھی سڑک کے کنارے بھاگتے ہوئے درختوں کی تعداد بڑھنے لگی اور آشا کو لگا جیسے گھنا جنگل شروع ہورہا ہو۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو شہر کی عمارتیں بھی زیادہ دور نہیں تھیں۔ پھر ٹیکسی کی رفتار کم ہوتے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

جس جگہ ٹیکسی رکی تھی وہ جگہ بھی شہر سے کچھ خاص دور نہیں تھی۔ پیچھے اب بھی بڑی بڑی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ یہاں سے آگے جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی لگ رہی تھی۔

”پتہ نہیں یہاں کیوں آئے ہیں یہ لوگ۔ کتنی ڈراؤنی جگہ ہے یہ۔“ راستے بھر کتنی خوش آئی تھی وہ' سب ختم ہوچکا تھا۔

سلیکھا موسی کے اترنے کے بعد چاچی جی اور آشا بھی اتر گئیں۔ چاچی جی بھی شاید ڈر رہی تھیں۔ تبھی تو انہوں نے موسی سے پوچھا۔ ”یہ کہاں لے آئیں تم دیدی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ کتنی ویران اور خوفناک ہے یہ جگہ۔“

”بس نہیں پر وہ سیکڑوں سال پرانا مندر ہے' کالی مندر۔ چلو چلو۔“ موسی جانے کیا تھیں' ان پر کسی چیز کا اثر پڑتا ہی نہیں تھا۔

آشا چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھ رہی تھی۔ تب اسے وہ کھنڈر نما مندر دکھائی دیا۔

وہ مندر بہت ہی پرہیبت نظر آرہا تھا۔ چاروں طرف گھنی کانٹے دار جھاڑیوں کے بیچ میں سال خوردہ دیواریں۔ اس کے اردگرد بڑے جنگلی درخت بھی تھے جن کی وجہ سے وہ ایک نظر میں سڑک کی طرف سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

موسی آگے آگے اور چاچی جی کے ساتھ آشا ان کے پیچھے جھاڑیوں سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے چل رہی تھیں۔

مندر کا مرکزی دروازہ کبھی بہت عالیشان رہا ہوگا۔ اب تو دیواروں کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر جنگلی بیلیں اور پودے اگے ہوئے تھے۔

مرکزی دروازے کے بعد ایک بڑا سا صحن تھا جہاں اب اور بھی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جن سے پار جانا مشکل ہوتا مگر کنارے کی جھاڑیاں کاٹ کر مندر تک پہنچنے کا راستہ کسی نے بنا دیا تھا۔

”یہ موسی بھی نا...... یہ جنوں سے بھی زیادہ پراسرار ہیں' کیا ضرورت تھی اتنی دور آ کر کولمبس کی طرح مندر کھوجنے کی۔“ آشا کی چڑچڑاہٹ تو آسمان کو چھو رہی تھی۔

جھاڑیوں کے ساتھ بنی پگڈنڈی پر چل کر وہ لوگ مندر تک پہنچ گئے۔ آشا کے کومل پیروں میں کئی جگہ ان جھاڑیوں سے خراشیں بھی آگئی تھیں۔

سامنے کالی ماتا کی ہیبت ناک مورتی تھی۔ آشا کو بچپن سے ہی کالی ماں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ یہاں تو سنسان بھیانک مندر میں کالی ماتا کی نہ جانے کتنے سال پرانی مورتی تھی' اس کا خون خشک ہورہا تھا۔

”موسی...... موسی تم تو اس مورتی سے بھی زیادہ

خوفناک ہو..... واپس گھر پہنچ جاؤں تو کل سے تمہیں ہی ماں کالی کے نام سے پوجوں گی۔'' سوچتے ہوئے وہ دانت بھی پیس رہی تھی۔

ماں کالی کی مورتی کے سامنے ایک بڑا سا ہون کنڈ بنا ہوا تھا جس میں سے ابھی بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔

ہون کنڈ کے سامنے بالکل توے کی رنگت کا ایک آدمی آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ لمبی لمبی جٹائیں، جسم پر مختصری لنگوٹ۔ شاید یہ یہاں کا پجاری تھا۔

ان کے قریب پہنچے تو بنا آنکھیں کھولے انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا جیسے خاموش کھڑے رہنے کو کہہ رہے ہوں۔ آشا کو حیرت ہوئی۔ جلد ہی پجاری نے اپنی آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا۔

''باپ رے..... آنکھیں ہیں یا جلتی ہوئی بھٹی..... لال انگاروں کی طرح۔'' آشا تو زیادہ دیر ان کی طرف دیکھ ہی نہیں سکی۔

''بابا..... ہمیں درگا مندر کے پجاری نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

پجاری نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''ہم..... سب جانتے ہیں۔''

اچانک بابا اٹھ کھڑے ہوئے اور چاروں طرف سر گھما گھما کر نہ جانے کیا دیکھنے لگے۔ ان کی تیز تیز سانسیں گڑگڑاہٹ کی طرح سب کو سنائی دے رہی تھیں۔

پھر لگا جیسے ہوا میں کسی چیز کی مہک سونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ تب وہ آشا کی طرف گھومے اور ان کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''ہوں ں ں ں..... تو یہ ہے وہ لڑکی۔'' انہوں نے کسی طرف دیکھے بنا کہا۔

..مہاراج۔'' سلیکھا موسی کی آواز پتہ نہیں کیوں کانپ رہی تھی۔

''اس لڑکی کی تو ہمیں برسوں سے تلاش تھی۔'' بھیانک آواز میں بول کر پجاری نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

سبھی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج؟ آپ اس لڑکی کو کیسے جانتے ہیں؟'' سلیکھا موسی ڈر ضرور رہی تھیں مگر ان تینوں میں سب سے زیادہ ہمت والی بھی وہی تھیں۔

''ہاہاہا..... ہاہاہا..... ہاہاہا..... جے کالی ماں۔'' پجاری نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا پھر موسی کی طرف گھوم کر بولے۔ ''ہے دیوی! ہم کتنے سالوں سے شکتی پراپت کرنے کے لیے اس جنگل میں کالی ماں کی پوجا کر رہے ہیں۔ آج ماتا نے ہماری پوجا سوئیکار کر لی ہے۔ ہاہاہا..... ہاہاہا..... آج یہ لڑکی یہاں آ ہی گئی۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں مہاراج۔ کون سی شکتی؟ کیسی شکتی؟ اور یہ لڑکی..... یہ تو آشا ہے'' موسی اب پجاری کی باتوں سے کافی پریشان ہو رہی تھی۔

آشا کو تو پجاری کی باتیں سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ پجاری تو ویسے ہی اتنی بھیانک شکل کا تھا کہ بچے دیکھ کر ڈر کے مارے بیہوش ہو جائیں۔

''ماں کالی نے ہی اس لڑکی کو یہاں بھیجا ہے، میں جان چکا ہوں کہ اس لڑکی کے وش میں کئی شکتی شالی جن ہیں۔ میں عمل کروں گا اور ان جنوں کو اپنا سیوک بناؤں گا۔ ہاہاہا..... ہاہاہا۔''

یہ سن کر سلیکھا موسی اور چاچی جی حیران ہو گئیں۔ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے آشا کو دیکھنے لگیں۔ وہ تو ہلکا سا شک ہونے پر آشا کو اس پجاری کے پاس لائی تھیں کہ شاید آشا کی طرف سے آنے والی مصیبتیں ختم ہو جائیں۔

آشا جنوں کا نام سن کر چونک پڑی۔ اس پجاری کو کیسے پتہ چل گیا۔ اب اسے ان جنوں کے لیے فکر ہونے لگی۔ کیا یہ پجاری انہیں اپنے قبضے میں کر لے گا۔ یہ جن تو اب اس کے اپنے تھے۔

روی کی وجہ سے اسے جنوں سے بے حد لگاؤ ہو گیا تھا۔ ان سے اس کا ڈر تو بہت پہلے ختم ہو گیا تھا۔ ان سب جنوں کے سردار بابا سکندر سے وہ مل چکی تھی۔ بابا سکندر نے بھی اسے اپنا مانا تھا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر آشیرواد دیا تھا۔

کیا بابا سکندر کو اپنے جنوں پر آنے والی مصیبت کی جانکاری ہو سکے گی؟ کیا روی کو ان سب کے بارے میں پتہ ہو پائے گا۔

معصوم آشا صرف جنوں کی مصیبت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے اپنے اوپر آنے والی مصیبتوں کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو سلیکھا موسی کو صرف اس بات کے لیے کوسے جا رہی تھی کہ انہیں اتنی دور اس ویران مندر میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

سلیکھا موسی اور چاچی جی کو اب اس بات سے خوشی ہو رہی تھی کہ اب آشا کے ساتھ رہنے والے جن اس کے پاس نہیں رہ پائیں گے۔ پجاری اپنے عمل سے ان جنوں کو اپنے قبضے میں کر لے گا۔

''مہاراج۔ ہمیں ان جنوں سے چھٹکارا دلا دیجیے۔ آپ جو کہیں گے ہم مانیں گے۔ ہم ان جنوں سے بہت پریشان ہو چکے ہیں۔'' سلیکھا موسی کو پتہ نہیں جنوں سے کتنا بیر ہو چکا تھا۔ اس بھیانک پجاری کے سامنے گڑگڑانے لگیں۔

''موسی..... موسی..... شکر ادا کرو بابا سکندر کا جو اتنا بول کر بھی تم اپنے پیروں پر کھڑی ہو..... ورنہ۔'' آشا دانت پیستے ہوئے من میں بولی۔

''اس لڑکی کو میں جنوں سے چھٹکارا دلا دوں گا۔ تم سب چنتا مت کرو۔ بس اب تم دونوں اس کنیا کو یہاں چھوڑ کر اپنے گھر جاؤ۔ کل آ کر اسے لے جانا۔''

''کیا؟'' سلیکھا موسی اور چاچی جی ایک ساتھ بولیں۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا مہاراج۔ آپ ابھی عمل کر لیں۔ ہم اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' موسی کو بھی پجاری کی یہ بات بری لگی تھی۔

''عمل کا ایک وقت ہوتا ہے دیوی۔ یہ ابھی نہیں ہو سکتا۔'' پجاری کی آواز میں سختی اور بڑھ گئی تھی۔

''پر ہم تو اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ ہم پھر کبھی آ جائیں گے مہاراج۔''

بابا کی نیت پر اب دونوں کو شک ہو رہا تھا اس لیے موسی اپنا فیصلہ سنا کر مانو پجاری سے واپس جانے کی اجازت مانگ رہی تھیں۔

''ہاہاہا..... ہاہا..... کون ہے جو ہماری بات کو رد کر سکے، تمہیں جانا ہی پڑے گا دیوی۔''

''نہیں مہاراج ہم تو آشا کو لے کر ہی جائیں گے۔'' موسی نے اس بار اٹل انداز میں کہا۔

تبھی پجاری ہون کنڈ کے اوپر اپنے ہاتھ پھیلا کر کچھ بڑبڑانے لگا۔ ہون کنڈ سے اچانک سیاہ دھواں نکل کر چاروں طرف پھیلنے لگا۔ دھواں بہت تیزی سے نکل رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں دھواں اتنا گہرا ہو گیا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سیاہ دھوئیں کی چادر اتنی دبیز تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، سب کو سانس لینے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔

یہ سب دو چار سیکنڈ میں ہو گیا۔ دوسرے ہی پل دھواں ختم ہو گیا کہ جیسے تھا ہی نہیں۔

مگر یہ کیا؟

سبھی چونک پڑے۔ وہاں پر اب نہ پجاری تھا اور نہ ہی آشا۔

سلیکھا موسی اور چاچی جی ہکا بکا ایک دوسرے کا

منہ تک رہی تھیں۔ اس وقت دونوں میں ایک دوسرے سے بولنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔
چاہے کچھ بھی ہوآشا ان کے گھر کی لڑکی تھی اور پھر چاچا جی تو اس کے لیے دونوں کو بخش ہی نہیں سکتے تھے۔
ان کی پریشانی دیکھنے لائق تھی۔ موی تو اب چاچی جی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ کیسے نظر ملاتی اس سے۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہورہا تھا۔ بے چینی اور بےکلی سے دونوں بہنیں ہر طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھیں۔
تبھی نہ جانے کیسے وہاں رومی بھاگتا ہوا پہنچا۔ اسے دیکھ کر دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خوش ہوں یا دکھی ہوں۔
”ارے رومی...... تم یہاں کیا کررہے ہو؟“ موی نے پوچھا۔
”میں سب بتادوں گا پہلے یہ بتائیں کہ آشا کہاں ہے؟“ رومی نے جلدی سے کہا۔
تب موی نے وہاں پر ہوئی سب باتیں رومی کو بتا دیں۔
”پرآپ لوگوں کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔“ یہاں ایسی پریشانی کے وقت مالک اور نوکر کا فرق مٹ سا گیا تھا۔ انہیں بس اس بات سے تسلی ہو رہی تھی کہ رومی یہاں ہے اور وہ کچھ ضرور کرے گا۔
”اب آپ دونوں جلدی سے یہاں سے چلی جائیں۔ ٹیکسی روڈ پر کھڑی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آشا کہاں ہے۔“
”لیکن رومی ہم آشا کو چھوڑ کر کیسے چلی جائیں؟“ چاچی جی نے پریشان ہوکر کہا۔
”تو پھر آپ لوگ یہاں کیا کریں گی۔ آپ مجھ پر بھروسہ کیجیے۔“ اس نے ان دونوں کو سمجھا بجھا کر واپس جانے پر راضی کیا۔ اور دونوں بھرے من سے لوٹ گئیں۔

......☆☆☆......

وہ جگہ کسی غار کی طرح لگ رہی تھی۔ آشا نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھا۔ غار میں رات کی طرح اندھیرا تھا۔ ایک طرف پتھریلی دیوار میں لگی مشعل جل رہی تھی۔
ماحول اتنا ڈراؤنا تھا کہ آشا ڈر سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سامنے آنکھیں بند کیے وہی پجاری کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔
اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچی۔ اسے بس یہ یاد تھا کہ مندر میں دھواں بھر گیا تھا' کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک اسے لگا کوئی کپڑا اس کے اوپر لپٹ گیا' جسے اپنے اوپر سے ہٹانے کے لیے اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا پھر...... پھر...... پھر کیا ہوا اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ بس اسے لگ رہا تھا جیسے وہ گھاس بچھے فرش پر بیٹھے بیٹھے سورہی تھی۔
پجاری کا منترا جاری تھا۔ اس ان کے منہ سے منتروں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو آشا کی سمجھ سے باہر تھے۔
تب اسے خیال آیا کہ وہاں موی اور چاچی جی بھی تو تھیں۔
”چاچی جی ی ی ی......“ اتنی زور سے چلائی تھی وہ کہ اس کی آواز کافی دیر تک اس گپھا میں گونجتی رہی تھی۔
تب پجاری کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہی لال لال خون بھری آنکھیں۔
”مہاراج...... میری چاچی جی کہاں ہیں...... موی کہاں ہیں؟“
”ہاہاہا...... ہاہاہا...... لڑکی!...... بھول جا اپنے گھر

...میں بھی دونوں کو اپنے ...ے میں کرلوں گا۔ ...میں سب سے زیادہ شکتی شالی بن جاؤں گا۔ اور اور پھر تجھے اپنی رانی بناؤں گا۔ ہاہاہا...... ہاہاہا“
تب آشا کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کوئی نیک پجاری نہیں بلکہ ایک پاپی اور شیطان صفت انسان ہے۔
جنوں کی دنیا سے متعارف ہونے سے پہلے وہ ایک ڈرپوک لڑکی تھی۔ مگر رومی کے ساتھ اور جنوں سے ملاقات کے بعد وہ نڈر ہوچکی تھی۔
اسے پورا یقین تھا کہ یہ پاپی ڈھونگی پجاری جنوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔
مگر اسے پتہ نہیں تھا کہ اس دنیا میں سب سے مہان مخلوق انسان ہے اور سب سے گھٹیا مخلوق بھی انسان ہی ہے۔ جہاں ایک اپنے اچھے کاموں سے دیوتا ہی نہیں بھگوان کو بھی جھکا سکتا ہے اور وہی اپنے پاپوں پر اتر آئے تو بھگوان کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے۔ یہ جن تو بہت سیدھی اور سچی مخلوق ہیں۔
”اے پاپی اور ڈھونگی پجاری' تمہارا یہ سپنا کبھی پورا نہیں ہوگا۔ تو جنوں کی شکتی نہیں جانتا۔“ اسے بہت غصہ آرہا تھا' چیخ کر بولی۔
”اے پری! تو اپنے دائیں طرف اس بڑی چٹان پر دیکھ۔“ پجاری اپنی اسی کرخت آواز میں بولا۔
اس نے اپنی دائیں جانب دیکھا۔ پہلے بھی سرسری نظر دوڑائی تھی۔ مگر اس بار دھیان سے دیکھنے لگی۔ بڑے سے پتھر پر شیشے کے دو مرتبان رکھے ہوئے تھے دونوں کے منہ ڈھکن سے بند تھے۔
”ارے یہ کیا؟“ وہ چونک پڑی۔ دونوں مرتبان میں کوئی مخلوق ہل جل رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نزدیک جا کر دیکھا۔ پھر تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔
اس کے من پراسرار سینوں میں سے دو ان دونوں مرتبانوں میں بند تھے۔ اسے حیرت ہورہی تھی کہ یہ اتنے چھوٹے برتن میں کیسے بند ہیں۔ وہ آگے بڑھ کر ڈھکن کھولنا چاہ رہی تھی مگر وہ پجاری درمیان میں آگیا۔
”میں کہتی ہوں چھوڑ دو انہیں...... ورنہ تم خود نشٹ ہوجاؤ گے۔“ وہ غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے بولی۔
”لڑکی تم میری مستقبل کی رانی ہو...... نہیں تو تمہیں اتنا بولنے کی سزا ضرور ملتی۔ چلو ادھر ہون کنڈ کے پاس بیٹھو' مجھے ابھی اور عمل کرنا ہے۔“
آشا وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ پجاری نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا کہ گپھا کے درو دیوار سے تیز آواز گونجنے لگی۔ ”ٹھہر جا پاپی...... دشٹ۔“ دونوں اس آواز پر چونک اٹھے۔
”رومی۔“ آشا کے ہونٹوں پہ بےساختہ یہ نام آگیا۔
آشا نے دیکھا کہ رومی تیزی سے پجاری کی طرف بڑھا۔
”کون ہو تم۔ یہاں کیسے آگئے؟“ رومی کا اس گپھا میں گھس آنا اور ایسے تیور کے ساتھ ان کے سامنے کھڑے ہونا پجاری کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ اپنی آگ برساتی آنکھوں سے رومی کو خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔
”دشٹ پجاری۔ آشا کو لے جانے اور تجھے تیرے پاپوں کی سزا دینے آیا ہوں۔“ رومی ایک دم ٹھنڈے اور گمبھیر لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے پر سدا قبضہ جمائے رہنے والا کھلنڈراپن' چنچل آنکھیں اور ہونٹوں پر بسی رہنے والی مسکراہٹ غائب تھی۔ یہ وہ رومی تو نہیں تھا جسے آشا اتنے دنوں سے دیکھتی آ

رہی تھی۔

"تُو...... ہاہاہا...... ہاہاہا...... تُو مجھے سزا دے گا...... ننھے بچے...... ہاہاہا...... ہاہاہا...... جا چلا جا یہاں سے اور اپنی جان بچالے۔ تیری اب تک کی بکواس میں شما کرتا ہوں۔"

"چلو آشا...... دیکھتے ہیں یہ وشٹ ہمیں کیسے روکتا ہے۔" وہ آشا کا ہاتھ پکڑ کر جانے کے لیے مڑا۔ تبھی آشا نے دیکھا کہ پجاری نے کچھ منتر پڑھ کر باہر جانے والے راستے کی طرف ایک پھونک ماری۔ اچانک جانے کہاں سے بہت سے کالے کالے زہریلے سانپ آشا اور روی کے سامنے پھنکارتے ہوئے آ گئے۔ آشا انہیں دیکھ کر خوف سے چیخ پڑی۔

"اوہ۔ ہو...... تو یہی ہیں تمہارے ہتھیار...... جن کے بل پر تُو کود رہا ہے۔" روی نے حقارت سے پجاری کی طرف دیکھا۔

"بچے تو انہی کو پار کرلے...... ابھی تُو نے بابا ردے ناتھ کی شکتی کو دیکھا ہی کہاں ہے۔"

روی کے آجانے سے آشا کی ساری فکریں ختم ہوچکی تھیں۔ وہ اس بات سے ہی خوش تھی کہ ایسے برے وقت میں اس کا روی اس کے پاس ہے۔ پھر اسے کس بات کا غم۔ جیئیں گے تو ساتھ ساتھ اور مریں گے تو ساتھ ساتھ۔ لیکن اسے چنتا تھی تو اپنے سیوکوں کی جنہیں اس پاپی پجاری نے نہ جانے کس عمل کے ذریعے مرتبان میں قید کرلیا تھا۔

"روی...... وہ...... سیوک......" اس نے روی کو ان مرتبانوں کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔

"پتہ ہے مجھے کہ اس دشٹ نے اپنے منتروں کے بل پر انہیں قید کرلیا ہے لیکن اسے پتہ نہیں کہ یہ جن بابا سکندر کے سیوک ہیں اور بابا سکندر کی شکتی کے آگے یہ پجاری کچھ بھی نہیں ہے۔ تم دیکھنا اس کا منتر اسی پر پلٹ جائے گا۔"

ان دونوں کے آگے جو سانپ تھے وہ بھیانک انداز سے پھنکار رہے تھے۔

"بچہ اگر تُو نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس کا انجام بھی خود دیکھ لوگے۔"

روی سمجھ رہا تھا کہ پجاری جھوٹ نہیں بول رہا۔ ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ اچانک اس نے پجاری کی گردن دبوچ کر پکڑلی "مکار پجاری اب تُو مجھ سے چھوٹ کر دکھا۔ اب تُو ہمیں باہر لے جائے گا......"

پہلی بار آشا نے پجاری کے چہرے پر پریشانی کی جھلک دیکھی۔ لیکن یہ پریشانی اس کے چہرے پر زیادہ دیر تک نہیں رہی۔

"آہ......" آشا کو روی کی کراہ سنائی دی۔ پجاری کی جٹاؤں سے سانپ نکل رہے تھے۔ ایک سانپ روی کی کلائیوں سے لپٹ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے پجاری کو چھوڑ کر اپنے ہاتھ جھٹکے۔ ہاتھ سے لپٹا سانپ دور جا گرا۔ پجاری اچھل کر اس سے دور ہٹا اور سانپوں کی دوسری طرف جا کر مسکرانے لگا۔ اب روی اور پجاری کے بیچ درجنوں سانپ پھن اٹھائے پھنکار رہے تھے۔

"اوہ کھنڈی...... بس یہی ہتھیار ہے تیرے پاس یا اور بھی کچھ ہے۔ سب ایک ساتھ لے کر آجا۔ تاکہ تجھے یہ افسوس نہ رہ جائے کہ کوئی ہتھیار بچا رہ گیا۔"

"بچہ...... تُو کیول بڑی بڑی باتیں کرسکتا ہے تُو کیا مجھ سے جیتے گا۔" پجاری نے حقارت سے روی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تبھی آشا نے دیکھا کہ اچانک پجاری سانپوں کے بیچ میں کود پڑا اور سانپوں کو اٹھا کر دور پھینکنے لگا۔ وہ بنا ادھر ادھر دیکھے اپنے اس کام میں لگا رہا جیسے اسے کچھ ہوش نہ رہا ہو۔ جب ایک ایک کرکے سارے سانپوں کو پھینکتا چلا تب وہ سیدھا کھڑا ہوا اور حیرت سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

روی تالیاں بجا بجا کر ہنس رہا تھا۔ آشا سب تماشہ خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اب کسی بات سے حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ایسے ایسے حالات کا شکار ہوئی تھی کہ کتنی باتوں پر حیرت کرتی۔ جب روی تالیاں بجا رہا تھا تب وہ مسکرانے لگی تھی۔ اب روی پھر سے اپنے اسی پرانے رنگ میں آچکا تھا۔

"اے لڑکے...... یہ مذاق میرے ساتھ تُو نے کیا ہے؟ اب تُو میرا اگلا ہتھیار جھیلنے کے لیے تیار ہوجا۔"

"مہاراج...... میرا اپنا منتر والا ہتھیار کیسا رہا...... کچھ تو تعریف کردو یار...... ہی ہی ہی ہی......"

روی اور آشا باہر کے راستے کی طرف بڑھے۔ پجاری کے سامنے سے گزرتے ہوئے آشا کو لگا جیسے وہ اب باہر نکلنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ مگر تبھی سامنے کا راستہ آگ کے شعلوں سے بھر گیا۔

وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو دور کھڑا پجاری ہنس رہا تھا۔ روی نے چاہا کہ اس پجاری کی خبر لے لیکن اسی وقت ادھر سے بھی آگ کے اونچے اونچے شعلے اٹھنے لگے۔

اب ان کے آگے اور پیچھے دونوں طرف آگ ہی آگ تھی۔ آشا اس نئی آفت سے پریشان ہوگئی۔ اسے جلدی تھی کہ اس بھیانک ماحول سے نکل کر اپنے روی کی سنگت میں میٹھے پیارے کچھ پل گزارے۔ مگر یہ منحوس پجاری بار بار رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا......

"ہاہاہا...... ہاہاہا...... بچہ...... اب نکل جاؤ باہر۔ ہاہاہاہاہا۔"

"پاپی پجاری تُو اپنے گیان اور منترا کو برائی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ تُو ضرور سزا پائے گا۔" روی اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

اچانک گپھا میں ایک تیز پھنکار سنائی دی۔ پھنکار اتنی تیز تھی کہ گپھا میں لگا جیسے ایک آندھی آگئی ہو۔ آشا نے دیکھا کہ پجاری کچھ پریشان سا ہوکر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تب ہی کو اس تیز پھنکار کی وجہ بھی نظر آنے لگی۔ ایک بہت بڑا اژدھا گپھا کی

دوسری طرف سے اندر آ رہا تھا۔

وہ اژدھا شاید اتنا خطرناک تھا کہ پجاری کی گھبراہٹ بڑھ گئی تھی۔ اژدھا بھی اپنی دھیمی چال سے پجاری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آشا نے دیکھا کہ پجاری اس کے ڈر سے پیچھے کی جانب ہٹ رہا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ آگ کے کنارے پہنچ گیا تھا اور بہت دھیرے دھیرے اس کا پیچھے ہٹنا جاری تھی۔ آشا دم سادھے سب دیکھ رہی تھی۔

"ہے بھگوان، پجاری جی کہیں آگ میں نہ گر جائیں۔" آشا تو آشا تھی۔ اس کے ساتھ اتنا برا کرنے والے پجاری کو بھی خطرے میں دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی اور اس کے لیے ایشور سے پرارتھنا کرنے لگی تھی۔

پجاری دھیرے سے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا اور آخرکار وہ آگ کے لپیٹے میں آ ہی گیا۔ پر یہ کیا؟ وہ جیسے جیسے پیچھے ہٹ رہا تھا وہاں کی آگ بجھتی جا رہی تھی۔

"کیسی آگ ہے یہ...... شاید ان کے منتروں سے پیدا یہ آگ ان کو نقصان نہیں پہنچا رہی تھی اسی لیے وہ بجھتی جا رہی ہے۔" آشا نے سوچا۔

آہستہ آہستہ پجاری، روی اور آشا کے قریب آ گیا۔ ان کے بیچ کی آگ بجھ چکی تھی لیکن اب بھی باہر جانے کے راستے کی طرف کی آگ ویسے ہی بھڑک رہی تھی۔ جب پجاری روی کے نزدیک پہنچا تو روی نے اسے زور سے اژدھے کی جانب دھکا دیا۔ اژدھا اپنا پھن اٹھائے لال لال آنکھوں سے پجاری کو گھورتے ہوئے اس پر جھپٹا اور پجاری کی ایک تیز چیخ سنائی دی۔

"آہ ہ ہ ہ ہ ہ۔" حملہ ان کے ایک ہاتھ پر ہوا تھا ان کا ایک ہاتھ بیکار ہو چکا تھا۔ تبھی اژدھے کا دوسرا حملہ ان کے دوسرے ہاتھ پر ہوا۔

پجاری کی چیخوں سے پوری گپھا گونج رہی تھی۔

تبھی آشا نے دیکھا کہ چاروں طرف تیزی سے دھواں پھیل رہا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دھواں ایک جگہ سمٹ گیا اور جہاں اژدھا تھا وہاں پر اب وکرال کھڑا ہنس رہا تھا۔

پجاری نے کراہتے ہوئے اسے دیکھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جھوٹے دھوکے باز پجاری اب تیرا کیا کروں، پہچان مجھے، میں ہوں جنوں کے سردار بابا سکندر کا بیٹا وکرال۔"

"آہ ہ ہ...... تمہارے بتانے سے پہلے میں تمہیں...... آہ ہ...... پہچان چکا تھا۔ بس اجگر کے روپ میں تجھے نہیں پہچان پایا...... آہ ہ ہ...... یہی میری سب سے بڑی غلطی ہوئی ورنہ تُو بھی کسی بوتل میں قید ہو چکا ہوتا۔" پجاری کی ہیکڑی اس حال میں بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"میں تو ابھی تمہاری جیون لیلا ختم کر چکا ہوتا مگر میرے بابا نے مجھے اس کے لیے منع کر کے بھیجا ہے۔ تُو شکر کر کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی میں تجھے زندہ چھوڑ رہا ہوں۔" اتنا کہنے کے ساتھ ہی وکرال نے اپنی ایک انگلی کا اشارہ کراہتے ہوئے پجاری کی طرف کیا اور پجاری کسی اسپرنگ لگے کھلونے کی طرح وہاں سے اچھل کر سیدھا آگ کے بیچ جا گرا۔ وہاں کی بھی پوری آگ بجھ گئی۔ زمین پر گرا ہوا پجاری درد سے اب بھی کراہ رہا تھا۔

"روی تم آشا کو لے کر یہاں سے نکلو جلدی، ابھی یہ پاپی مرا نہیں ہے۔ صرف تکلیف کی وجہ سے اپنا جاپ بھولا ہوا ہے۔ تم لوگ جاؤ میں ابھی ان سیوکوں کو آزاد کر کے یہاں سے نکلتا ہوں۔"

روی، آشا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے گپھا سے باہر

...مانتے ہی وہ کھنڈر نما مندر دکھائی دیا۔ آشا سمجھ ...ی کہ وہ گپھا مندر کے پیچھے والے حصے میں تھی۔

...مندر سے گزر کر وہ سڑک تک آ گئے۔ یہاں ...چا جی کی کار کھڑی تھی۔ دونوں جلدی سے اس میں بیٹھے اور روی گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا گیا۔

"روی...... میرے روی......" آشا نے روی کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ "میں اس پریشانی میں تجھے ہی یاد کر رہی تھی اور تم پہنچ گئے۔"

"ہم م م...... یہ سڑک ہے میڈم...... اور میں نے انسانوں کی دنیا میں کم ہی کار چلائی ہے۔" روی ہنستے ہوئے بولا۔

"کیوں...... کم کیوں چلائی ہے؟" آشا نے اپنے معصومیت بھرے سوالوں کی شروعات کی۔

"بس یوں سمجھ لو کہ جیسے انسان اپنی آواز اور تصویر کو بجلی کی لہروں میں بدل کر پلک جھپکتے ہی ہزاروں میل دور پہنچا سکتا ہے، اسی طرح جن کسی بھی چیز یا انسان کو چھوٹے چھوٹے ذرات میں بدل کے ریڈی ایشن کے ذریعے لاکھوں میل دور پہنچا سکتا ہے۔ بس ان کے یہاں یہ سائنس بہت آگے ہے انسانوں سے۔ اب تو انسان بھی ان باتوں کی ریسرچ میں لگے ہوئے ہیں۔"

"چلو اب تم یہ بتاؤ کہ تم اس گپھا میں کس طرح پہنچ گئے؟ تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ تمہاری آشا مشکل میں ہے؟" آشا نے بڑے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

تمہارے سیوک ہر دم تمہارے ساتھ تھے، جب ان سب نے دیکھا کہ پجاری تمہیں اس گپھا میں لے جا رہا ہے تب ان میں سے ایک نے بابا سکندر سے رابطہ کیا۔ انہوں نے وکرال کو اس کام کے لیے ...شکتیاں اور ہدایات دے کر بھیجا۔ اگلے ہی پل وکرال میرے پاس تھا۔ اس نے مجھ میں ٹیلی پیتھی کی شکتی پراپت کی اور پلک جھپکتے میں وہاں تھا۔" یہ کہتے ہوئے روی نے اپنا منہ آشا کے چہرے کے اور نزدیک کر لیا۔ آشا کا پورا دھیان اس کی باتیں سننے میں لگا ہوا تھا۔ شرارتی روی کے ہونٹ دھیرے دھیرے آشا کے رس بھرے ہونٹوں کے قریب آتے جا رہے تھے۔

روی کے ہونٹ آشا کے ہونٹوں سے جڑنے ہی کو تھے کہ آشا کو ہوش آ گیا۔ اس نے جلدی سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا اور مسکرا کر بولی۔ "بس بس...... زیادہ رومانٹک ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دھیان سے گاڑی چلاؤ۔"

روی اپنا سر کھجاتا ہوا ونڈ اسکرین کے پار دیکھتا ہوا بولا۔ "بس اب آنکھیں بند کرو میں گاڑی سمیت تمہیں پلک جھپکتے گھر پہنچا دیتا ہوں۔ پھر مجھے تمہارے چاچا جی کو لینے بھی جانا ہے۔

گھر پہنچتے ہی روی آشا کو اتار کر واپس لوٹ گیا۔ آشا کو دیکھتے ہی چاچی جی خوش ہو گئیں۔ ایسا ہی کچھ آشا کو سلیکھا موسی کے چہرے پر بھی دکھائی دیا۔ آشا کو یہ ایک انقلاب سا لگ رہا تھا۔

تھوڑا رک کر دونوں عورتوں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟ کیا پجاری تمہیں اٹھا کر لے گیا تھا؟ روی کو تم کہاں ملیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

آشا روی کے سکھائے جواب انہیں سنا گئی جو اس طرح تھے۔

"پجاری نے کوئی جڑی بوٹی سنگھا کر مجھے بیہوش کر دیا اور پھر مجھے اٹھا کر پہاڑی کے پیچھے لے گیا۔ وہاں جھوٹ موٹ کے سوال مجھ سے کر رہا تھا اور طرح طرح سے مجھے ڈرا دھمکا رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کا ارادہ کیا تھا۔ تبھی روی نہ جانے کیسے وہاں پہنچ گیا۔

روی اور پجاری میں خوب لڑائی ہوئی اور وہ مجھے چھڑا کر لے آیا۔"

سلیکھا موسی اپنے نرالے انداز میں پجاری کو برا بھلا کہنے لگیں۔

"مگر دیدی یہ تو سوچو کہ اگر روی آشا کو تلاش کر کے نہ لے آتا تو آج تو گھر میں نہ جانے کیا قیامت آجاتی۔ آئندہ اب آپ کی باتوں پر میں کبھی نہیں چلوں گی۔"

"لو بھلا میں نے کیا برا کیا۔ میں تو ہمیشہ تمہاری بھلائی ہی چاہتی رہی ہوں۔" موسی بھی کتنی ڈھیٹ تھیں۔ ان پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

آشا چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت تو کب کا بیت چکا تھا۔ پتہ نہیں کھانا کس نے تیار کیا۔ کسی نے کھایا بھی یا نہیں۔ بھوک تو خود اسے بھی لگ رہی تھی۔

کچھ سوچتے ہوئے وہ کچن میں آ گئی۔ سامنے ایک ٹرے میں کوئی چیز ڈھک کے رکھی ہوئی تھی۔ آشا نے کھول کر دیکھا تو اس میں بالکل تازہ کھانا سجا رکھا تھا۔ کس کا کھانا رکھا ہوا ہے؟ اس نے سوچا۔

"یہ آپ کا کھانا ہے مالکن۔ آپ کے سیوک آپ کی سیوا میں حاضر ہیں۔" اس کے کانوں کے قریب ایک دھیمی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اسی سیوک کی تھی جسے اس نے پجاری کی قید میں دیکھا تھا۔

آشا نے اطمینان کی سانس لی اور کھانے میں جٹ گئی۔ جنوں کے تیار کیے ہوئے کھانے تو ویسے ہی بہت مزیدار ہوتے تھے۔ اور یہ تو خاص اس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ایسا لذیز کھانا شاید ہی کسی کو ملتا ہو۔

شام کو کچن کے پیچھے کے باغ میں جب وہ روی سے ملی تو بہت سارے نئے سوال اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ وہ گم سم سی بیٹھی تھی۔ روی کو اس کی یہ ادا پریشان کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے اب کیا ہوا تمہیں؟" وہ آشا کا چہرہ اپنی طرف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

"آج کے واقعے سے میں بہت پریشان ہوں۔ میرے سیوک کیا اس طرح کے پجاریوں سے ہمیشہ خطرے میں رہیں گے؟ یہ لوگ کیوں ان بے قصور جنوں کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں؟ اور ان کی وجہ سے کیا ہم دونوں کو بھی ایسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا رہے گا؟" آشا نے اپنی فکر ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"سنو۔ قدرت نے جنوں کو بہت سی طاقتیں دی ہیں۔ یہ عام انسانوں سے بہت آگے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی قدرت نے سادھو سنتوں کو جنوں سے کام لینے کی شکتی بھی دی ہے۔ یہ سادھو سنت جنوں کو اپنے بس میں کر کے لوگوں کی بھلائی کا کام کرتے ہیں۔ اپنی منتر شکتی سے آس پاس موجود جنوں کو اپنا تابعدار بنا لیتے ہیں...... مگر کچھ ایسے بھی سادھو ہوتے ہیں جو اپنی منتر شکتی کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ انہیں دنیا کا لالچ گھیر لیتا ہے۔ ایسے ہی تھے وہ پجاری بھی۔ ایسے جھوٹے پجاریوں سے جنوں کی لڑائی چلتی رہتی ہے...... تم جب مندر گئی تھیں تو تمہارے پاس جن موجود تھے۔ پجاری اپنے گیان سے سمجھ گیا کہ وہ جن تمہارے آس پاس رہتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔"

"اب ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم ہر آنے جانے والوں سے مجھے کب تک بچاتے رہو گے۔ اپنے لیے بھی کچھ کرو گے؟"

"اپنے لیے؟"

"ہاں...... ہاں...... اپنے لیے۔"

"بس ابھی کرتا ہوں اپنے لیے۔" اس سے پہلے کہ آشا کچھ سمجھ پاتی روی نے اسے اپنی باہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ آشا تو اس حرکت سے بے چین ہو اٹھی۔ اس کی سانسیں تیز ہو چکی تھیں۔ کچھ کہنے کے لیے اپنے ہونٹ کھولنا ہی چاہتی تھی کہ روی کا اگلا حملہ اس کے نازک رس بھرے ہونٹوں پر ہوا۔

اس اچانک افتاد سے آشا کو حیران ہونے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ دونوں سچے پریمی پہلی بار ایک دوسرے کا لمس کچھ اتنے نزدیک سے محسوس کر رہے تھے۔ بلکہ وہ تو خود اپنا آپ بھول کر ان حسین کیفیات کے ہر پل کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے وقت ان دونوں کے لیے تھم سا گیا ہو۔ آشا چاہ رہی تھی کہ یہ پل یہیں رک جائیں۔ کتنا سکون تھا اپنے پریمی کی باہوں میں۔ ارمان مچل رہے تھے۔ ہوش کھوئے کھوئے جا رہے تھے۔ کچھ کر گزرنے کی خواہش حاوی ہو رہی تھی اور دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھتی ہی جا رہی تھی کہ تبھی کچن کے پچھلے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔

دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ لیکن ہونٹوں پر موجود نمی، گالوں کی بڑھی ہوئی گلابی رنگت، چہرے پر آئے پسینے کی بوندیں اور ریشمی بالوں کی کچھ بے ترتیب لٹیں اب بھی سارا بھید کھولے دے رہی تھیں۔

آشا کی نظر دروازے کے درمیان میں منہ پھاڑے کھڑی سلیکھا موسی پر پڑی۔ دوسرے ہی پل وہ تیزی سے اپنا سینہ پیٹتے ہوئے اندر چلی گئیں۔

آشا کو تو لگ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے یا بھگوان سیدھا اسے اپنے پاس بلا لے۔ روی کی ہمت اور پیار بھری کوشش سے آشا کے چہرے پہ آئی سندرتا اب پیلے پن میں بدل چکی تھی۔ آنکھیں تو ایسی تھیں کہ جیسے آنسوؤں کا دھارا بہنے کے لیے تیار ہو۔

اپنی گھنی پلکوں کو اٹھا کر جب اس نے روی کی آنکھوں میں جھانکا تو روی کو ان میں کئی سوال مچلتے دکھائی دیے۔

"سوری جان...... موسی کو تو سمجھو اس وقت یہاں لایا گیا تھا...... تم نے کہا تھا نا کہ اپنے لیے کچھ کروں۔ تو میں نے جھٹ پلان بنا لیا اور اس پر عمل بھی کر ڈالا۔" روی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

روی کا ایسا سنجیدہ لہجہ آشا کو بالکل پسند نہیں تھا۔ اسے تو بس ہنستا مسکراتا، چنچل سا روی پسند تھا۔

"ہاں...... تو تم اپنے پلان پر کام کرتے کرتے میری گردن کٹوا دینا کسی دن۔ اب دیکھو گھر میں کیسا طوفان اٹھتا ہے۔ مگر تم ہو کیے بدمعاش، کہاں سے سیکھا یہ سب؟"

"کہاں سے ...... مطلب؟ بہت اچھا لگا کیا تمہیں؟ کہو تو ایک بار پھر سے......" آشا نے اپنی انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ کر اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

"آج تو تم ایک دم سڑک چھاپ موالی لگ رہے ہو۔ مجھے اب یہاں نہیں رکنا، میں تو چلی۔" آشا خود کو چھڑا کر اندر جانے کے لیے تیار تھی کہ کچھ یاد کر کے پھر رک گئی۔

"پتہ نہیں اندر کا کیا ماحول ہوگا۔ موسی نے تو سب کو بتا دیا ہوگا، میں کیسے جاؤں؟"

"ٹھہرو...... ابھی پتہ کرتے ہیں۔" روی نے یہ کہتے ہوئے دھیرے سے کسی کا نام لے کر پکارا، آشا کو سامنے اس کا ایک سیوک دکھائی دیا۔

جن نے بتایا کہ سلیکھا موسی نے جب سب کے سامنے آنکھوں دیکھا حال سنایا تو کسی نے اس پر

یقین نہیں کیا۔ سب یہ سمجھ رہے تھے کہ موہی ایسا آشا سے اپنی دشمنی کی بنا پر کہہ رہی ہے۔ لیکن جب انہوں نے سب کو چل کر دیکھ لینے کے لیے کہا تو سب تیار ہو گئے اور اب سب ادھر ہی آ رہے ہیں۔

یہ سن کر آشا بجلی کی طرح دوڑی اور پلک جھپکتے میں کچن کے اندر تھی۔

کچن میں کھانا تو سیوکوں نے تیار کر کے رکھا تھا۔ آشا ڈھکن کھول کر دیکھ ہی رہی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو چاچی جی اندر آ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے سلیکھا موہی سیما اور نکیتا بھی تھیں۔

"چاچی جی...... آپ...... اور سب لوگ؟ کیا بات ہے؟ کوئی ضروری کام ہے کیا؟" آشا نے معصومیت سے پوچھا۔

محبت معصوموں کو تیز اور سدا کے تیز انسانوں کو معصوم بنا دیتی ہے۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم دیکھنے آ رہے تھے کہ کھانا بنانے میں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہو رہی۔" چاچی جی سے بس یہی جواب بن پڑا۔

آشا من ہی من میں مسکرائی۔ ہم جسے کمتر سمجھتے ہیں، کبھی کبھی اس کے آگے بھی صفائی دینی پڑ جاتی ہے۔

"کچن میں اتنی گرمی ہے۔ تم یہ پیچھے کا دروازہ کیوں بند رکھتی ہو؟" یہ کہتے ہوئے چاچی جی نے وہ دروازہ کھول دیا اور باہر سر نکال کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

دروازے سے سچ مچ کچھ ٹھنڈی ہوا آنے لگی تھی۔ لیکن آشا کے من میں تو چوری پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ پھر کیسے دروازہ کھلا چھوڑ دیتی۔

"اے لڑکی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم کہاں تھیں اور کیا کر رہی تھی؟" سلیکھا موہی کو ہار ماننا بالکل پسند نہیں تھا۔

"کہیں نہیں تھی۔ بس کمرے سے نکل کر یہاں کچن میں آئی ہوں۔" اسے جھوٹ بولنا بالکل پسند نہیں تھا۔ مگر اس روی کی وجہ سے اسے جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ کم تھا۔

"اب چھوڑو دیدی۔ آشا کو اپنا کام کرنے دو۔" چاچی جی کی آواز میں اکتاہٹ صاف جھلک رہی تھی۔ وہ کچن سے باہر نکل گئیں۔ ان کے پیچھے ہی موہی بھی کچھ بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں۔ سیما اور نکیتا وہیں کھڑی تھیں۔

"اب تم دونوں بتاؤ کیا بات ہے؟ اس طرح کچن میں حملہ بنا کسی وجہ کے تو نہیں ہو سکتا؟" آشا نے ہنستے ہوئے ان دونوں سے پوچھا۔

"تمہیں پتہ ہے موہی تمہارے بارے میں کتنی رومانٹک باتیں کہہ رہی تھیں۔ اف کیا بتاؤں میں تو سن کر اتنا ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔" نٹ کھٹ نکیتا نے اپنے حساب سے بہت بڑی راز کی بات کہہ دی۔

"ہے رام!!!...... یہ موہی بھی نا...... بھگوان ان سے سمجھے۔ پر وہ کیا کہہ رہی تھیں؟" نکیتا نے موہی کی کہی بات آشا کو بتا دی۔ آشا کی دھڑکنیں تو یہ سن کر تیز ہونے لگی تھیں۔

"مگر یہ روی ہے بڑا سندر۔ میں نے ایک دن دوپہر کو برگد کے نیچے تم دونوں کو باتیں کرتے دیکھا تھا جب میں تمہیں بلانے گئی تھی۔ اس لیے مجھے تم پر شک ہوا تھا۔ پر میں جانتی ہوں کہ تم جیسی بدھو لڑکی سے روی جیسا بندہ سر نہیں پھوڑ سکتا۔" نکیتا ایک آنکھ بند کرتے ہوئے مسکرائی۔

آشا کو یہ لڑکی شروع سے ہی نہیں بھاتی تھی۔ ایک دم بازاروانداز تھے اس کے۔ اس کی باتیں سن کر ایک دم سے تپ گئی۔

"کاش روی اس گھر میں نوکر نہ ہوتا۔" نکیتا اپنے

ہاتھ رکھ کے اسٹائل سے بولی۔

"تو کیا ہوا۔ اسے نوکری سے نکلوا دو اور کر لو جو دل چاہے۔" آشا نے بھنا کر جواب دیا۔ "اب جاؤ تم یہاں سے مجھے بہت سارا کام کرنا ہے۔" آشا ہاتھ جوڑ کر ان سے بولی۔

بہت تکلیف پہنچی تھی اسے نکیتا کی باتوں سے۔ اپنے بارے میں اس کا تبصرہ وہ اکثر سنتی رہتی تھی۔ لیکن روی کے بارے میں وہ کچھ نہیں سن سکتی تھی۔ جانے کس کس طرح سے اس نے برداشت کیا تھا۔

روی کو نکیتا نوکر سمجھ کر چھوڑ رہی تھی۔ کتنے انجان ہیں یہ لوگ۔ روی چاہے تو خود کھڑے کھڑے ساری جائیداد خرید لے۔

"تم کیا جانو روی کیا ہے میرے لیے۔ میں نے اسے ایک ڈرائیور کی حیثیت میں ہی پیار کیا تھا۔ اپنی اصلیت تو اس نے بعد میں مجھے بتائی تھی۔ تم سب اس کے بارے میں ایسا ویسا نہیں بول سکتیں۔ وہ میرا ہے۔ صرف میرا۔" وہ دل ہی دل میں بولتی رہی۔

پھر کئی دن یونہی گزر گئے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ روی سے روز بات ہوتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ ہر بات کو ہنسی میں اڑا دیتا۔ آشا کبھی کبھی چڑ بھی جاتی تھی۔ لیکن اسے روی اپنے اسی روپ میں پسند تھا۔ جب بھی وہ مستقبل کی کوئی بات کرتی تو وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ٹال دیتا۔

آشا آج کل بالکل نکمی ہو چکی تھی۔ سب کام بنا کیے ہی ہو جاتے تھے۔ ایسے میں خالی بیٹھا آدمی کئی طرح کی سوچوں اور فکروں کا شکار ہو جاتا ہے۔

پھر چاچا جی نے ایک دن گھر میں ایسا دھماکہ کیا کہ آشا تو ہل ہی گئی۔ آشا کے لیے ایک بڑے دولتمند گھر سے رشتہ آیا تھا۔ اور یہ بات گھر کے کسی آدمی کے گلے سے اتر نہیں رہی تھی۔

"اتنے بڑے گھر میں رشتہ اور آشا کا، نہیں بالکل نہیں، بلکہ اپنی بیٹی کا کریں گے۔" چاچی جی نے اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ آشا کو جانتے ہیں۔ شہر میں ایک نئی فیکٹری لگائی ہے انہوں نے۔ دوسرے شہروں میں بھی ان کا بزنس ہے۔ انہیں کسی نے بتایا ہے کہ میرے بھائی کی لڑکی میرے گھر میں رہتی ہے اور بہت سندر اور سشیل ہے۔ لڑکا اب اسی شہر میں رہ کر ان کا بزنس سنبھالے گا۔"

ادھر آشا کو تو یہ سن کر پتنگے لگ گئے تھے۔ عجیب بے کلی کا شکار ہو گئی تھی۔ روی کا بھی پتہ نہیں تھا۔ جانے کہاں غائب ہے۔

پھر اسے پہلے رشتہ یاد آیا۔ کیا کیا درگت ہوئی تھی اس لڑکے کی۔ وہ سب یاد کر کے اپنے آپ مسکرا دی۔

"لگتا ہے ان جناب کی بھی ویسے ہی درگت بنے گی۔" اسے اپنے جن ساتھیوں اور سیوکوں پر پورا بھروسہ تھا۔

شام کو روی سے ملتے ہی ہنستے ہوئے یہ خبر سنائی۔

"مبارک ہو...... بڑی خوش دکھائی دے رہی ہو۔" روی تھکے تھکے انداز میں بولا۔

"کیوں؟ تمہیں میری خوشی اچھی نہیں لگتی کیا۔" روی کے جواب پر چڑ کر اس نے کہا۔

روی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ آشا کو روی کے پیار کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔

"آنے دو جتنے رشتے آئیں...... تمہیں تو صرف میرے گھر جانا ہے۔"

"بس باتیں بناتے رہنا۔ کچھ کرنا مت۔ ایسے میں سچ مچ کوئی کامیاب ہو گیا تو......" روی نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

"کیا تمہیں مجھ پر اور میرے پیار پر بھروسہ نہیں

ہے..... تمہیں پتہ ہے۔ تم تھوڑا سا بھی بھروسے میں کمی لائیں تو شاید قدرت کی طرف سے تمہیں اتنی سزا ضرور ملے گی۔" روی نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"بس بس مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔ میرا بھروسہ ایکدم پکا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو میں اتنی خوشی خوشی تمہیں یہ خبر سناتی کیا؟"

اگلے دن چاچا جی نے لڑکے والوں کے آنے کی اطلاع کر دی۔ آشا کو دیکھنے لوگ آ رہے تھے۔ آشا کو روی پر پورا یقین ہونے کے باوجود یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ پتہ نہیں آج کیا ہوگا؟

گھر کے نوکر آنے والے مہمانوں کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ چاچی جی' سیما اور نکیتا کو پارلر بھیج رہی تھیں کہ شاید آنے والے لوگ ان کی بیٹیوں میں سے کسی کو پسند کر لیں۔

آشا کو صرف چائے بنا کر لانے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ باقی کی تیاری نوکروں کے ذمہ تھی۔

ٹھیک وقت پر سارے مہمان پہنچ گئے۔ چاچی جی نے آج آشا کو عام دنوں کے مقابلے میں بہت ہی معمولی کپڑے پہنائے تھے۔ وہ کچن میں چائے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔

نوکروں کے کچن میں کام کرنے کی وجہ سے آشا کے سیوک بھی غائب تھے۔

نوکر ٹرالی میں کھانے پینے کا سامان لے کر جا چکے تھے۔ اب آشا کا بلاوا آنا تھا۔ تبھی ایک نوکر نے آ کر چائے لے جانے کو کہا۔

وہ کچن کی گرمی سے پسینے میں تر ہو چکی تھی اوپر سے کپڑے بھی بے ڈھنگے تھے۔ چائے کی ٹرے اٹھا کر وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ اسے ساتھ میں لے کر جانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ بھلے سے یہ رشتہ نہ ہو پر اپنی ابھی کی حالت پر اسے رونا آ رہا تھا۔

کیا ممی پاپا کے ہوتے ہوئے اسے مہمانوں کے سامنے ایسے جانا پڑتا؟ ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے آنسوؤں کی کئی بوندیں اس کی آنکھوں سے ٹپک چکی تھیں۔

کمرے میں جا کر اس نے مہمانوں کے سامنے رکھی سینٹر ٹیبل پر چائے کی ٹرے رکھ دی اور خود وہیں کھڑی ہو گئی۔ پتہ نہیں کیوں وہ نروس سی ہو رہی تھی۔ ورنہ نوکروں جیسا کام تو وہ کتنے ہی مہمانوں کے سامنے اچھے ڈھنگ سے کر چکی تھی۔

"یہاں بیٹھو بیٹی۔" سامنے بیٹھے ایک بزرگ نما آدمی نے شہد جیسی میٹھی آواز میں کہا اور بغل کے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کا اسے اس طرح پیار سے پکارنا آشا کو اندر ہی اندر رلا رہا تھا۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے دوسری جانب بیٹھے چاچا جی کو دیکھا جو اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

سکڑی سمٹی سی وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ تبھی وہ ہمدرد آواز پھر سنائی دی۔

"بیٹی کیا ہمیں چائے نہیں پلاؤ گی؟"

"جی..... جی....." وہ ٹرے کو اپنی طرف کھینچ کر چائے بنانے لگی۔ شکر اپنے من سے ڈال کر اس نے کپ اٹھا کر بزرگ آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں چائے بڑھا کر وہ دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک ادھیڑ عمر خوبصورت سی خاتون تھیں اور ان کے بعد..... "شاید یہی لڑکا ہے۔" اس نے سوچا۔

تبھی اسے پتہ چلا کہ وہ لڑکا ایک بار بھی اس کی

ل نہیں دیکھ رہا تھا۔ جبکہ اس کا پورا دھیان سیما اور ملبتا پر تھا۔ دونوں پورے میک اپ اور قیمتی کپڑوں میں وہ بھی بہت ہی سندر لگ رہی تھیں۔

یہ دیکھ کر نہ جانے کیوں وہ مسکرا اٹھی۔

"کیا بات ہے بیٹی..... ہم سے بات نہیں کرو گی؟" اس بار وہ خاتون بول اٹھیں۔ اتنی ہی میٹھی آواز میں۔

آشا باقی لوگوں کو چائے دیتی ہوئی اس لڑکے تک پہنچی۔ اس وقت اسے کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ چونکتے ہوئے وہ آشا کے ہاتھ سے کپ لے کر چائے پینے لگا۔

"عجیب ہے یہ بھی۔" اس نے سوچا۔ پھر اس آنٹی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"پرکاش جی مجھے تو آپ کی بھتیجی بہت پسند آئی ہے۔ آپ اس رشتے کے لیے راضی ہوں تو ہم آگے کی کارروائی کریں۔" بزرگ انکل نے چاچا جی سے کہا۔

اب آشا چونک پڑی۔ یہاں تو شادی کی باتیں پوری ہو رہی تھیں۔ روی کہاں رہ گیا۔ پتہ نہیں کیا کر رہا ہے وہ۔

ابھی تک اس مہمانداری کو وہ مذاق سمجھ رہی تھی۔ مگر جب انکل نے چاچا جی سے بات شروع کی تب بے چینی اور بڑھ گئی اور ایک سرد سی لہر اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی۔

"شیام لال جی۔ آپ کے ساتھ رشتہ بندھ جائے تو یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہوگی۔ میں آپ کی شرافت کے بارے میں بہت سن چکا ہوں۔ یہ میری بھتیجی آشا ہے اور وہ دونوں میری بیٹیاں سیما اور نکیتا ہیں۔ ان میں سے آپ اپنے لڑکے کے لیے جسے ل یں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

چاچا جی نے غیر محسوس طریقے سے سیما اور نکیتا کو بھی لائن میں کھڑا کر دیا۔ ہو سکتا ہے ایسا انہوں نے چاچی جی کے دباؤ میں آ کر کہا ہو۔

آشا من ہی من میں پرارتھنا کر رہی تھی کہ یہ انکل اسے چھوڑ کر سندر لگتی سیما اور نکیتا میں سے کسی ایک کو چن لیں۔ اسے لڑکے کی جانب سے خود کو نظر انداز کیے جانے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی امید تھی کہ شاید وہ لڑکا ہی سیما یا نکیتا میں سے کسی کو پسند کر لے۔

لیکن کسی کے سوچنے اور چاہ لینے سے سب کچھ ہو جائے یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ قدرت بھی نیک لوگوں کا ہی امتحان لیتی ہے اور ایسے وقت ان کی دعائیں بھی قبولیت کا شرف حاصل نہیں کرتیں۔ پتہ نہیں قدرت کو کیا منظور ہوتا ہے۔

"پرکاش جی آپ کی تینوں بچیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ یہ کسی بھی گھر میں خوشیاں بکھیر سکتی ہیں۔ مگر مجھے تو بس یہ پیاری سی بیٹی آشا دے دیں۔" شیام لال انکل نے آشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آشا کو آپ اپنی بہو کے روپ میں سویکار کر لیں یہ میرا سوبھاگیہ ہوگا۔"

سب کچھ آشا کے سامنے ہو رہا تھا۔ وہ کچھ بھی بول نہیں سکتی تھی۔ کوئی اعتراض بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ ایسا تو وہ اگر اس کے ممی پاپا زندہ ہوتے تب بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بس اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ یہ تو ہمارے سماج کی عام لڑکیوں کا ہمیشہ کا مسئلہ ہے۔

چاچا جی اور انکل کافی خوش لگ رہے تھے۔ چاچی جی کے چہرے پر اسے خوشی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سلیکھا موسی "سب بھاڑ میں جاؤ" جیسا منہ بنائے ہوئے تھیں۔

آخر آشا کو اس ناپسندیدہ صورت حال سے اس

وقت چھٹکارا ملا جب اسے اندر بھیج دیا گیا۔ اس کی سب سے اچھی پناہ گاہ اس کا کمرہ تھا جو اس کی خوشیوں، اداسیوں، بے چینیوں، محرومیوں کا گواہ تھا۔ وہ سیدھی اپنے بستر پر جا گری۔

آنسو جنہیں اس نے کافی کوشش سے اس نے اب تک روک رکھا تھا، آزادی پا کر تیزی سے بہہ نکلے۔

تکیے میں سر دیئے وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ آج پھر وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی اس کا اپنا نہیں تھا جسے وہ اپنا دکھ بتا پاتی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا جو اسے تسلی دیتا۔

"اے میرے اچھے بھگوان تو کہاں ہے۔" آج جتنی پریشان وہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کسی پل اسے چین نہیں مل رہا تھا۔

"تو کہاں چلا گیا روی...... کیا حال ہے تمہاری آشا کا...... کہاں رہ گئے تم...... کہاں ہے تمہاری ٹیلی پیتھی، کہاں گئے وہ نادیدہ سیوک؟"

شام ہوئی، پھر رات آ گئی۔ آشا کا رونا بند ہو چکا تھا۔ اسے انتظار تھا تو بس روی کا جو ایسے غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

آشا اپنی ڈیوٹی پر لگ چکی تھی۔ گھر والوں کو کیا پتہ کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ سب تو اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ اتنے اچھے گھر میں رشتہ ہو جانے پر چاچی جی اور موسی کی جلن تو عروج پر تھی۔

"موئی کرم جلی...... یہ ایسے گھر کے لائق تھی کیا؟" سلیکھا موسی نے چاچی جی کے آگے اپنے من کا پھپھولا پھوڑتے ہوئے کہا۔ "تو اس دن اس کی بڑی حمایت کر رہی تھی...... مجھے برا بھلا بولی...... دیکھ تیری بیٹیوں کے لائق رشتہ کیسے لے اڑی۔ ارے میں تو اب بھی کہتی ہوں...... جادوگرنی ہے...... پوری جادوگرنی۔"

"اب بس بھی کرو نا دیدی۔ میں ویسے ہی تناؤ میں ہوں۔ اس کے چلے جانے کے بعد ایک اچھے باورچی کی ضرورت پڑ جائے گی۔"

ادھر آشا روز کی طرح کھانا بنتا دیکھ رہی تھی۔ سیوک اپنا کام کر رہے تھے۔

"یہ سیوک تو سارے کام پلک جھپکتے کر سکتے ہیں۔ پھر شادی کی بات، یہ لوگ کیوں روک نہیں پائے؟" وہ بار بار یہ سوچ رہی تھی۔

وہ ان سیوکوں سے کبھی بات نہیں کرتی تھی۔ نا کبھی کچھ پوچھا تھا ان سے۔ وہ بھی کبھی بہت ضروری ہونے پر ہی اس سے کچھ بول لیتے تھے۔ اب بھی آشا کو یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔

روی کو نہیں آنا تھا۔ وہ نہیں آیا۔ اگلے دن صبح وہ اپنی ڈھیٹ سی ہنسی کے ساتھ آشا کے سامنے کھڑا تھا۔

"کتنا بے حس انسان لگتا ہے یہ۔" آشا کو اس وقت اس کی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔

"اب کیوں آ گئے یہاں۔ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ میری ارتھی تو نہیں نکلی ہے جو اس طرح خوش ہو رہے ہو۔" شاید اتنا غصہ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی پر اتارا تھا۔ وہ اس کے پاس سے نکل رہی تھی جب اس نے آشا کا بازو پکڑ لیا۔

آشا نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو چکا تھا۔ آشا کی یہی تو کمزوری تھی۔ روی کو اس طرح منہ لٹکائے وہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ اس کے سینے سے لپٹ گئی۔

"کہاں چلے گئے تھے تم...... روی...... میں کتنی اکیلی ہو گئی تھی...... کیا تمہیں اپنی آشا کی کوئی پروا نہیں؟" ایسی صورت حال میں تو ہچکیوں کے ساتھ آنسو آنا لازمی تھے۔

"مجھے پتہ تھا کہ تم مجھ سے اتنا ناراض ہو گی۔ مجھے تمہارے چاچا جی نے ایک ضروری کام سے شہر سے باہر بھیج دیا تھا۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں سب کیا ہوا ہے۔ میں پھر تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم مجھ پر اپنے پیار پر پورا بھروسہ رکھو۔ بس اتنا یاد رکھو کہ تمہیں یہاں سے وداع ہو کر میرے گھر جانا ہے اور کہیں نہیں۔" آشا کی پیٹھ اور سر کو اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر میرے سیوک؟ یہ تو کچھ کر سکتے تھے۔"

"نہیں...... یہ سچ مچ صرف سیوک ہیں۔ بنا حکم کے یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بابا سکندر نے انہیں یہاں میری اور تمہاری فرمانبرداری پر مقرر کر رکھا ہے۔ تم تو کبھی انہیں کوئی حکم دیتی نہیں۔ تمہارے لیے مجھے ہی ان کا روٹین بنا کر سمجھانا پڑتا ہے۔ کاش کل تم ایک بار بھی انہیں من میں ہی آواز دے دیتیں تو یہ تمہارے ایک اشارے پر پورے گھر کو منٹوں میں الٹ پلٹ کر کے رکھ دیتے۔"

آشا کے دل کا سارا غبار نکل چکا تھا۔ جس طرح برسات کے بعد سارا ماحول نکھر جاتا ہے ایسے ہی آشا بھی نکھر چکی تھی۔

گالوں پر آنسوؤں کی بوندیں اور لبوں پر دلکش مسکراہٹ۔ اس نے اپنی مسکراہٹ کو روی کے سینے میں منہ دے کر چھپانا چاہا تھا پر روی بھی تو اپنے ڈھنگ کا ایک ہی تھا۔ اس نے اچانک آشا کو کندھے سے پکڑ کر خود سے الگ کیا اور اس کی مسکراہٹ کا راز فاش ہو گیا۔

آشا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ یہ بہترین موقع تھا روی کے لیے۔ اگلے ہی پل اس کے ہونٹ آشا کے ہونٹوں سے جڑ چکے تھے۔

......☆☆☆......

پھر کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ کوئی انہونی بات نہیں ہوئی۔ ایک دن آشا کو پتہ چلا کہ کل اس کی منگنی ہو گی۔ چاچا جی چاہے من سے چاہے سماج کے ڈر سے اس کے لیے سب کچھ کرنے کو مجبور تھے۔

لڑکے والے پھر ایک بار آنے والے تھے، آشا کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے کے لیے۔ چاچی جی اور سلیکھا موسی تو ویسے ہی اس رشتے کو لے کر جلی بھنی بیٹھی تھیں۔ چاچا جی کے اعلان کے بعد تو لگا جیسے وہ آشا کا گلا ہی دبا دیں گی۔

"لو اب خریدو اس مہارانی کے لیے ہیروں کی انگوٹھی۔ یہ تو ہماری چھاتیوں پر مونگ دل کے ہی جائے گی۔" سلیکھا موسی کو تو موقع ملنا تھا جلتی پہ تیل چھڑکنے کا۔

"لینا ہی پڑے گی اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے ماں باپ کی وجہ سے ہی ہم سب اتنے دنوں سے عیش کر رہے ہیں۔ اسے پتہ چل جائے تو ہماری شان و شوکت دھری کی دھری رہ جائے۔ کہیں ہمیں اس کے گھر میں نوکری نہ کرنی پڑ جائے۔" چاچی جی ایک دم نڈھال سی آواز میں اپنی بہن کی باتوں کا جواب دے رہی تھیں۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن یہ سب بات تم کبھی زبان سے نکالنا بھی مت۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" موسی کتنے پتے کی بات کہہ رہی تھیں لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ جتنی دوری پر چاچی جی اور موسی کھڑی تھیں اس سے بھی ایک قدم دوری پر کوئی کھڑا ان کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

ادھر اپنا روی تو بس روی تھا۔ اپنے رنگ میں مست۔ اسے بے فکر دیکھ کر آشا بھی اپنی فکر بھول جاتی تھی۔ لیکن آج آشا نے روی کے چہرے پر فکر کی لکیریں دیکھی تھیں۔ وہ خود سے زیادہ اس کے لیے

فکر مند ہوگئی۔

آشا تو اپنے دشمنوں کے دکھ میں دکھی ہو جاتی تھی' یہ تو روی تھا جس میں آشا کی جان بستی تھی۔

''چھوڑو نا روی کیوں فکر کرتے ہو' بھگوان ہمیں کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونے دیں گے۔''

روی اسے کیا سمجھاتا وہ خود روی کو سمجھانے لگی۔

''صحیح کہتی ہو جان' مگر کاش تو نے شروع سے اپنے پیار پر بھروسہ کیا ہوتا' تب شاید بھگوان تمہارا اتنا کڑا امتحان نہ لیتے۔'' روی نے آشا کو چڑانے کے لیے شاید ایسا کہا تھا۔

مگر اس کی یہ بات سیدھی آشا کے دل پر جا لگی۔

''کب میں نے تم پر بھروسہ نہیں کیا؟ کب مجھے اپنے پیار پر وشواس نہیں تھا' بتاؤ؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''ارے بھگوان تو نیک لوگوں کا ہی امتحان لیتے ہیں۔ ساوتری کو اپنے پریم اور استری دھرم کا امتحان دینا پڑا تھا' سیتا جیسی پوتر ناری کو اگنی پرکشا دینی پڑی' تو میں کیا ہوں۔ تم دیکھنا میں اس کٹھن دور سے بھی نکل جاؤں گی۔'' آشا تو ایک دم جوش میں آ کر اپنی ناری شکتی کی خوبیاں بیان کرنے لگی تھی۔

''مجھے تم پر فخر ہے جان۔ پوری دنیا میں تلاش کرنے پر بھی مجھے تم سا جیون ساتھی نہیں مل سکتا۔ مگر پتہ نہیں کیوں تمہارے ہونٹوں کا سواد میٹھا کیوں نہیں ہے' ذرا پھر سے چکھاتا تو۔'' روی برا سا منہ بنا کر بولا۔

آشا کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ اس نے روی کی پیٹھ پر چار پانچ مکے جڑ دیئے۔

''شیطان کہیں کے' جاؤ اب کبھی تمہیں ان کا سواد چکھنے کو نہیں ملے گا۔'' آشا اس کا منہ چڑاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

روی کے پاس سے ہٹتے ہی پھر سوچوں نے اسے گھیر لیا۔ میں کسی دوسرے کے ہاتھ سے کیسے انگوٹھی پہنوں گی۔ پھر میں اسے کیسے انگوٹھی پہناؤں گی۔

سوچوں کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے دن گزر گئے اور آ گیا منگنی کا دن۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ اس منگنی سے نہ آشا خوش تھی اور نہ ہی اس کے دشمن خوش تھے۔

چاچی جی اور موسی کی تو اب بھی خواہش یہی تھی کہ آشا کا رشتہ کاٹ کر سیما یا نکیتا سے جوڑ دیں۔

کبھی آشا کو ہنسی بھی آتی اور کبھی یہ بات دیکھ کر جھنجلاہٹ بھی ہوتی۔ ''کتنے انجان ہیں یہ لوگ۔ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں بہت قسمت والی ہوں۔ پتہ نہیں میں کتنی خوش قسمت ہوں۔''

کبھی سوچتی کہ روی کی مدد سے بابا سکندر کے پاس پہنچ جائے اور ان سے مدد کی فریاد کرے۔ لیکن پچھلی ملاقات کے وقت ان کی کہی بات یاد کر کے ٹھنڈی ہو جاتی۔ انہوں نے کہا تھا کہ روی اور آشا کی شادی' آشا کے چاچا جی کی مرضی سے ہی ہو سکتی ہے۔ ان پر کوئی زبردستی نہ کی جائے۔

کبھی وہ سوچتی کہ چاچا جی کو صاف صاف کہہ دے کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ سیما یا نکیتا کی کر دیں۔ مگر بچپن سے اس گھر میں رہتے ہوئے بھی اس نے اپنی طرف سے تو آج تک کچھ نہیں کہا تھا۔ اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جاتا تو کم الفاظ میں جواب دے دیتی تھی۔ یہ تو اس کی شادی کا معاملہ تھا۔ وہ اس بارے میں بولنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ رہ گیا روی۔ تو اس کی حیثیت اس گھر میں نوکروں والی تھی۔ اس کام کے لیے اس کی مدد بھی نہیں لے سکتی تھی۔

چاہے منہ لٹکا کے ہی سہی مگر پارٹی کی تیاریاں زور شور سے چل رہی تھیں۔ چاچا جی نے سادا سا فنکشن منعقد کیا تھا جس میں گنے چنے لوگوں کو ہی بلایا

گیا تھا۔

آشا کے لیے اس گھر میں پہلی بار اچھا سا لباس لایا گیا تھا۔ سیما اور نکیتا مل کر اسے تیار کر رہی تھیں۔ دنوں بہنیں اپنے بیوٹیشن ہونے کا ہنر پوری طرح سے آشا پر آزما رہی تھیں۔ چہرے کے میک اپ سے آشا کو کافی الجھن ہو رہی تھی۔ سیما نے اپنی جیولری بھی آشا کو پہنا دی تھی۔ یہ ان کے گھر کی شان کے لیے ضروری تھا۔

طے شدہ وقت پر لڑکے والے اپنی قیمتی چمچماتی کار میں پہنچ گئے۔ آج بھی وہ لوگ صرف تین ہی افراد تھے۔ وہی انکل، آنٹی اور وہ کھویا کھویا سا لڑکا۔ تینوں کے تینوں اپنے لباس اور خوبصورتی سے ہی بہت اونچے لوگ لگ رہے تھے۔

گھر کے نوکر مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے ہوئے تھے۔ روی کے ذمے بھی کچھ خاص ذمہ داریاں تھیں۔ وہ بھی شاید اپنے سب سے اچھے لباس میں تھا۔

آشا جانتی تھی کہ وہ چاہے تو ابھی اس کے پاس دنیا کا سب سے قیمتی لباس آ جائے۔

آشا کو تیار کر کے مہمانوں والے کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ وہ آتے جاتے روی کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن لاکھ کوشش کے باوجود بھی آج اس کے چہرے کو پڑھ نہیں پا رہی تھی۔

یہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں کبھی کسی کے چہرے پر خوشی کی جھلک کی امید رہتی ہے اور جب ہم اس کے چہرے پر خوشی تلاش نہیں کر پاتے تو الجھ جاتے ہیں اور اس چہرے پر کچھ پڑھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

یہی صورت حال اس وقت بھی ہوتی ہے جب ہم کسی کے چہرے پر دکھ اور اداسی کی توقع رکھتے ہیں۔

صبح سے گھر والوں نے اسے ایسے گھیر کر رکھا تھا کہ روی سے کوئی بات نہیں کر پائی تھی۔ اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ آج روی کا کیا منصوبہ ہے۔

"کیا یہ روی اتنا مجبور ہے کہ اپنی محبوبہ کی منگنی ہوتے دیکھتا رہے گا۔ یا وہ ان مہمانوں کو بھی ڈرا کر بھگا دے گا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

مہمانوں کے چہروں پر خوشیاں ہی خوشیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ ہنس ہنس کر سب سے باتیں کر رہے تھے۔ اب تو ان کا ہینڈسم سا لڑکا بھی سیما اور نکیتا سے خوب باتیں کر رہا تھا۔

وہیں دوسری طرف میزبانوں کے منہ لٹکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ آشا فکر مند ضرور تھی مگر یہ سب تماشہ دیکھ کر کبھی کبھی اسے ہنسی بھی آ رہی تھی لیکن بظاہر وہ ایک دم شریف بچی کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

اس کا دھیان سب سے زیادہ روی پر تھا، جو گھر کے فرد کی طرح بڑھ چڑھ کر مہمانوں کی خاطر داری میں جتا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس منگنی سے بہت خوش ہو۔

چاچا جی کے کچھ دوست اور رشتے دار بھی وہاں موجود تھے۔ ان میں کوئی آشا کے کچھ لگتے تھے لیکن وہ کسی کو نہیں جانتی تھی اور نہ ہی کسی نے اس سے ملنے یا باتیں کرنے کی کوشش کی تھی۔

ناشتے وغیرہ سے سب لوگ فارغ ہو چکے تھے اور اب اصل کام ہونا باقی تھا۔ ہال کے بیچوں بیچ آشا اور اس لڑکے کو کھڑا کر دیا گیا۔ ایک خوبصورت میز ان کے سامنے رکھی گئی۔ میز کے دوسری طرف سارے مہمان جمع ہو گئے۔

آشا کے قریب سیما، نکیتا اور چاچی جی تھیں۔ ادھر آنٹی جی اپنے "لڑکے" کے ساتھ تھیں۔ چاچا جی

اہل ایک طرف ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔

آشا کو اس وقت روی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کی حیثیت اس گھر میں نوکر کی تھی۔ وہ مہمانوں کے بیچ کیوں رہتا۔

آشا کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اب اسے پھانسی پر لٹکایا جانے والا ہو۔ آنٹی جی نے ایک بہت ہی سندر جھلملاتی ہوئی انگوٹھی لڑکے کو دی اور وہ اسے لے کر آشا کی طرف مڑا۔

وہ آشا کو پہنانے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ پتہ نہیں کیسے وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گری پھر وہاں سے اچھل کر زمین پر گر رہی تھی...... آشا کا ہی نہیں سب مہمانوں کا دھیان ادھر ہی چلا گیا تھا۔

جنوں، بھوتوں کا دوست روی، کسی بھوت کی طرح ہی زمین پر گرنے سے پہلے اس انگوٹھی کو کیچ کر چکا تھا۔ پھر ہوا کی طرح وہ آگے بڑھا۔

"کیا صاحب...... ایک چھوٹی سی انگوٹھی آپ سے نہیں سنبھل رہی...... لیجیے چھوٹی مالکن اپنی منگنی کی انگوٹھی۔" یہ کہتے ہوئے وہ انگوٹھی آشا کے ہاتھ میں دینے کی بجائے اس کی انگلی میں پہنا چکا تھا۔ آشا کے سر سے پیر تک ایک سکون کی لہر دوڑ گئی۔ یہ سب بس ایک لمحے میں ہو گیا تھا۔

"ہے...... کون ہو تم مسٹر؟" اس لڑکے نے دانت پیستے ہوئے روی سے پوچھا۔

"روی۔" اپنی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے اس نے اپنا نام بتایا۔ اس کے جواب پر وہ لڑکا اور بھی بھڑک گیا۔

"تم جہاں پر ختم ہوتے ہو وہاں سے میں شروع ہوتا ہوں۔ میرا نام وشال ہے...... سمجھے۔"

"سمجھ گیا حضور، ایک میرا نالائق دوست ہے اس کا بھی ایسا ہی نام ہے۔ وہ اکثر مجھ سے یہی کہتا ہے جو آپ نے کہا۔"

"لیجیے...... ناراض مت ہوئیے، آپ بھی پہن لیجیے، میں تو آپ کا سیوک ہوں۔" اس وقت روی کی پھرتی دیکھنے لائق تھی۔ پلک جھپکتے ہی آشا کے ہاتھ سے دوسری انگوٹھی لے کر وہ وشال کی انگلی میں ڈال چکا تھا۔

سبھی لوگ روی کی باتوں اور حرکتوں پر مسکرائے بنا نہیں رہ سکے۔ ماحول کا تناؤ ختم ہوتا دیکھ کر انکل آگے بڑھ کر بولے۔ "وشال بیٹے، کوئی بات نہیں، منگنی کی رسم پوری ہو گئی۔ تمہارا اور آشا بیٹی دونوں کا کام روی نے کر دیا۔ کیوں ناراض ہوتے ہو۔ یہ بھی تو میرے بیٹے جیسا ہے۔"

انکل کی باتوں سے محفل کا تناؤ اور کم ہو گیا۔ مہمانوں میں کچھ تو ہنس رہے تھے اور کچھ ہکا بکا تھے۔ پھر سبھی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ آشا کا ہاتھ پکڑ کر آنٹی اپنے صوفے کی طرف لے گئیں اور اسے اپنے ساتھ بٹھایا۔

"تم کوئی فکر مت کرنا بیٹی، مجھے اپنی ماں سمجھو، یہ لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔" انہوں نے شاید انگوٹھی والی بات کی وجہ سے اسے سمجھایا۔ مگر آشا کو اب کسی بات کی فکر نہیں تھی۔

جسے انگوٹھی پہنانی چاہیے تھی وہ پہنا چکا تھا۔ اب تو آشا کا چہرہ بھی مہمانوں کے چہروں کی طرح خوشیوں بھرا دکھائی دے رہا تھا۔

مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گئی۔ دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر گھسی اس کی نظر نیلی آنکھوں والے شرارتی جادوگر روی پر پڑی۔

"منگنی کی انگوٹھی مبارک ہو۔" مسکراہٹ کے

ساتھ ہی پرانا چڑانے والا انداز تھا۔

"منگنی میری ہوئی ہے، تمہیں کیوں جلن ہو رہی ہے۔" آشا نے چڑ کر جواب دیا۔

"میں؟ میں کیوں جلوں۔ لیکن افسوس کہ ان بڑے بڑے مہمانوں کی انگوٹھی تو میرے پاس ہی رہ گئی اور میری جیب میں پڑی ہوئی ہے جبکہ میری انگوٹھی تمہاری انگلی میں پہنچ گئی۔ ہاہاہاہا۔"

"ارے سچ؟ دیکھوں تو کہاں ہے وہ انگوٹھی۔" اپنا غصہ بھول کر آشا روی کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"کیا کرو گی تم...... اب اسے پہنو گی کیا؟" روی اپنی بناوٹی پریشانی ظاہر کرتا ہوا بولا۔

"ارے نہیں...... میری انگلی میں جو انگوٹھی ہے وہ میری اپنی ہے۔ تمہارے علاوہ کس کی مجال ہے جو مجھے انگوٹھی پہنا سکے۔" آشا نے سینہ پھلا کر اپنی آستین چڑھا کر کہا۔ اس کا پھولن دیوی اسٹائل دیکھ کر روی ہنس پڑا۔

"ویسے تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ میں تو پریشان ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوگا۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں چھوڑ چکی تھی۔"

"سب کچھ نہیں۔ سب کچھ میرے ہاتھ میں چھوڑ دیتیں تب تم کیوں پریشان ہوتیں؟ بتاؤ۔" روی نے آشا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یہ بات تو ہے...... پیار کبھی انسان کو صحیح بھی بنا دیتا ہے اور کبھی لاکھوں فکرات میں ڈبو بھی دیتا ہے۔"

"مگر آشا مجھے اچھا نہیں لگتا جب تم میرے اوپر بھروسے کو توڑ کر خود فکر کرنے بیٹھ جاتی ہو۔ ایک دم بوڑھیوں کی طرح۔"

"سوری روی۔ یہ تو انسانی فطرت ہے۔" آشا کے انداز میں اتنا پیار تھا کہ روی کا تو بس کام ہی تمام ہو گیا۔

وہ تو بس پلک جھپکائے بنا اس کو نہارے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ جب کچھ دیر روی ایک ٹک اسے دیکھتا گیا تب جھینپ کر آشا نے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"لو یہ رہی وہ انگوٹھی جو تمہیں پہنانے کے لیے وہ لوگ لے کر آئے تھے۔" روی نے اپنی جیب سے ایک انگوٹھی نکال کر آشا کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"ارے یہ تو ہو بہو ویسی ہی ہے۔ کیسے کر لیا تم نے یہ سب؟" آشا حیران تھی انگوٹھی کو دیکھ کر۔ وہی ہیرے جڑی ہوئی جھلملاتی ہوئی۔ دونوں انگوٹھیوں میں رتی برابر فرق نہیں تھا۔

"تمہارے سیوکوں کا کمال ہے۔ منگنی کی رسم ہونے سے پہلے ہی انہوں نے انگوٹھی پار کر لی اور کچھ ہی دیر میں ویسی ہی انگوٹھی لے کر مجھے تھما دی۔ ان کی انگوٹھی بھی ان کے پاس پہنچ گئی ہے۔" روی نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

"میرے سیوک...... یہ...... شاید میں انہیں کبھی سمجھ نہیں پاؤں گی۔" آشا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تم انہیں خود سے دور رکھتی ہو یہی وجہ ہے کہ تم انہیں سمجھ نہیں پا رہی ہو۔ وہ تمہارے سیوک ہیں اور ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گے۔ تم جب دل کرے کوئی بھی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام ان سے لے سکتی ہو۔ ویسے تو پوری طرح میں خود انہیں نہیں جان پایا ہوں جبکہ بچپن سے ہی میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔"

"ہاں انگوٹھی تمہارے پاس آ گئی۔ پھر کیا ہوا۔" آشا کو پوری بات جان لینے کی جلدی تھی۔

"بہت سمپل۔ وشال کے ہاتھ سے انگوٹھی گرا دینا جنوں کے لیے مشکل کام نہیں تھا۔ پھر کیا مجال کہ وہ

انگوٹھی میرے ہاتھ میں آنے سے پہلے زمین پر گر جاتی۔ میں چاہتا تو خود وشال اپنے ہاتھ سے انگوٹھی مجھے دے دیتا اور خود تمہیں پہنانے کے لیے کہتا۔ لیکن ہمیں ایسا کچھ نہیں کرنا کہ جس سے لوگ شک میں پڑ جائیں یا ان میں ڈر پیدا ہو جائے۔"

اچانک آشا کو کچھ یاد آیا اور وہ ہنسنے لگی۔ اسے ہنستا دیکھ کر روی اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پوچھنے پر بولی۔ "منگنی میں جیسے تم نے چھین جھپٹ کر اپنی انگوٹھی پہنا دی، شادی میں بھی ویسا ہی ارادہ ہے کیا۔ دھکا دے کر اسے ہٹا دینا اور خود بیٹھ جانا۔" آشا کا بھی ہر انداز نرالا تھا۔ اس وقت وہ کھل کر ہنسی تھی۔ ایسی ہنسی تو شاید بہت پہلے بچپن میں ہنسا کرتی تھی۔ گورا سفید چہرہ گلابی رنگ لے لیتا تھا۔ ناک اور گال کا کچھ حصہ تو پوری طرح لال ہو جاتا تھا۔ ایسی سنگ مرمر کی زندہ مورت کو دیکھ کر روی اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔

لیکن جتنی قریب وہ اس وقت ہے۔ کیا اسے حاصل کرنا اتنا آسان ہے؟ اسے اپنا بنانے کے لیے پتہ نہیں اسے کیا کیا کرنا پڑے گا۔ مست مست سا روی کبھی فکروں میں گھرا نہیں تھا۔ لیکن آشا کو اپنا بنا لینے تک تو اسے اب سوچنا ہی تھا۔

آشا کے روزانہ کے معمولات پہلے کی طرح ہی چل رہے تھے۔ وہی صبح سب کو ناشتہ دینا۔ دوپہر کا لنچ، پانچ بجے شام کو چائے اور ہلکا ناشتہ پھر رات کو بھی کو کھانا دینا۔

فرق صرف یہ تھا کہ پہلے اسے ان سب چیزوں کو کچن میں خود تیار کرنا پڑتا تھا لیکن اب صرف ٹرالی دھکیل کر کھانے کے کمرے تک لے جانی ہوتی تھی۔

وہ چاہتی تو اس کے سیوک اسے انگلی ہلانے بھی نہ دیتے۔ وہ چاہتی تو اس کے لیے نوکروں کی فوج جمع ہو سکتی تھی۔ مگر وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سادا طریقے سے روی کو پا لینا چاہتی تھی اور اب یہی اس کے جینے کا مقصد تھا۔

روی کی موجودگی میں وہ بے فکر ہو جاتی تھی۔ لیکن تنہائی میں فکریں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔

عام لڑکی کے لیے اتنے اونچے گھر میں رشتہ طے ہو جانا لڑکی کے لیے فخر اور خوشی کی بات ہوتی ہے، مگر وہ کیسے خوش ہو سکتی تھی۔

وہ تو اپنے مندر میں روی کی مورت کو اپنا بھگوان بنا کر بسا چکی تھی۔ اسے اپنے بھگوان پر اٹوٹ اعتماد تھا۔ وہ فکر مند صرف اس لیے تھی کہ جسے بھگوان بنا کر من میں بسا چکی تھی اس بھگوان کو دنیا کے سامنے ابھی تک اپنا بھگوان نہیں کہہ سکتی تھی۔

اسے وشواس تھا کہ روی آگے بھی سب کچھ سنبھال لے گا۔ مگر روی کو اسے پریشان دیکھنے میں زیادہ مزا آتا تھا۔ وہ کبھی آگے کی پلاننگ آشا کو نہیں بتاتا تھا۔

آشا اس بات کو سمجھتی تھی۔ مگر اس بات کو لے کر اس کے دل میں روی کے لیے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دنیا میں روی کا اپنا کوئی نہیں ہے۔ وہ اسی کو چڑا کر اور غصہ دلا کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ پر جب آشا زیادہ دکھی ہو جاتی، یا ایسا دکھاوا کرتی تو وہ ہزاروں طریقوں سے اسے منانے کی کوشش کرتا تھا۔ پھر جب آشا مان جاتی اور ہنس دیتی تو بچوں کی طرح خوش ہوتا تھا۔

ایسے میں آشا کو اس پر ٹوٹ کر پیار آتا۔ لیکن آشا بھی آشا تھی۔ اپنی بیقراری اور تڑپ کو وہ اس پاگل پریمی سے چھپا کر رکھتی تھی۔ ورنہ وہ تو بس شروع ہی ہو جاتا۔

پراسرار سیوکوں کے ذریعے اسے پتہ چل چکا تھا کہ جس دولت کے بل پر اب تک اس کے چاچا۔

چاچی عیش کررہے تھے وہ اس کے پیارے پاپا کی محنت کی کمائی تھی اور یہ لوگ اتنے بے حس تھے کہ جس کے دھن پر عیش کر رہے تھے اسی کو اپنا نوکر بنا کر رکھا ہوا تھا۔

پاپا ممی کی زندگی میں وہ شہر کے سب سے اچھے اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ لیکن ان کی موت کے بعد جب دادی جی اسے یہاں لے آئیں تب وہ اپنے ممی پاپا کے لیے بہت روئی تھی۔ ایسے میں دادی جی نے اپنے سورگباشی بیٹے کی اکلوتی اولاد کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ انہوں نے تو اس کی محبت میں اسے اسکول نہیں بھیجا تھا۔ اور دادی جی کے بعد کسی کو کیا ضرورت تھی کہ اسے اسکول بھیجے۔

آشا کی رگوں میں اس کے ماں باپ کی شرافت بسی ہوئی تھی۔ آج وہ اپنی شکتی کو سمجھتی تھی۔ وہ چاہتی تو اپنے اوپر کی گئی سبھی زیادتیوں کا بدلہ لے سکتی تھی۔ مگر وہ صبر کر رہی تھی۔ آج بھی سب اس پر اسی طرح حکم چلاتے تھے۔ وہ خوشی خوشی ان کے احکام کو پورا کرتی رہتی تھی۔ اگر آشا چاہتی تو اپنی دولت واپس حاصل کر سکتی تھی مگر اسے دھن دولت کا لالچ بالکل نہیں تھا۔

پھر وہ جنوں کی دنیا میں سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی حیثیت دیکھ چکی تھی۔ وہاں اس نے گھروں کی دیواریں سونے کی، کھڑکیوں میں ہیرے اور طرح طرح کے انمول رتن جڑے ہوئے دیکھے تھے۔

آشا کو تو یہ سب بیکار کی چیزیں لگتی تھیں۔ اس کی دولت تو صرف روی اور اس کا پیار تھا۔

......☆☆☆......

"یار روی، میں بہت پریشانی میں ہوں۔ کچھ مدد کر دے میرے یار۔" اچھا خاصہ وکرال جب سوکھا سا منہ بنا کر روی سے بولا تو روی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"دس بیس روپے سے تیرا کام چل جائے گا تو ٹھیک ہے۔ میں ڈرائیور کی نوکری کرتا ہوں، میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں۔"

"کیا؟ یہ تُو پیسوں کی بات کیوں کر رہا ہے۔ تُو جانتا ہے جنوں کو پیسوں سے کوئی کام نہیں۔"

"تُو اتنا سوکھا سا منہ بنا کر مجھ سے مدد مانگ رہا تھا، آدمیوں میں ایسے منہ بنا کر پیسے ادھار لیتے ہیں۔"

"تم کو کیسے پتہ؟ تجھ سے کسی نے مانگا ہے کیا؟" وکرال اپنی پریشانی بھول کر روی کی باتوں میں الجھ گیا۔

"ہاں یار...... یہاں کے سب نوکر کئی کئی بار مجھے اسی طرح منہ بنا کر ٹھگ چکے ہیں۔"

"کتنے پیسے دیئے تُو نے انہیں؟" وکرال کو کسی سیٹھ کے منشی کی طرح حساب پوچھتے ہوئے دیکھ کر روی پھر ہنس پڑا۔ اسے کبھی حساب رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

"پتہ نہیں، میں نے جوڑا نہیں حساب...... پر بہت سارے لیے ہیں۔"

"تجھے یہاں جتنی تنخواہ ملتی ہے اس سے کم یا زیادہ۔" روی پر تو حیرتوں کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ وکرال اسے کسی فکرمند ماں کی طرح پوچھ تاچھ کر رہا تھا جس کے بچے نے پیسے غلط خرچ کر دیئے ہوں۔

"اس سے کئی گنا زیادہ۔"

"بس مجھے یہی پتہ کرنا تھا۔ اب بتا کوئی پوچھے کہ تُو اتنے پیسے لایا کہاں سے تو کیا جواب دے گا؟ تیرا تو بھید کھل جائے گا...... یا تو سب سمجھیں گے کہ تو کہیں چوری کرتا ہے۔"

وکرال کی باتیں سن کر روی سمجھداروں کی طرح سر ہلا رہا تھا۔

"اوہ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا...... بتا اب کیا کروں۔"

"تُو بھی کہیں سے ادھار لے لے۔" وکرال شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا...... پیسے؟"

"نہیں...... دماغ۔"

"اچھا...... تو میرے پاس دماغ نہیں ہے، پھر تُو جا اپنا کام دیکھ...... مجھ سے بات مت کر......" روی بناوٹی ناراضگی دکھا رہا تھا۔

"ارے میرے مٹی کے شیر...... تُو تو ناراض ہوگیا۔ تیرے پاس تو بہت دماغ ہے۔ تبھی تو میں اپنے ہر کام کے لیے تجھ سے مشورہ کرتا ہوں...... ارے...... یاد آیا...... تُو نے مجھے کن باتوں میں الجھا دیا۔ میں تو خود اپنی پریشانی لے کر آیا تھا۔"

وکرال کو اپنی بات پھر یاد آ گئی تھی اور ایک بار پھر وہ فکرمند دکھائی دینے لگا تھا۔

"ہاں...... بول کیا ہے تیرا مسئلہ...... میرے ہوتے ہوئے تُو کیوں اپنی شکل پہ بارہ بجا رہا ہے۔" روی اپنا کالر جھاڑتا ہوا بولا۔

"بھائی مجھے شرم آ رہی ہے اور پھر ڈرتا بھی ہوں کہ تُو برا نا مان جائے۔" وکرال نے رونی صورت بنا تے ہوئے کہا۔

روی کو اس کی ایکٹنگ دیکھ کر پھر ہنسی آ گئی۔ جو جن سیکنڈ سے کم وقت میں دنیا کی کوئی بھی چیز حاصل کر سکتا تھا، پلک جھپکتے کہیں بھی پہنچ سکتا تھا وہ اس وقت کیسے منہ لٹکا کر بول رہا تھا۔

"تُو ابھی کے ابھی بتا سب کچھ ورنہ میں سچ مچ برا مان جاؤں گا۔" اس نے روی کو دھمکایا۔

"اچھا دھمکاؤ مت۔ میں کہہ رہا ہوں کہ دیکھ بھائی تُو نے تو اپنے لیے پریوں کی رانی آشا بھابھی کو پٹالیا ہے اب میں کیا کروں...... یار تُو میری مدد کرنا۔"

ابھی بھی واضح بات نہ کرنے پر روی نے وکرال کی پیٹھ پر زور سے ایک گھونسا دے مارا۔ "صاف صاف بتا تو کیا چاہتا ہے؟"

"مارو مت بتاتا ہوں...... مم...... مجھے تمہاری سالیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

"دھت تیرے کی...... کھودا پہاڑ نکلی چوہیا...... ارے میری سالیاں اچھی ہیں تو اچھی لگیں گی نا۔"

"میں جانتا تھا کہ تُو میرا سچا دوست نہیں ہے، میرا مذاق اڑا رہا ہے، ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔"

"ارے جاتا کہاں ہے...... رک تو سہی۔" روی نے اسے پھر پکڑ کر بٹھا لیا۔

دونوں کی پرورش بابا سکندر جیسے نیک جن کی دیکھ ریکھ میں ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وکرال روی سے مدد چاہ رہا تھا۔

وکرال نے کبھی انسانوں کو تکلیف نہیں دی تھی۔ بھلے ہی ہنسی مذاق میں کبھی آدمیوں سے ہلکی چھیڑ چھاڑ کر لیتا ہو۔ جیسے کوئی موٹا سیٹھ سڑک پر جا رہا ہے اور اس کی ٹوپی ہوا میں اڑ گئی، پھر وہ جیسے ہی ٹوپی پکڑنے لپکا، ٹوپی آگے بڑھ گئی۔ وہ دوڑ کر کسی طرح اپنی ٹوپی کو پہن لیتا اور پہن کر ہانپتا ہوا چلا جاتا۔ وہ سیٹھ یہ سوچتا بھی نہیں کہ آخر اس کی ٹوپی کیوں اس کے آگے آگے اڑ رہی ہے۔

ایسی شرارتیں وہ بچپن سے ہی کرتا آیا تھا۔ ہر جگہ روی کو بھی عام آدمی کی نظروں سے پوشیدہ کر کے ساتھ رکھتا تھا۔ جبکہ کتنے ہی ایسے بدمعاش جن ہوتے ہیں جو انسانوں کو طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ خاص طور پر جوان اور خوبصورت لڑکیاں ایسے شرارتی جنوں کا شکار بنتی ہیں۔

"اچھا بتا میری سالیوں میں سے کون سی تجھے

"زیادہ پسند ہے؟"

"دونوں...... ہی ہی ہی...... کیا رنگ ہے اور کیا بناوٹ ہے یار...... ایک دم شملہ کے سفید سفید پہاڑ ہیں۔ ہی ہی ہی۔"

وکرال نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ایسی آہ بھری کہ روی تو ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔

"پٹو گے تم...... جوتیاں کھاؤ گے جوتیاں' اگر تم نے ان دونوں کے سامنے ان کی ایسی تعریف کی۔"

"پھر کیسے کروں...... تُو ہی بتا دے نا بھائی۔" وکرال معصومیت سے بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ سلیکھا موسی کیسی لگتی ہے تجھے؟" روی نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ...... وہ تو ایک دم پٹاخہ ہے پٹاخہ...... لیکن تُو شرم کر۔ اپنی ساس کے بارے میں ایسے پوچھتا ہے۔ موسی کو تو میں نے اپنے استاد الوکھ کے لیے پسند کر رکھا ہے۔"

"استاد الوکھ؟ وہ تو میرے بھی استاد ہیں۔" روی ہنستا ہوا بولا۔

بس ایک بار استاد الوکھ کو موسی کا درشن کرا دینا ہے' بس موسی کا بیڑا پار۔"

دونوں اس وقت چاچا جی کے ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ کر ایسے زور زور سے باتیں کر رہے تھے جیسے اپنے گھر میں ہوں۔

تبھی سیما اور نکیتا اندرونی دروازے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ سجی دھجی' فٹنگ ڈریس' دونوں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔

"ارے او شملہ کی پہاڑیاں...... ہم ادھر ہیں۔"

وکرال چیخ کر بولا اور روی زور سے ہنس پڑا۔

"یہ روی بھی نا...... نہ جانے کدھر ہے...... کتنی دیر ہو رہی ہے ہمیں۔" نکیتا یہ کہتی ہوئی سیما کے ساتھ باہر نکل گئی۔

"ہائے چلی گئیں۔"

"تم یہاں بیٹھ کر آہیں بھرتے رہو میں تو چلا۔ شاید ان دونوں کو کہیں جانا ہے۔" روی یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد روی سڑک پر کار دوڑا رہا تھا۔ سیما اور نکیتا پیچھے بیٹھی تھیں۔

تبھی روی نے دیکھا کہ وکرال آگے کی کھڑکی سے اندر گھسا اور دونوں بہنوں کی طرف منہ کر کے آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ایک ٹھنڈی سانس لے کر روی ونڈ اسکرین کے پار سڑک کو دیکھنے لگا۔

......☆☆☆......

روی جیسا ہشاش بشاش رہنے والا انسان آج کل سوچوں میں گھرا رہنے لگا تھا۔ آشا کے سامنے چہرے پر "نوٹینشن" کا سائن بورڈ ٹانگے رہنے والا اکیلے میں صرف سوچتا رہتا تھا۔

آشا کو حاصل کر لینا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا مگر ایسا شارٹ کٹ طریقہ اسے پسند نہیں تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ بالکل جائز انداز سے آشا کو اپنا لے۔ چاچا جی' چاچی جی سب کی رضامندی سے شادی ہو۔ یہی بابا سکندر کی بھی خواہش تھی۔

اس کے سامنے دو کام تھے آشا کی منگنی توڑنا اور خود کو اس کے لیے گھر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔

فی الحال وہ منگنی والے کام پر غور کر رہا تھا کہ کیسے یہ منگنی ٹوٹے۔ اسے کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اس لڑکے وشال کے پاس جا کر اپنی دکھ بھری کہانی سنائے اور وشال فوراً اس کی ہمدردی میں منگنی توڑنے کا اعلان کر دے۔

منگنی کے دن تو اس سے سیدھا ٹکراؤ ہوتے

ہوتے بچا تھا۔ ہونہہ جہاں میں ختم ہوتا ہوں وہاں سے وہ شروع ہوتا ہے۔ یہی کہا تھا وشال نے۔ منگنی کے دن کا ایک ایک منظر اسے یاد آ رہا تھا۔

تبھی اس کے ذہن میں روشنی کی کرن پھوٹی۔

"وہ ایسا کیوں ہے؟" پہلے دن سے وشال کے تیور اسے یاد آ رہے تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ تمام وقت وہ آشا کو نظر انداز کرتا رہا تھا۔ "کیا وجہ ہے۔ کیا یہ بات میری مدد کر سکتی ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ اس کام میں سیوک اس کی مدد کر سکتے تھے۔

اس نے چوبیس گھنٹے وشال کی نگرانی کے لیے دو سیوکوں کو لگا دیا۔ جنوں کے لیے جاسوسی جیسا کام بالکل آسان تھا۔

دو دن بعد اسے من چاہی رپورٹ مل گئی۔ وشال ایک عیاش نوجوان تھا۔ ہر طرح کی بری عادتیں اس میں تھیں۔ اس کا والد دوسرے شہر میں اپنا بزنس چلاتے تھے۔ کئی فیکٹریز کے مالک تھے۔ وشال کی عیاشیوں کے باعث انہیں لگاتار نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ ان کی کئی فیکٹریز بند ہو چکی تھیں۔

آخر وہ اس شہر سے اپنا بچا کھچا بزنس سمیٹ کر اس شہر آ گئے۔

وہ ایک ماہر بزنس مین تھے۔ انہوں نے اس شہر کے بھی دولت مند لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ تبھی انہیں یہ چونکا دینے والی جانکاری ملی کہ آشا کے چاچا جی جس کاروبار کو چلا رہے تھے وہ آشا کے والد کا تھا۔ ان کی وصیت کے مطابق پوری دولت آج بھی آشا کے نام پر تھی۔

یہیں سے ان کا دماغ کاروباری انداز سے کام کرنے لگا۔ ان کے مطابق آشا کو اپنی بہو بنا لینے پر اس کی ساری دولت پر ان کا قبضہ ہو جاتا۔

اس کے لیے انہوں نے اپنے بگڑے ہوئے بیٹے کو اعتماد میں لیا جبکہ وہ شادی کے لیے بالکل راضی نہیں تھا۔

اپنے بیٹے کو سمجھا دیا کہ آشا سے شادی کے بعد وہ اس کی ساری دولت اپنے نام کر لے گا۔ اس کے بعد وہ جہاں دل چاہے شادی کر سکتا ہے۔

"ہممممم...... تو یہ تھا ان کی شرافت کا دکھاوا۔" روی کو یہ سب جان کر بہت غصہ آ رہا تھا۔

"کیا سمجھ کر انہوں نے آشا کے بارے میں ایسا سوچا۔ اس کی سزا انہیں ضرور دوں گا۔" وہ مٹھیاں بھینچے دل ہی دل میں ایک ٹھوس ارادہ کر رہا تھا۔

"اب تو یہ منگنی ختم۔" وہ خوش ہو گیا۔ بس ایک ہلکی سی چنگاری ڈالنے کی ضرورت تھی۔

روی نے یہ ساری باتیں آشا کو بتا دیں۔ اس کے تو ہوش اڑ گئے۔

"ہے بھگوان...... کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں۔ کیسے کیسے بھیس بدلتے ہیں لوگ۔ میں انہیں اتنا اچھا سمجھ رہی تھی۔"

"اچھوں کو سب اچھے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ تم نے دنیا دیکھی کہاں ہے؟ دنیا تو میں بہت گھوم چکا ہوں مگر دنیا کے لوگوں کو میں بھی نہیں سمجھ پایا ہوں' تو تم کیا سمجھو گی۔"

"روی ہم چاچا جی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیں گے۔ ہمیں نہیں چاہیے وہ دولت۔" آشا نے اپنے من کی بات روی پر ظاہر کر دی۔ آشا اتنی معصومیت سے بولی کہ روی اس کا منہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک دم نچھل نرمل آشا۔ وہ من ہی من میں خوشیوں سے بھر گیا۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے ہماری شادی ہو چکی ہے۔ بالکل بیویوں والا رویہ ہے تمہارا۔" آشا تو شرم سے لال ہو گئی۔ گھنی پلکیں جھک گئیں۔ پھر وہ اپنی

نظریں ادھر ادھر کرتی ہوئی بولی۔
"میں کچن میں جا رہی ہوں۔ اپنا کام کرنے۔"
"کوئی کچن وچن نہیں جا رہا۔" آشا کو تو یہ پتہ ہی تھا کہ جب روی اس کے پاس ہوگا تو گھر کا کوئی فرد ادھر نہیں آسکتا۔
اور وہ تو جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ روی کی بات سے اچانک بہت شرما گئی تھی۔ جانے کے لیے کہنا تو بس ایک دھمکی تھی۔ روی کے ہاتھ پکڑ کر بٹھانے پر آرام سے بیٹھ گئی۔
"اب تم کیا کرو گے روی؟"
"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے..... جو بھی اچھا لگا وہ میں کروں گا۔"
اگلے دن روی چاچا جی کو لے کر آفس جا رہا تھا۔ گاڑی رش والی سڑک سے گزر رہی تھی۔ تبھی روی نے کار سڑک کے کنارے روک دی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "سامنے میڈیکل اسٹور سے دوا لے آتا ہوں۔ سلیکھا موسی کی ہے۔"
"ٹھیک ہے جلدی کرو۔" چاچا جی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولے۔
ان کی کار کے قریب ایک اور کار کھڑی تھی۔ چاچا جی کا دھیان اس کار کی طرف گیا۔
اس کار میں دو لڑکیوں کے درمیان ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ تینوں بدتمیزیوں میں مشغول تھے۔ لڑکے کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ ایک لڑکی کے کپڑوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ دوسری لڑکی بھی کچھ ویسی ہی حرکت اس لڑکے کے ساتھ کر رہی تھی۔
جیسے ہی چاچا جی نے اس لڑکے کا چہرہ دیکھا تو وہ اچھل پڑے۔
"وشال!!!" ان کے ہونٹوں سے ایک ہلکی آواز نکلی اور ان کے چہرے کے عضلات سخت ہوتے چلے گئے۔
روی جب لوٹا تو اس نے دیکھا کہ چاچا جی بے چینی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔
"آپ ٹھیک تو ہیں سر؟" کار کا دروازہ کھولتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر فکریہ لہجے میں پوچھا۔
"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، واپس گھر چلو۔" چاچا جی نے نڈھال سی آواز میں کہا۔
روی نے ایک نظر وشال کی کار پر ڈالی اور یوٹرن لے کر واپس گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔
......☆☆☆......
"مگر پرکاش جی آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ ہماری بھی کچھ عزت ہے۔" شیام لال کی آواز میں وہی کاروباری مٹھاس تھی جس کے دھوکے میں سب پڑ چکے تھے۔
"ہاں شیام لال جی، وہی عزت ابھی ابھی میں روڈ پر اچھلتی دیکھ کر آ رہا ہوں۔" چاچا جی کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔
"آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسی نے ضرور میرے خلاف آپ کو بھڑکایا ہے۔ کون ہے وہ کمینہ۔ آپ نام بتائیں اس کا۔ میں بھی دیکھوں کون میرے ساتھ دشمنی کر رہا ہے۔"
غلط فہمی تو مجھے اب تک تھی، اب نہیں شیام لال جی۔ اور آپ کا دشمن کوئی اور نہیں آپ کا اپنا بیٹا ہے۔ پوچھ لیجئے گا اس سے آج بھری سڑک پر کار میں بیٹھ کر وہ کیا کر رہا تھا۔ مجھ سے کچھ مت پوچھیے۔"
"میں پھر کہتا ہوں پرکاش جی، آپ اس وقت غصے میں ہیں۔ بعد میں ہم مل کر بات کریں گے۔ لڑکے نے کچھ غلطی کر دی ہو تو اسے اپنا بچہ سمجھ کر معاف کر دیجیے۔"
"نہیں شیام لال جی، کوئی بھی جان بوجھ کر مکھی نہیں نگل سکتا۔ آپ جو سوچیں مگر میری طرف سے اب یہ رشتہ ختم سمجھیں۔" بولتے بولتے چاچا جی کی سانسیں تیز ہو گئی تھیں۔ روی جواب تک وہیں کھڑا تھا دوڑ کر ان کے لیے شربت لے آیا۔
چاچا جی نے ایک سانس میں گلاس خالی کر کے روی کو پکڑا دیا۔
فون پر دوسری طرف سے شیام لال کی آواز آ رہی تھی۔ روی کو سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا ایک سیوک ہر وقت شیام لال کے پاس اور ایک وشال کے پاس موجود تھا۔ اور وہ دونوں اسے پل پل کی خبر پہنچا دیتے تھے۔
"تو پرکاش جی آپ اپنے سورگیہ بھائی کی دولت کے لالچ سے آج بھی پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ بس یہی وجہ ہے کہ آپ منگنی کے بعد بھی آشا کی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ شادی ہو جانے کے بعد ساری دولت آپ سے چھن جو جائے گی۔" اس بار شیام لال کی آواز میں مٹھاس کی کڑواہٹ بھری ہوئی تھی۔
"کیا بکواس کر رہے ہیں آپ، یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ آپ اپنی حد میں رہیں اور اب ہم سے کوئی ناتہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔"
"ایسا نہیں ہو سکتا پرکاش جی۔ یہ شادی تو ہو کر رہے گی۔ آپ بس کنیادان کے لیے خود کو تیار رکھیں۔" یہ کہہ کر شیام لال نے فون کاٹ دیا۔
اتنی دیر سے ہو رہی باتیں سن کر چاچی جی اور سلیکھا موسی بھی وہاں آ گئیں۔ تیز گرمی اور دھوپ سے لوٹ کر، لاؤنج میں بیٹھ کر چاچا جی اتنی دیر سے بات کر رہے تھے، گرمی اور غصے دونوں کے اثر سے ان کا چہرہ لال ہو چکا تھا۔
"کیا ہوا..... اور یہ فون پر آپ کس سے جھگڑ رہے تھے۔ کمرے میں جا کر بات کر لیتے، وہاں ٹھنڈک ہے۔" ان کی حالت دیکھ کر چاچی جی کو فکر ہو رہی تھی۔
جب چاچا جی نے انہیں ساری بات بتائی تو سن کر دونوں عورتیں ہکا بکا رہ گئیں۔
"کیوں آپ دونوں تو چاہ رہی تھیں کہ آشا سے نا ہو کر سیما سے رشتہ ہو جائے۔ اب کیا ہوا؟"
"آئے..... موا..... کیسے ستھرے لوگ لگ رہے تھے..... اور جی کیا آپ نے انہیں پرکھ لیا تھا جو آج سنا رہے ہو..... ہونہہ..... بھگوان بچائے ایسے لوگوں سے۔" سلیکھا موسی خود کو صاف بچاتی ہوئی بولیں۔
آشا اور روی کے لیے تو یہ جشن منانے والی بات تھی۔ شام کو کچن کے پیچھے والے باغ میں دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو گن رہے تھے۔ دنیا اور دنیا کے جھنجٹ سے الگ ان پریم پنچھیوں کو یہاں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کچن کے دروازے پر ایک آواز ہوئی۔ یہ اشارہ تھا کوئی خاص بات ہونے کا۔ آشا تیزی سے اندر گئی۔
تبھی نکیتا وہاں پہنچی اور بولی کہ پاپا اسے بلا رہے ہیں۔ آشا اس کے ساتھ کچن سے باہر نکل گئی۔
روی دوسرے راستے سے اندر جا چکا تھا۔ چاچا جی کی نظر جب روی پر پڑی تو اسے اپنے پاس بلا کر قریب کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں گھر کے سبھی لوگ موجود تھے۔ نکیتا اور آشا نہیں تھیں۔ اتنے میں وہ دونوں بھی اندر آ گئیں۔ چاچا جی نے آشا کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ سلیکھا موسی اور چاچی جی کی کھسر پھسر چل رہی تھی۔
ان دونوں کے لیے آشا آج بھی گلے میں پھنسی ہڈی کی طرح تھی جسے نہ نگل سکتی تھیں اور نہ اگل سکتی

تھیں۔ ایک کے بعد ایک ہونے والے حادثات نے انہیں آشا کے خلاف سیدھا مورچہ کھولنے سے روک دیا تھا' لیکن ان کا دل آج بھی آشا کے لیے بری سوچوں سے خالی نہیں تھا۔

آشا اور روی آج کی اس میٹنگ کے بارے میں کچھ کچھ سمجھ رہے تھے کہ شاید آج کے معاملے پر کوئی بات کرنی ہو۔

تبھی چاچا جی نے گلا کھنکار کر بولنا شروع کیا۔

"آشا' میری بچی' تم میرے سورگیہ بھائی کی نشانی ہو۔ لیکن آج تک میں اس گھر میں تم پر ہو رہے مظالم کو دیکھتا رہا۔ حالانکہ میں ایسا کبھی نہیں چاہتا تھا۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ گھر میں کسی وجہ سے کوئی تناؤ ابھرے۔ اس لیے میں ہمیشہ چپ رہا۔ لیکن آج کے واقعے نے میرے ضمیر کو جگا دیا ہے۔ اب بھلے ہی بہت سارا وقت گزر چکا ہے پر میں آج سے تمہیں اس گھر میں تمہارا جائز مقام دلوا کر رہوں گا...... بیٹی جب تمہارے پاپا سورگباش ہوئے تھے اس وقت میری مالی پوزیشن بہت خراب تھی۔ تمہارے پاپا نے مجھے اپنے کاروبار میں ساتھ ملا لیا۔ ان کا بہت پھیلا ہوا کاروبار تھا۔ آج جو بھی میرے پاس ہے وہ تمہارے پاپا کا یا یہ کہو کہ تمہارا ہے......۔ آج اس شیام لال نے اسی دولت کا طعنہ دیتے ہوئے مجھے لالچی کہا ہے۔ بیٹی' تمہارے پاپا کی وصیت کے مطابق پوری دولت کی تم اکلوتی وارث ہو۔ آج سے تم جیسے چاہو اسے استعمال کرو۔"

یہ سب تو آشا کو پہلے سے پتہ تھا۔ لیکن اپنے پیارے پاپا ممی کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی "چاچا جی' پاپا کے بعد میں نے آپ کو اپنے پتا کا درجہ دیا ہے۔ کوئی بیٹی اپنے باپ سے دولت کا حساب نہیں مانگ سکتی۔ میں صرف آپ کا' چاچی جی کا اور سلیکھا موسی کا پیار چاہتی ہوں۔...... مجھے اس دھن دولت سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ آج بھی اور آئندہ بھی۔"

آشا کی ایسی دوٹوک بات سن کر سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ روی مطمئن اور پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آشا کی نظریں جب اس سے ٹکرائیں تو وہ دھیمی مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی نیچے دیکھنے لگی۔

چاچی جی اور سلیکھا موسی کو آشا سے ایسے جواب کی امید نہیں تھی۔ جب چاچا جی نے یہ دھماکہ کیا تھا تب سے دونوں بہنوں کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اب شاید آشا ان سے بدلہ لے گی۔ مگر آشا کے اس سلوک نے انہیں اپنی نظروں میں ہی شرمندہ کر دیا تھا اور انہیں اپنا وہ سلوک یاد آ رہا تھا جو وہ اب تک آشا سے روا رکھتی آئی تھیں۔

چاچا جی نے آشا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ آشا کو مانو ساری دنیا کی دولت مل گئی تھی۔ ایک بار پھر سے اس کی آنکھیں بہہ نکلی تھیں لیکن اس بار یہ خوشی کے آنسو تھے۔

چاچا جی سے الگ ہو کر وہ مڑی اور ڈرتے ڈرتے چاچی جی کی طرف بڑھی۔ پتہ نہیں آج سبھی کے لیے اپنے جذبات میں بہہ جانے کا دن تھا۔ چاچی جی نے اٹھ کر آشا کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"مجھے معاف کر دینا بیٹی' میں نے تمہارے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔"

آشا بھی چاچی جی سے لپٹ گئی۔ وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

موسی کا حال تو رنگے ہاتھوں پکڑے گئے چور جیسا تھا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چاچی جی اور ان کے شوہر اتنے بے وقوف کیوں ہیں۔ اچانک وہ

اٹھیں اور میٹنگ ہال سے واک آؤٹ کر گئیں۔ روی نے انہیں جاتا دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔ "ایشور تم پر رحم کرے استاد الوکھ۔"

"روی' تم بھلے ہی ایک ڈرائیور ہو پر تم نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔ تم کسی شریف ماں باپ کی اولاد لگتے ہو۔ تم میرے بیٹے کی طرح ہو۔ کیا تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟" یہ سنتے ہی روی کو ہنسی آ گئی۔ وکرال کو سیما اور نکیتا اچھی لگتی تھیں تو وہ ٹھیک اس سے ہی اسے مدد مانگ رہا تھا۔ اب چاچا جی کو کون پسند آ گئی؟ اپنی ہنسی کو چھپاتے ہوئے وہ بولا۔

"میں تو اناتھ ہوں۔ آپ نے مجھے بیٹا کہا سر' آپ بولیئے آپ کی میں کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔ کون ہے وہ نام بتائیے' جس نے آپ کو بے چین کر رکھا ہے؟"

چاچا جی حیرت سے روی کا منہ تک رہے تھے۔

"بیٹا اتنے جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے تو تم مجھے سر کہنا چھوڑ دو چاچا جی کہہ سکتے' اگر تم چاہو۔"

روی کو اور کیا چاہئے تھا آشا کے رشتے سے تو وہ چاچا جی ہی کہنا چاہتا تھا۔

"چاچا جی' آپ نے اس یتیم کو جو مان دیا ہے اس کے بدلے آپ مجھ سے میری جان مانگ لیں' میں دے دوں گا۔" اتنا لمبا ڈائیلاگ بول کر وہ پچھتا رہا تھا۔ اس کی جان تو آشا تھی اور آشا کو شرط پر لگانا اچھا نہیں تھا۔ پر کہتے ہیں نا منہ سے نکلی بات اور بندوق سے نکلی گولی واپس نہیں لوٹ سکتی۔

"بیٹا اس کمینے شیام لال نے مجھے دھمکی دی ہے کہ آشا کی شادی وشال سے ہی ہوگی۔ میں اسی بات سے بہت پریشان ہوں۔" چاچا جی نے اپنی پریشانی کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے بیٹا کہہ دیا نا چاچا جی' پھر آپ کیوں چنتا کرتے ہیں۔ اب آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں اور بے فکر ہو جائیں۔" اپنی طرف سے تو وہ چاچا جی پر چھا جانے کی کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا تھا۔

چاچا جی کو لگا کہ جوانی کے جوش میں روی کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔ پھر بھی روی کی باتوں سے انہیں کچھ تسلی ملی تھی کہ چلو ایک بڈھے کے ساتھ ایک جوان تو رہے گا۔

اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔ آشا اور روی تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

"بڑی بڑی باتیں پھینک رہے تھے' کیا بات ہے؟" اکیلا پا کر آشا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بھتیجی کی دولت اب بھتیجا ہڑپ کرنے کے چکر میں ہے۔" وہ کون سا کم تھا۔ آشا کی بات سن کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"ہم م م...... بھتیجی کی دولت چاہئے یا بھتیجی؟"

اس کی بات سن کر آشا اس پر چڑھ دوڑی۔ وہ ہنستا ہوا دوسری طرف بھاگ گیا۔

صبح بہت ہی خوشگوار تھی۔ پچھلی رات آندھی چلی تھی۔ پھر بارش بھی ہوئی تھی۔ اس کا اثر پورے ماحول پر تھا۔ ہوا میں ہلکی خنکی تھی۔ بارش کے بعد درختوں کے پتے اور گھاس اپنی قدرتی سبزی پا کر چاروں طرف ہریالی بکھیر رہی تھیں۔ ان کے بیچ چھوٹے چھوٹے پنچھی اپنی میٹھی میٹھی آواز سنا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے قدرت نے کسی کے استقبال کے لیے یہ تیاریاں کی ہوں۔

پچھلے دن تک وہی جھلسا دینے والی دھوپ تھی۔ گرمیوں سے پریشان' سبھی لوگ رات میں بدلے موسم کا سرور لے رہے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ موسم کا مزاج کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

آشا کے جیون میں بھی کل تک تپتی دھوپ اور لو کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک رات نے اس کی زندگی میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس کے سندر گالوں کی لالی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ رس بھرے ہونٹوں میں بھی ایک چمک سی آ گئی تھی۔ اس کے چلنے اور بولنے کے انداز میں آج بہت انقلاب آ چکا تھا۔ اس تبدیلی نے اس کے پورے بدن کو خوبصورتی سے اور بھر دیا تھا۔

کل تک اس کی چال میں جہاں لاچاری ٹپکتی تھی وہیں آج اس کی چال ایک الہڑ سی مستی دکھا رہی تھی۔ چلتے وقت اس کے انگوں کی تھرکن ہوش اڑانے والی تھی۔

اس کی آواز کا سریلا پن کوئل کی کوک کو مات دے رہا تھا۔ بولتے وقت آنکھوں کی چمک سامنے والے کو کھو جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

اس کی معمول کی ذمہ داریاں یکسر ختم کر دی گئی تھیں۔ صبح صبح چاچی جی کی مسکراتی آنکھوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ پھر کل تک جو نکیتا اور سیما اسے دیکھ کر منہ ٹیڑھا کر لیتی تھیں، آج اس سے بات کرتے ہوئے ہنسی نہیں روک پا رہی تھیں۔

اگر نہیں بدلا تھا کوئی تو وہ تھیں سلیکھا موسی۔ اپنی شیطانی ذہنیت کے ساتھ وہ پہلے کی طرح اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھیں۔

"موسی تم سچی ہو، باقی سب جھوٹے ہیں، بناوٹ سے بھرے ہوئے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر آج بھی موسی کی تعریف کر رہی تھی۔

چاچا جی کی نظر پہلے بھی اس پر پیار بھری ہی پڑتی تھی۔ خاموش وہ پہلے بھی رہا کرتے تھے اور آج بھی تھے۔

آشا کے لیے آج سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ کیا کرے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ صبح خود فریش ہو جانے کے بعد وہ سمجھ نہیں پائی کہ اب وہ کہاں جائے۔

کمرے سے باہر نکلی تو چاچی جی "قربان جاؤں" والے انداز میں ملیں، پھر نکیتا اور سیما بھی نئے انداز میں تھیں۔ آشا کو یہ سب دیکھ کر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ایک رات کی آندھی اور طوفان نے انہیں بدل دیا تھا۔

تھوڑی دیر ان کے پاس رہ کر اس کا دل کیا کہ وہ اپنے مہربان برگد کے پیڑ کے پاس جائے۔ اور وہ ادھر چل دی۔

باہر کا ماحول اندر سے زیادہ خوبصورت تھا۔ پیڑ پودے دھلے دھلے اور جاذب نظر لگ رہے تھے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا پورے بدن میں مستی بھر رہی تھی۔

برگد کے پتے ہوا سے ایسے ہل رہے تھے جیسے آشا کو بلا رہے ہوں کہ آ جاؤ تمہاری خوشیوں کا خزانہ یہیں ہے۔

اس نے ایک لمبی سانس لے کر ہوا اپنے پھیپھڑوں تک پہنچاتے ہوئے سامنے دیکھا تو اسے لگا جیسے ہر طرف کی سندرتا اچانک بڑھ گئی ہو۔ ہوا اور زیادہ خوشگوار لگ رہی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ میں ایک نیا سنگیت ابھر آیا تھا۔

سامنے منظر کی خوبصورتی کو بڑھاتا نیلی آنکھوں والا روی اپنی تمام تر جاذبیت کے ساتھ اپنی شرار مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔

"خوب...... بہت خوب۔" روی کے اس جملے نے آشا کو رنگوں سے بھر دیا تھا۔

"سچ مچ میں یہ بوڑھا برگد سدا سے مجھ پر مہربان رہا ہے۔" سوچتی ہوئی وہ روی کے نزدیک پہنچ گئی۔

دونوں ایک دوسرے میں کھو کر اس حسین موسم کا مزا لے رہے تھے۔ تبھی باہری گیٹ سے کسی گاڑی

کے اندر آنے کی آواز آئی۔ ابھی دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں آنے لگی۔

روی پیچھے والے گیٹ کی طرف دوڑا۔ اس کے پیچھے آشا بھی تیزی سے لپکی۔

باہر کمپاؤنڈ میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کے آس پاس ہٹے کٹے چھ سات خطرناک شکلوں والے لنڈے قسم کے لوگ کھڑے تھے۔ ان سب کے آگے وشال بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ چاچا جی، چاچی جی، سلیکھا موسی، سیما اور نکیتا سبھی وہاں موجود تھے۔ سبھی ڈرے ہوئے لگ رہے تھے۔

آشا اور روی کو وہاں آتا دیکھ کر اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ عجیب عجیب طرح کی وہ شکل بنا رہا تھا۔ روی کو اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

آشا سوچ رہی تھی کہ کیسے گرے ہوئے نکلے یہ لوگ۔ اب تو غنڈوں کو ساتھ لے کر زبردستی پر اتر آئے تھے۔

"اے لڑکی...... تو چل میرے ساتھ، آج ہی میرے ساتھ تیری شادی ہے...... کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ۔ منگنی توڑی تھی نا؟" وشال غراتے ہوئے بولا۔

"سر آپ شانت ہو جائیں اور آرام سے بیٹھ کر چاچا جی سے بات کریں۔" روی بہت نرم لہجے میں بولا۔

"تم خاموش رہو، دو ٹکے کے نوکر، مجھے کسی سے بات نہیں کرنی...... چلو لڑکی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے جھپٹ کر آشا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آشا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اس نے جلدی سے روی کی طرف دیکھا۔

"وشال...... جتنی جلدی ہو آپ آشا کا ہاتھ چھوڑ دو۔" روی برف کی طرح سرد آواز میں بولا۔ سب نے دیکھا کہ ہنستا، چہکتا ہوا پیارا سا روی ایک پل میں پوری طرح بدل گیا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں سے اس وقت شعلے برس رہے تھے اور چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔

"بدتمیز نوکر، مالکوں سے بات کرنی نہیں سیکھی تو نے۔ تجھ سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا۔ ابھی میں اپنی منگیتر کو لے کر جا رہا ہوں۔"

آج کی صبح کتنی حسین تھی۔ گرمیوں کے تناؤ سے الگ۔ ٹھنڈی اور تیز ہوائیں لوگوں کو خوشیوں سے بھر رہی تھیں۔ پر ہائے رے موسم کا مزاج۔ ایک پل میں کچھ اور، دوسرے پل میں کچھ اور۔

تیز اور نکھری دھوپ نکل آئی تھی۔ ہوا میں بارش کی وجہ سے نمی تھی۔ اب حبس ہونے لگا تھا اور گرمی بھی پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

ایسے میں اس گھر کے لوگوں کے لیے صبح صبح نئی مصیبت آ گئی تھی۔ اب تو کسی کو یاد بھی نہیں تھا کہ صبح لوگ کتنے خوش تھے۔

"لے جا، لے جا، موئی کرم جلی کو، یہ جہاں بھی رہے گی، سب کی پریشانی کی وجہ بنتی رہے گی۔" سلیکھا موسی منہ ٹیڑھا کر کے نفرت بھرے انداز میں بولیں۔

"موسی آپ کے کمرے میں کوئی آپ کو بلا رہا ہے۔" سیما اس کے نزدیک آ کر دھیمی آواز میں بولی۔

"ہم تو باہر کھڑے ہیں، پھر کمرے میں کون آ گیا، کوئی نیا نوکر ہوگا۔" موسی بڑبڑاتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے میں پہنچی۔

کمرے میں سفید دھوتی کرتے میں لمبی چٹیا والا کوئی سادھو کھڑا تھا۔ موسی نے انہیں پہچانا نہیں۔

"کون ہیں آپ؟ اور ادھر کیسے آ گئے؟" موسی نے جلدی سے پوچھا۔

"میں گروالوکھ ہوں۔ بہت دور سے آیا ہوں۔" ان کے لہجے میں بہت مٹھاس تھی۔

"بہت دور سے...... اور سیدھا میرے کمرے میں؟ اور یہ الوکھ کیسا نام ہے؟ الوک تو سنا ہے پر الوکھ؟"

"ہاں دیوی...... تیری یاد نے مجھے سیکڑوں برسوں سے بے چین کر رکھا ہے...... میں جہاں سے آیا ہوں وہاں کی سب باتیں حیران کن لگتی ہیں۔ ہماری طرف کے نام بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"کیا...... ؟ سیکڑوں برسوں سے مطلب میں آپ کو ہزار برس کی لگتی ہوں؟" اس کی باتوں میں موی ایسے الجھ رہی تھیں کہ وہ سوچتی کچھ تھیں اور بولتی کچھ اور۔

"نہیں دیوی...... ہزار برس کی نہیں، مجھے تو لگتا ہے تم لاکھوں برس کی ہو اور میں سدا سے تمہیں ڈھونڈ تا رہا ہوں۔"

"ہائیں...... جھوٹے...... کیا بول رہے ہیں آپ؟" اس ساجن کی باتوں کو سن کر موی اپنی عمر بھول کر بری طرح شرما رہی تھیں۔

"یہ لمبی چٹیا...... آپ تو کسی مندر کے پجاری لگتے ہیں، آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔" سب کو ایک ہی لہجے میں جھڑکنے والی موی کا لہجہ آج کافی مختلف تھا۔

"کیا آپ کو لمبی چٹیا اور دھوتی پسند نہیں ہے؟ کوئی بات نہیں۔ میرا بھائی ہے جو میری طرح ہی برسوں سے آپ کی پوجا کر رہا ہے، آپ اس سے ملیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

"ہے بھگوان...... یہ کیا چکر ہے۔" موی ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ دروازہ سے ایک سونڈ بونڈ آدمی اندر آ گیا۔

"دیوی میں پروفیسر الوکھ ہوں۔ ہمارے یہاں مجھے الوکھ پارٹ 2 کہتے ہیں اور میرے بھائی صاحب کو الوکھ پارٹ ون۔" یہ سب دیکھتے ہوئے موی کا سر زور سے چکرانے لگا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بستر تک پہنچیں اور بستر پر گر کر بے سدھ ہو گئیں۔

پروفیسر الوکھ کچھ دیر فکر مندی سے انہیں دیکھتا رہا پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

......☆☆☆......

"بابا' آپ دیکھ رہے ہیں، کتنی ہمت ہے ان بدمعاش انسانوں کی۔ یہ آشا کو زبردستی لے کر جانا چاہتے ہیں۔" وکرال بابا سکندر کے سامنے ادب سے بیٹھا انہیں آشا کے گھر کے تازہ حالات بتا رہا تھا۔

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں، پر ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے روی اکیلا بھی نمٹ سکتا ہے۔ میں نے اپنی نگرانی میں اس کی تربیت کی ہے۔"

"بابا وہ میرا بھائی ہے...... دوست ہے...... میں جا رہا ہوں اس کے پاس۔" وکرال کے انداز میں بے چینی تھی۔

"ٹھیک ہے جاؤ بیٹا۔ اپنے ساتھ اور جنوں کو بھی لے جا سکتے ہو۔" بابا نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو میرے اور روی کے ہوتے ہوئے کسی اور کی ضرورت تو نہیں ہے، اگر پھر بھی وہاں ضرورت پڑی تو آپ کے ان تین سیوکوں سے کام لے لوں گا۔"

وکرال نے وہاں سے نکل کر تیزی سے استاد الوکھ کو تلاش کیا۔ اسے پتہ چلا کہ مہاشے تو پہلے سے آشا کے گھر پہنچے ہوئے ہیں۔

ادھر وشال نے جیسے ہی آشا کا ہاتھ پکڑ کر مڑنا چا کہ پتہ نہیں کہاں سے ایک بڑا سا پتھر اس کے ا ہاتھ پر گرا جس ہاتھ سے اس نے آشا کو پکڑ رکھا تھا۔

آشا کو چھوڑ کر وہ چیختا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ آشا دوڑ کر چاچی جی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ وشال ادھر ادھر دیکھ رہا تھا' جیسے وہ پتھر مارنے والے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اس کی نگاہ جب روی پر پڑی تو اس کا خون کھول اٹھا۔

"پکڑو اس نوکر کی اولاد کو اور اچھی طرح سے سکھلا دو کہ بڑے لوگوں کے ساتھ کیسے پیش آیا جاتا ہے۔" اس نے اپنے پیچھے کھڑے غنڈوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

"اے کمینے انسان۔ میں اب بھی تمہیں موقع دے رہا ہوں، اپنے آدمیوں کے ساتھ نکل جاؤ یہاں سے۔ ورنہ جو کچھ تیرے ساتھ ہوگا پھر اس کی شکایت مت کرنا۔" روی نے ٹھنڈے لہجے میں وشال کو الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا۔

"بہت بول لیا' اب دیکھ تو اپنا حشر۔" وشال اپنے آدمیوں کو روکتا ہوا خود روی کی طرف لپکا۔ روی کو اس لڑائی میں خود شامل ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور وہ سب سے پیار کرنے والا نوجوان تھا۔ بغض اور نفرت سے تو وہ کوسوں دور تھا۔

لیکن بابا سکندر کی ایک نصیحت اسے یاد آ گئی کہ زیادتی کرنے والے سے خود کو بچا کر نکل جانا اور زیادتی کرنے والے کو سبق سکھانا بھی فرض ہے۔

وشال جھپٹتا ہوا روی تک پہنچا اور گھونسہ چلایا' لیکن اسی تیزی سے روی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب وشال اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا پر اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی نے شکنجے میں کس دیا ہو۔

اس نے روی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وشال کو اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا دکھائی دیا کہ وہ خوف سے لرز اٹھا۔ تبھی روی نے ایک زور کا [illegible] دیتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ سیدھا اپنے [illegible] کے قدموں میں جا گرا۔ مگر لگتا تھا وہ بھی ہار ماننے والا نہیں ہے۔

اپنے غنڈوں کو للکار کر اس نے پھر سے روی کی طرف اشارہ کیا۔ چھ کے چھ غنڈے ایک ساتھ روی پر جھپٹے۔ تبھی گیٹ کی جانب سے کسی نے چلا کر کہا تین کالے کلوٹے آدمی دوڑتے ہوئے گھس آئے۔ ان کے پیچھے ایک چوتھا بھی تھا مگر وہ ان سے الگ اچھے کپڑوں میں ملبوس نوجوان تھا۔

چاروں ان غنڈوں کے سامنے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے' سب اپنے سر جھکائے ہوئے تھے۔ آشا اور روی انہیں دیکھ کر چونک پڑے اور دونوں اپنے ہونٹوں پر آئی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپانے لگے۔

"کون ہو تم سب؟ چلو بھاگو یہاں سے۔" وشال جو اٹھ کھڑا ہوا تھا' تیز آواز میں بولا۔

"حضور میں رام سیوک' یہ دوسرا ہے لکشمن سیوک' تیسرا بھارت سیوک ہے۔"

"اور میں شترو...... تمہارا دوست' یہ جو لڑکا روی ہے۔ یہ ہمارا پڑوسی ہے۔ اس پر ہمارا کافی ادھار نکلتا ہے۔ آج ہم چاروں اس سے اپنا حساب کرنے آئے ہیں۔ آپ اپنا پروگرام جاری رکھیں' ہم ادھر کنارے پر کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔"

چوتھا کرخت لہجے میں اپنا تعارف دیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وشال بار بار اپنے کام میں رکاوٹیں دیکھ کر غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ "چلو ٹوٹ پڑو۔" اس نے پھر سے اپنے غنڈوں کو للکارا۔

"ہاں ٹوٹ پڑو۔" شترو نے ٹکڑا لگاتے ہوئے کہا۔ تبھی روی کی طرف دوڑے اور پھر مڑ کر وشال پر ٹوٹ پڑے۔

"ارے بے وقوفو...... تم اپنے ہی مالک کی پٹائی

کیوں کر رہے ہو؟" شترو نے چلا کر کہا۔
تبھی غنڈوں کے ہاتھ رک گئے اور حیرت کے مارے ان کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ کبھی وہ گرے ہوئے وشال کو دیکھتے اور کبھی الگ کھڑے روی کو۔

"کمینو...... تم سب پاگل ہوگئے ہو کیا؟ چلو جلدی سے اسے پکڑ دو ورنہ ایک ایک کی جان لے لوں گا۔" وشال نے اپنی جیب سے پستول نکال کر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

غنڈے ڈرے ہوئے ایک بار پھر روی کی طرف بڑھنے لگے۔ اس بار وہ بہت ہی ہوشیاری برت رہے تھے۔ ادھر ادھر ہر طرف دیکھتے ہوئے آگے قدم بڑھا رہے تھے۔

"ابے...... او...... کمینو...... رکو...... پہلے ایک گیت تو سناؤ' پھر میری پٹائی کر لینا۔" روی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر تو سب نے دیکھا کہ غنڈے اپنی بے سری آواز میں اناپ شناپ گانے لگے۔

چاچا جی' چاچی جی' سیما اور نکیتا اس عجیب و غریب واقعے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں۔ خود وشال بھی انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ غصے کے مارے اس کا برا حال تھا۔ مگر وہ سمجھ چکا تھا کہ اکیلے وہ روی سے نہیں نمٹ سکتا۔

"چپ ہو جاؤ سالو...... حرام خورو۔" وشال حلق پھاڑ کر چلایا۔ اس کے ساتھ ان کے گانوں پر بریک لگ گیا۔ وشال سمجھا کہ اس کی ڈانٹ سن کر وہ سب چپ ہوگئے ہیں۔ غنڈے حیرت کے ساتھ چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

"میں ابھی تم سب کو گولی مار دوں گا۔ تم سب ان سے ملے ہوئے ہو سالو۔"

"ہمیں گالی مت دو' وشال بابو۔ ہم جس کو وچن دیتے ہیں اسی کا کام کرتے ہیں۔" ایک غنڈہ جو شاید ان کا لیڈر تھا' بگڑ کر بولا۔

"تو پھر تم سب مل کر اس ایک لڑکے کو کیوں نہیں پکڑ پا رہے ہو۔ اب دیکھو میں خود اس کمینے کو کیسے اپنے قابو میں کرتا ہوں۔" وشال اس کے جواب پر چڑ کر بولا۔

"ہاں حضور' بڑا ہی چالاک ہے یہ چھورا۔ گاؤں میں سب کی ناک میں دم کر کے رکھ دیتا تھا۔ آپ اسے قابو میں کریں تو ہم بھی اس سے اپنا ادھار چکتا کریں۔" شترو نے وشال سے کہا۔

"وشال بابو میری مانیں تو واپس چلیں' یہاں نہیں لگتا کہ آپ کچھ کر پائیں گے۔" غنڈوں کا لیڈر بولا۔

"دھوکے باز...... بزدل...... کمینے' مجھے پتہ ہے کہ تم ان کے ہاتھوں بک چکے ہو۔ لیکن میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔" اس کے ساتھ ہی وشال اس غنڈے کی طرف پستول تان کر آگے بڑھا۔ اچانک اس نے پستول کو اپنے سر پر رکھ لیا اور سر پر ہاتھ رکھ کر ایک گیت گاتا ہوا ٹھمکے لگانے لگا۔

سارے غنڈے اور چاچا جی کا خاندان منہ پر ہاتھ رکھے حیرت سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

روی نے غنڈوں کے لیڈر سے کہا "تم سب گاڑی میں بیٹھ جاؤ' تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں اس کمینے کو بھی گاڑی میں ڈال دوں گا۔ اسے لے کر چلے جاؤ۔"

روی نے آنے والے کالوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔ اس نے ٹھمکے لگاتے ہوئے وشال کے پاس جا کر کہا۔ "حضور ٹھمکے بند کیجئے' آپ کی کمر میں موچ پڑ جائے گی۔" لیکن وہ ویسے ہی ٹھمکے لگائے جا رہا تھا۔ غنڈوں کے چہروں پر اب حیرت کی جگہ خوف نے لے لی تھی۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے روی اور

دوسرے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔
اس حبشی نے وشال کو رکتے نہ دیکھ کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر ایسے اٹھا لیا جیسے بلی چوہے کو پکڑ لیتی ہے۔ پھر اسے گاڑی میں رکھ دیا۔ روی کے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہی گاڑی تیزی سے گیٹ کے باہر نکل گئی۔

ان کی جیپ گیٹ سے باہر جا چکی تھی۔ چاچا جی وغیرہ تھوڑی دیر اس واردات کے اثر سے بے حرکت گیٹ کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ تبھی روی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ان کا دھیان ٹوٹا۔

بعد میں آنے والے چاروں افراد ابھی بھی وہاں موجود تھے۔ چاچا جی کو یاد آیا کہ ان سب نے روی پر کچھ ادھاری ہونے کی بات کی تھی۔

"روی بیٹے ان سب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ' وہاں آرام سے بات ہوگی۔"

ڈرائنگ روم کے ٹھنڈے ماحول میں سب بیٹھے شربت کا مزا لے رہے تھے۔ روی اپنا گلا صاف کرتا ہوا بولا۔ "چاچا جی یہ وہ نہیں ہیں جو انہوں نے وشال اور ان غنڈوں کے سامنے کہا تھا۔" اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے۔

"پھر کون ہیں یہ؟ اور یہاں کس کام سے آئے ہیں۔" چاچا جی کو ان سب کے بارے میں جاننے کا تجسس ہو رہا تھا۔

گھر کے سب لوگ وہاں موجود تھے۔ ایک سلیکھا موسی نہیں تھی وہاں۔ چاچا جی کو ان کی غیر حاضری کا احساس ہوا اور انہوں نے چاچی جی سے پوچھا تو چاچی جی نے سیما کو انہیں بلا کر لانے کو بھیج دیا۔

اب چاچا جی نے ان حبشیوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں بتاتا ہوں سر۔" صاف ستھرے اجنبی نوجوان نے کہا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہم لوگ دوسرے شہر سے آئے ہیں۔ وہاں ہمارا ٹھیک ٹھاک کاروبار چلتا ہے۔ شہر سے باہر ہمارا اپنا فارم ہاؤس بھی ہے۔"

ایک پل کے لیے وہ رکا پھر بولنا شروع کیا۔ "میرا نام وکرال ہے۔ یہ تینوں میرے فارم ہاؤس کے ملازم ہیں...... اور یہ روی...... یہ میرے سورگباشی چاچا کا اکلوتا بیٹا یعنی میرا چچیرا بھائی ہے۔"

چاچا جی اور ان کے گھر والوں کے لیے لگتا تھا کہ آج حیرتوں کا دن تھا۔ ایک کے بعد ایک جھٹکے لگ رہے تھے۔ سبھی اب روی کو غور سے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے آج پہلی بار اسے دیکھا ہو۔

نکیتا کے ساتھ تھوڑا الگ سے بیٹھی آشا کے ہونٹوں پر مندی مندی مسکان تیر رہی تھی۔ اس کا پریوں جیسا سندر مکھڑا کچھ دنوں سے کھلتا ہی جا رہا تھا۔

حالانکہ آشا سدا سے صبر والی لڑکی تھی۔ گھر کے لوگوں کی جانب سے ہو رہے مظالم کو اپنا مقدر مان کر اپنے من کو مطمئن کر لیا تھا لیکن جب اسے اپنے ممی پاپا یاد آ جاتے تو اس کی سوکھی آنکھوں میں بندھا دریا کا بند ٹوٹ جاتا تھا۔ اس کے کمرے کے در و دیوار اس کے آنسوؤں کے گواہ تھے۔

اپنے مستقبل کے بارے میں تو ایک بار بھی اس نے نہیں سوچا تھا۔ اسے کاموں سے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچ کر فکرمند ہوتی۔

روی کے آنے کے بعد اس کے دل کی دنیا بدلی اور مستقبل کی فکر آ گئی تھی اس کے پاس۔ مگر یہاں ہونے والے واقعات سے اسے اطمینان تھا جس کا

اظہار اس کے چہرے سے بخوبی ہو رہا تھا۔
وکرال اور سیوکوں کو نئے حلیے میں دیکھ کر اسے اپنی ہنسی کو روکنا مشکل ہو رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ لال ہوگیا تھا۔ ہنسی کو روکنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی دکھائی دے رہی تھی۔ روی کو پتہ نہیں تھا کہ وکرال کے دماغ میں کیا ہے۔ اسے فکر بھی ہو رہی تھی کہ پتہ نہیں وہ اور کیا بول جائے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔
اس کی نگاہ ایک طرف آشا کو بھی مستقل اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔ آشا کا ہنستا کھلتا چہرہ دیکھ کر وہ خود کھلا جا رہا تھا۔
ادھر وکرال، چاچا جی کے سامنے اپنے جھوٹ کا پٹارہ کھول چکا تھا۔ روی جانتا تھا کہ وہ ایک سچا جن ہے۔ وکرال ایسے کاموں کے لیے ہمیشہ روی کو آگے رکھا کرتا تھا کیونکہ انسان تو جھوٹ کا بھنڈار ہیں۔ قدرت نے انسان کو بناتے وقت جھوٹ بھی بھر بھر کے ٹھونس دیا تھا شاید۔
"کیا..... روی آپ کا بھائی ہے؟" چاچا جی نے اپنی حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ وہ وکرال کے مزید بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وکرال ایک دم سوکھا سا منہ بنائے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ روی کو اس کی ایکٹنگ ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔
"جی جناب ہم سب ایک ساتھ رہتے تھے۔ یہ روی میرا بھائی ہی نہیں۔ میرا بچپن سے آج تک کا اکیلا دوست بھی ہے۔ میری ایک بھول کی وجہ سے یہ مجھ سے ناراض ہوگیا اور گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا..... میں اپنی غلطی پر شرمندہ تھا۔ مجھ سے جتنا ہو سکا میں نے ہر جگہ اسے تلاش کیا پر یہ میرا نالائق بھائی، ایسے غائب ہوا جیسے میرے ان ملازموں کے سر سے سینگ۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔
بڑا ہی مکار جن ہے یہ، روی سوچ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہا لینا جنوں کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ چاہتا تو کہاوتوں کے مطابق خون کے آنسو بھی بہا کر دکھا سکتا تھا۔
"کل میرا ایک نوکر اس شہر میں آیا تھا کسی کام سے۔ اس نے لوٹتے ہوئے روی کو دیکھ لیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے روی کا پیچھا کر کے اس کو دیکھ لیا۔ واپس آ کر جب اس نوکر نے مجھے بتایا تو خوشی کے مارے مجھے پوری رات نیند نہیں آئی۔" سب نے دیکھا سچ مچ اس کی آنکھیں سرخ دکھائی دے رہی تھیں۔
"جھوٹا کہیں کا..... خوب سویا ہوگا تو رات بھر۔" روی دل میں اس سے کہہ رہا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وکرال کی آنکھیں لال نہیں تھیں۔
"میرے دل میں آندھیاں چل رہی تھیں، باہر کا موسم بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میرے بھائی، میرے دوست کے ملنے کی خوشی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اور موسم کی گرمی اب مجھے ٹھنڈک دے رہی تھی۔ صبح میں اپنے ان تینوں ملازموں کو لے کر چل پڑا اور یہاں پہنچ کر میں ان غنڈوں کے رچائے ہوئے تماشے کو دیکھنے لگا۔" وکرال اپنی بات ختم کر کے روی کی طرف دیکھنے لگا اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے کہہ رہا ہو دیکھا کتنی اچھی کہانی بنائی ہے۔
"وکرال تم لوگ کس سواری سے آئے ہو؟" روی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
"میں تمہاری والی گاڑی لے کر آیا ہوں۔ اندر گاموں کو دیکھ کر گاڑی ہم نے کمپاؤنڈ کے باہر سڑک کے کنارے کھڑی کر دی تھی۔" وشال نے ایک سیوک کو گاڑی اندر لے آنے کو کہا۔
اچانک ملے حکم سے بیچارہ سیوک حیرت سے اسے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔
کچھ ہی پل میں سب نے ایک نئی چمچماتی لمبی سی کار پورچ میں رکتے دیکھی۔
"میری کار۔" روی ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔
گھر کے سبھی لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نئی قیمتی گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ روی خود بھی اس گاڑی کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔
جنوں کے ساتھ رہتے ہوئے اسے کبھی کسی سواری کی ضرورت پڑی ہی نہیں تھی۔ اسے وکرال کی کہی باتوں پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ کاروبار اور فارم ہاؤس، اس خرافاتی جن کے لیے یہ سب کر لینا بالکل آسان کام تھا۔
آشا کو بھی یہ تماشہ دیکھ دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور سیدھی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ دوسری طرف سلیکھا موسی وہاں آ چکی تھیں اور بالکل چپ چپ بیٹھی تھیں۔
چاچی جی اور ان کی دونوں بیٹیاں اب روی کو الگ ہی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ آشا جاتے جاتے ان کی نظروں میں آئی تبدیلی کو دیکھ چکی تھی۔ آشا کے مطابق یہ تینوں سلیکھا موسی سے کہیں زیادہ خطرناک تھیں۔
سلیکھا موسی کی زبان پر بھی وہی ہوتا تھا جو ان کے دل میں ہوتا تھا، وہ کسی بات کو چھپا کر نہیں رکھتی تھیں۔ مگر یہ تینوں چھپ کر دشمنی کرنے والی تھیں۔ ان کے ساتھ منہ میں رام رام اور بغل میں چھری والی مثال تھی۔
لیکن اب آشا کو ان سب باتوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ پریم کے کچے دھاگے میں بندھ کر وہ بے فکر ہوگئی تھی۔ اسے اپنے مندر کے دیوتا پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ یہ جانتی تھی کہ روی جو اچھا سمجھے گا وہی کرے گا۔
ان چند دنوں کے ساتھ میں ہی وہ انسانوں کی فطرت کو اچھی طرح سے سمجھنے لگی تھی۔ انسان لالچ اور خودغرضی میں کتنا نیچے گر سکتا ہے اس کا اسے تجربہ ہو چکا تھا۔
ادھر چاچا جی جب حیرتوں کے جھٹکوں سے باہر آئے تب ایک بار پھر وکرال سے مخاطب ہوئے۔ "آخر کون سی بات پر روی اتنا ناراض ہوا کہ اس نے گھر چھوڑ دیا۔"
"کیا بتاؤں سر..... بات سمجھیے تو کچھ بھی نہیں ہے..... سب اس کی بدمعاشی تھی۔ آپ اسی سے پوچھ لیجیے۔" وکرال بالکل سنجیدہ لہجے میں سر جھکائے ہوئے بولا۔ روی اچھی طرح اس بدمعاش جن کی چالاکی کو سمجھ رہا تھا۔
چاچا جی نے روی کی جانب دیکھا اور اسے بتانے کی پریشانی میں سمجھ کر پھر سے وکرال سے بولا۔ "روی شاید ٹھیک سے نہ بتا پائے۔ تم ہی بتا دو وکرال بیٹے۔"
"اوہ سر..... ہم لوگ اپنے اس نالائق بھائی کی شادی کرنا چاہتے تھے اور یہ ہر بار کسی نہ کسی بہانے سے روک دیتا تھا۔ آخری بار جب سب لوگوں نے پکا فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے روی کو شادی کرنا ہی پڑے گی۔ تب یہ چپکے سے گھر سے بھاگ گیا۔"
بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی جس کی وجہ سے روی جیسا سمجھدار لڑکا گھر چھوڑ کر نکل گیا۔" چاچا جی نے اپنی حیرت ظاہر کی۔
"یہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا.....

جبکہ ہمارے خاندان میں یہ روایت نہیں ہے۔ ہر لڑکے کی شادی گھر کے بڑے اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔" وکرال پتہ نہیں اتنی باتیں کہاں سے سیکھ کر آیا تھا اور یہاں چاچا جی کی عدالت میں کسی اچھے وکیل کی طرح اپنا دلائل دیئے جا رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، تو اب آپ دونوں بھائیوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"اب تو ہم زبردستی باندھ کے اسے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے...... مگر کیا آپ ہماری تھوڑی مدد کر سکتے ہیں؟" وکرال نے چاچا جی سے پوچھا۔

"کس بارے میں مدد لینا چاہتے ہو بیٹے؟"

"یہی کہ یہ کسی طرح شادی کے لیے راضی ہو جائے...... یا اپنی پسند چپکے سے مجھے بتا دے تاکہ میں باقی گھر والوں کو سمجھا کر تیار کر سکوں۔"

"اچھا...... فی الحال تو تم لوگ فریش ہو کر یہاں آرام کرو۔ شام کو ہم لوگ اس بارے میں پھر بات کریں گے۔" چاچا جی نے ایک نوکر کو ان کے کمروں میں لے جانے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی روی سے بولے۔ "روی بیٹا! اب تم ڈرائیور یا نوکر نہیں ہو۔ تم بھی اپنے بھائی کے ساتھ مہمان خانے میں رہو گے۔ فریش ہو کر ناشتے کے لیے آ جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے چاچا جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ان بہروپیوں کی ٹولی بھی اٹھ گئی۔ روی سوچ رہا تھا کہ اتنے لوگ اس مہمان خانے میں کیسے رہیں گے۔ اس نے تینوں سیوکوں کو اپنے والے کوارٹر میں جانے کو کہا۔

ان جنوں کو کسی کمرے کی ضرورت تو تھی نہیں مگر چاچا جی اور دوسرے لوگوں کو دکھانا بھی تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بار پھر سب ناشتے کے کمرے میں جمع ہوئے۔ آشا نہیں تھی۔ چاچا جی نے ایک نوکر کو بھیج کر اسے بلا کر لانے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نوکر ہانپتا ہوا آیا اور اس نے رک رک کر جو کہا اس سے جنوں اور انسانوں سبھی کے ہوش اڑ گئے۔ روی چھلانگ لگا کر آشا کے کمرے کی طرف بھاگا۔

آشا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے ڈھیر سارا دھواں باہر نکل رہا تھا۔ روی نے تیزی سے جا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ "آشا...... آشا...... دروازہ کھولو...... آشا دروازہ کھولو۔" وہ دیوانوں کی طرح چلا رہا تھا۔

اس کی دیوانگی دیکھ کر سارے گھر والے حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ اندر سے کسی طرح کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب ہی اس انہونی سے پریشان لگ رہے تھے۔

سب کی پریشانی اپنی جگہ مگر روی کی حد سے بڑھی بے چینی کو سب ہی محسوس کر رہے اور دیکھ بھی رہے تھے۔ وکرال نے آہستہ سے جا کر روی کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اسی وقت روی کو اپنے دماغ میں وکرال کی آواز سنائی دی۔

"روی آشا کمرے میں نہیں ہے۔" روی نے چونک کر وکرال کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ خاموش لبوں سے دونوں کی بات ہو رہی تھی۔ ادھر روی دروازے کو بھی دھکا مار رہا تھا۔

"کہاں گئی آشا۔ کون لے گیا اسے؟ جلدی پتہ کر کے بتاؤ مجھے...... ورنہ جاؤ تم سب واپس اپنی دنیا میں۔" روی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

تبھی دروازہ کھل گیا۔ اب دھوئیں کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ سب اندر گھسے۔ آشا کمرے میں کہیں نہیں تھی۔ کسی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج صبح سے یہاں کس طرح کا تماشہ ہو رہا ہے۔

"روی میرے بھائی...... پتہ نہیں چل پا رہا ہے

آشا کو کون لے گیا ہے۔ یہ کسی آدمی کا کام تو نہیں ہے۔ میرے قبیلے کے سارے جنوں کو میں نے چیک کر لیا ہے۔ ان میں سے کسی نے یہ حرکت نہیں کی ہے۔" روی اور وکرال کا دماغی رابطہ جاری تھا۔

"روی! تو تھوڑا چاچا جی کو شانت کر، مجھے ان سے بات کرنی ہے۔"

"چاچا جی! آشا کے ساتھ پتہ نہیں کیا ہوا۔ جانے کہاں گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" چاچا جی کے پاس جا کر روی درد بھرے لہجے میں بولا۔ وہ دوسروں کو کیا سمجھاتا، خود اس کی دنیا اجڑی اجڑی سی لگ رہی تھی۔

"روی بیٹے! کچھ کرو جلدی، ورنہ آشا کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔" چاچا جی بھی نڈھال سی آواز میں بول رہے تھے۔

"چاچا جی! چلیے ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے آشا کسی بڑی مصیبت میں پھنس چکی ہے۔" وکرال، چاچا جی کو سمجھاتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف لے گیا۔

ایک بار پھر سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

"چاچا جی! آشا کے غائب ہونے میں مجھے کسی انسان کا نہیں بلکہ کسی غیر انسانی مخلوق کا ہاتھ لگتا ہے۔ کیونکہ بنا آگ لگائے دھوئیں کا نکلنا اور پھر دروازہ اندر سے بند رہنا اور بعد میں خود بخود کھل جانا، یہ ہمیں اور ہی سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

"کیا لگتا ہے تمہیں وکرال بیٹے؟" چاچا جی بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

"سب سے پہلے آپ لوگ یہ بتائیں، کیا پہلے کبھی آشا کی موجودگی میں آپ سب کے ساتھ کچھ عجیب طرح کی کوئی بات ہوئی تھی؟" وکرال کی بات سن کر سب چونک پڑے۔ سب کو وہ واقعات یاد آنے لگے جو چاچی جی اور سلیکھا موسی کے ساتھ

سنہری حروف

❖ زندگی کے آدھے غم انسان دوسروں سے غلط توقعات کر کے خریدتا ہے۔

❖ اچھے دوست کا ساتھ مت چھوڑو۔ خواہ وہ تمہیں چھوڑ دے۔

❖ اپنا مزاج درویشانہ رکھو مضائقہ نہیں اگر تمہارا لباس شاہانہ ہے۔

❖ صرف خدا پر بھروسہ رکھو لیکن اپنی کوشش اور محنت کو نہ چھوڑو۔

❖ خدا کی تلاش میں بھٹکنے پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھنے کی نظر میں دیکھو۔ خدا شہ رگ سے زیادہ قریب تم کو ملے گا۔

بیت چکے تھے۔

"ہاں کئی ایسی باتیں ہوئی ہیں جسے ہم معصوم آشا کے لیے بھگوان کی مرضی مان چکے ہیں۔" چاچا جی نے پوری تفصیل وکرال کو بتا دی۔ وکرال کو تو یہ سب باتیں پتہ ہی تھیں۔

"تو چاچا جی مجھے شک ہے کہ آشا کے پیچھے بہت پہلے سے کوئی جن پڑا ہوا تھا۔ آج شاید وہی آشا کو اٹھا کر لے گیا ہے۔"

یہ سن کے گھر والے ڈر سے کانپ اٹھے۔ چاچی جی اور سلیکھا موسی کو تو پہلے سے اس بات کا شک تھا۔ وکرال انہیں اس معاملے میں بہت ہوشیار لگا۔ اس کی باتوں پر سب یقین کر رہے تھے۔

روی چپ چاپ بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا۔ اسے وکرال کی اس لمبی ڈرامے بازی سے بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ جلد سے جلد وکرال کو ساتھ لے کر آشا کی تلاش میں نکل پڑے۔

وہ تو یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ آشا جیسی نازک لڑکی جانے کس حال میں ہوگی۔ بھلے ہی وہ

دونوں الگ الگ کمروں میں رہتے تھے' لیکن ایک گھر میں ہیں' اس بات سے ہی انہیں سکون رہتا تھا۔ پریم کی ڈور سے وہ ایک دوسرے ایسے بندھ چکے تھے کہ ایسی دوری کے بارے میں تو کبھی سوچ ہی نہیں پائے تھے۔

ایشور کی لیلا بھی عجیب ہے۔ بچپن سے دکھوں کو اپنا ساتھی بنا کر زندگی گزار رہی آشا کو جب خوشیاں ملنے کا وقت آیا تو کسی کی نظر لگ گئی۔

"چاچا جی' میرے اور روی کے گرو ہیں استاد الوکھ۔ انہیں جنوں کے بارے میں پوری جانکاری ہے۔ بلکہ کئی جن تو ان کے قبضے میں بھی رہتے ہیں۔ میں فوراً انہیں بلاتا ہوں۔ آپ سب فکر نہ کریں۔ آشا کو کہیں سے بھی ہم کھوج کر آپ کے پاس لے آئیں گے۔"

استاد الوکھ کا نام سن کر سلیکھا موسی چونک پڑیں۔

"موا...... وہی ہے کیا؟" گھبراتے دل کے ساتھ وہ سوچ رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں انہوں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔

"بیٹا وکرال...... جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔" چاچا جی کمزور سے لہجے میں بولے۔

"سب سے پہلے آپ دو بڑے کمرے ہمیں دے دیں۔ استاد الوکھ اپنا عمل سب کے بیچ میں نہیں کریں گے۔ انہیں تنہائی چاہیئے۔ میں نے انہیں خبر کردی ہے۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔"

"وکرال اور روی کو ایک بڑا کمرہ مل گیا۔ دو سیوک ان دونوں کے روپ میں کمرے میں آگئے اور وہ دونوں چل پڑے آشا کی تلاش میں۔

اگلے پل روی اور وکرال بابا سکندر کے مہمان خانے میں بیٹھے ان سے باتیں کررہے تھے۔

"تم دونوں تھوڑی دیر رکو۔ سردار راج دلیش اور ان کی بیٹی وچترا یہاں آئے ہوئے ہیں' تھوڑی دیر میں وہ اپنے قبیلے واپس جانے والے ہیں۔"

روی کے لیے ایک ایک پل گزارنا بھاری پڑ رہا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔

روی سردار راج دلیش اور ان کی بیٹی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی ماں کا بچپن میں ہی دیہانت ہوچکا تھا۔ اور دونوں سرداروں کی دوستی کی وجہ سے وچترا کے بچپن کا زیادہ تر حصہ یہیں گزرا تھا۔ وکرال' روی اور وچترا ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ وچترا جن زادی ہونے کی وجہ سے روی کو بہت تنگ کیا کرتی تھی۔ لیکن ان کے بیچ کی دوستی میں کوئی کمی نہیں آپائی تھی۔

بڑی ہونے پر بھی اس کی شرارتوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ دونوں قبیلے کے سرداروں کی وہ لاڈلی تھی۔ اس کی شرارتوں کا سب مزا لیتے تھے۔ کسی کو کچھ برا نہیں لگتا تھا۔

مگر روی کو تو وہ کچھ زیادہ ہی تنگ کیا کرتی تھی۔ اس کی بدمعاشیوں سے کبھی کبھی روی چڑ بھی جاتا تھا۔

بڑی ہونے پر تو وہ روی کو صاف صاف کہہ دیتی تھی کہ "میں تو تجھ سے ہی شادی کروں گی اور تجھے بھگا کر اپنے گھر لے جاؤں گی۔"

"چل ہٹ چھپکلی...... تجھ سے کون شادی کرے گا۔" روی غصے میں اسے جواب دیتا۔

اس کے جواب میں وہ روی کو کئی طرح سے تنگ کرتی۔ کبھی ہوا میں کافی اونچائی پر لٹکا دیتی' روی ہوا میں جھولتا ہوا غصے میں کھولتا رہتا اور نیچے کھڑے وکرال اور وچترا خوب ہنستے۔

روی کے حد سے غصہ ہونے پر وہ اسے منا بھی لیتی۔

(باقی آئندہ ماہ)



رشتہ

احمد صغیر احمد

**دیار غیر میں کسی ہم زبان اور ہم وطن کا مل جانا کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔
مگر کبھی کبھی یہ نعمت عذاب کی شکل بھی لے لیتی ہے۔
ایک دوسر باز کا قصہ' اس کے دل میں وطن کی محبت نہیں دولت کی چمک کا بسیرا تھا۔**

بینک کے ایئر کنڈیشنڈ اندرونی ماحول سے باہر نکل کر وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا۔ اس نے دو ایک بار آنکھیں پٹ پٹا کر باہر بکھری ہوئی دھوپ کو دیکھا۔ یہ اس کا ہمیشہ کا دستور رہا تھا۔ وہ برسوں سے اسی طرح کر رہا تھا۔ اس وقت سے جب سے وہ پورٹو ریکو کے گرم علاقے سے نیو یارک جیسے بڑے شہر میں وارد ہوا تھا۔ ایسے وقت میں اس کے آبائی وطن کی یادیں اکثر ابھر آتی تھیں لیکن وہ انہیں جلد ہی ذہن سے نکال کر سڑک پر رواں ہوجاتا تھا۔

آج بھی اس نے ان یادوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور پھر چل پڑا۔ چلتے چلتے رومین نے محسوس کیا کہ آج کی سہ پہر خاصی خوب صورت ہے۔ اس شہر میں وہ ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ قسمت نے ساتھ دیا تھا۔ اب وہ ایک بہتر مقام پر تھا۔ اس کا ایک گھر تھا' بیوی تھی' بچے تھے اور ایک اچھی ملازمت بھی کر رہا تھا۔ وہ ہر ہفتے ملنے والی تنخواہ سے اپنے سیونگ اکاؤنٹ میں کچھ رقم جمع کرالیا کرتا تھا۔ اس کا بینک اکاؤنٹ اسی لیے معقول تھا۔ ایک معنوں میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کے مقابلے میں وہ زیادہ خوش حال تھا۔

اسے پتا تھا کہ اس کے وطن کے لوگ گروہ در گروہ نیو یارک میں وارد ہوتے رہتے ہیں تاکہ اچھی زندگی تلاش کرسکیں۔ ان کے جسموں پر سوائے کپڑوں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اتنے مفلوک الحال ہوتے تھے کہ سردیوں کے دنوں میں بعض اوقات گزارے کے لیے انہیں اپنے کپڑے تک فروخت کرنے پڑتے تھے۔ اس کے بعد وہ سردی میں ٹھٹھرا کرتے تھے۔

اس وقت بھی رومین کو سڑک پر چند ایسے افراد نظر آرہے تھے پھر اس کی نگاہ ایک خاص شخص پر جم کر رہ گئی۔ یہ منحنی قد کا سخت چہرے والا آدمی تھا۔ وہ ایک دراز قامت' خوش لباس امریکی کے پاس کھڑا ہوا اس سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ رومین جب ان کے نزدیک ہوا تو اس نے سنا۔ منحنی اجنبی اسپینی زبان میں جو اس کے وطن کی زبان تھی امریکی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جب کہ امریکی اپنے شانے اچکا کر یہ تاثر دے رہا تھا کہ اسے اسپینی نہیں آتی اور وہ اس کی کوئی بات نہیں سمجھ رہا ہے۔

جب رومین ان کے پاس سے گزرنے لگا تو امریکی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے اچانک پوچھا۔ "کیوں مسٹر' تمہیں اسپینی آتی ہے؟"

رومین ٹھٹک گیا۔ رکتے ہوئے اس نے بھویں اٹھاتے ہوئے امریکی کو دیکھا اور کہا۔

''ہاں! کیا بات ہے۔''

''خوب۔'' امریکی نے کہا۔ ''یہ آدمی کچھ کہہ رہا ہے۔ ذرا بتانا مجھے کیا چاہتا ہے۔''

رومین نے منحنی اجنبی کو دیکھا اور اس سے اسپینی میں باتیں کرنے لگا۔ اسے اسپینی بولتے دیکھ کر اجنبی کا چہرہ کھل گیا۔ اس نے رومین کے دونوں ہاتھوں کو التجائی انداز میں پکڑتے ہوئے کچھ بولنا شروع کر دیا۔

آخر کار رومین کو پتا چل گیا کہ اجنبی کا نام الفریڈو ہے۔ وہ نیو یارک میں نیا نیا آیا تھا۔ اسے انگلش نہیں آتی تھی۔ اس کے پاس رقم ختم ہو گئی تھی اور اب وہ اپنی کچھ ذاتی اشیاء فروخت کرنے کا خواہش مند تھا۔ تاکہ اپارٹمنٹ کا کرایہ ادا کر سکے جو کہ سڑک کے اس پار ہی تھا۔ الفریڈو نے سڑک کے دوسرے کنارے پر بنی عمارت کی ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک کھلی کھڑکی سے چند بچے انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

رومین نے یہ باتیں امریکی کو بتا دیں۔ خوش لباس امریکی نے ایک لمبی سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے' پوچھو' کیا بیچنا چاہتا ہے یہ؟''

رومین نے الفریڈو سے اسپینی میں دریافت کیا الفریڈو نے تیزی سے چند جملے کہے پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب سے ہاتھ باہر نکلا تو اس میں ایک جیبی گھڑی دبی ہوئی تھی۔ یہ خاصی بھاری بھرکم تھی اور لگتا تھا کہ یہ خالص سونے کی بنی ہوئی ہے۔

امریکی نے گھڑی لے کر اسے ہاتھ میں تولا پھر کان سے لگا کر اسے سنا اور رومین سے بولا۔ ''اس سے کہو میں اس کے لیے اسے دس ڈالر دے سکتا ہوں۔''

رومین کو امریکی پر تھوڑا سا غصہ محسوس ہوا۔ بلا مبالغہ یہ گھڑی اس سے کہیں زیادہ مالیت کی تھی۔ تاہم رومین نے یہ بات اجنبی کو بتا دی۔ الفریڈو فوراً رضا مند ہو گیا تھا تو بھنا کر رومین نے اس کو سمجھانے کی بھی سعی کی لیکن اجنبی نے کہا کہ اسے اس وقت رقم کی سخت ضرورت ہے پھر سودا ہو گیا۔ امریکی نے گھڑی لے لی اور الفریڈو نے دس ڈالر کا نوٹ لے لیا۔ رومین نے برا مناتے ہوئے رخ بدلا اور چل دیا لیکن اسے امریکی نے فوراً ہی روک لیا۔ ''ذرا اس سے پوچھنا اس کے پاس بیچنے کے لیے کوئی اور چیز بھی ہے۔''

رومین نے الفریڈو تک یہ بات پہنچائی تو اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اس نے عجلت سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اس نے ایک دوسری جیب سے ایک چھوٹا سا لیدر بیگ برآمد کیا۔ اس نے بٹوا کھولا اور اس میں سے تمام اشیا کو ہتھیلی پر الٹ دیا۔ پہلی ہی نظر میں رومین اور امریکی دونوں ہی ششدر رہ گئے کیونکہ الفریڈو کی ہتھیلی پر چند چھوٹے چھوٹے ہیرے جگمگا رہے تھے۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملے؟'' رومین نے عجلت سے پوچھا۔

''یہ ہیرے ہیں۔'' الفریڈو نے کہا۔ ''میری ماں کے ہیں یہ۔''

''کیا تم انہیں چرا کر لائے ہو۔'' رومین نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

منحنی الفریڈو نے فخر سے سر بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''مرتے وقت انہیں میری ماں نے مجھے دیا تھا۔'' اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔ ''اس تذکرے پر کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اس کے انتقال کو پانچ ماہ ہو چکے ہیں۔''

پھر اس سے قبل کہ رومین مزید کچھ کہتا امریکی نے عجلت سے کہا۔ ''پوچھو کیا یہ انہیں بیچنا چاہتا ہے۔''

رومین نے اثبات میں سر ہلایا تو امریکی نے الفریڈو کے ہاتھ پر دھرے پتھروں پر ایک غائر نظر ڈالی اور مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اصلی اور نقلی پتھروں میں تمیز نہیں کر سکتا۔'' وہ رومین کی سمت مڑا۔ ''مسٹر میں ادھر کا نہیں ہوں۔ کنکٹی کٹ سے آیا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے ادھر کہیں کوئی اچھا جوہری ہے؟''

رومین نے چند لمحوں سوچا پھر اسے یاد آ گیا۔ وہ الفریڈو اور امریکی کو لے کر سڑک کی ایک جانب چل پڑا۔ ادھر ایک جوہری کی دکان تھی اور رومین اسے جانتا تھا۔

جوہری نے الفریڈو کے ہیرے دیکھے۔ ان کا معائنہ کیا پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے رومین سے کہا۔ ''دوست میرے خیال میں ان کی کم سے کم مالیت بھی دس ہزار ڈالر تو ہو گی ہی۔''

پھر وہ لوگ دکان سے نکل آئے اور فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ رومین نے تاسف سے منحنی الفریڈو کو دیکھا جو بے چارہ کرایہ اور خوراک کے سلسلے میں پریشان تھا حالانکہ اس کے پاس ہزاروں ڈالر کے ہیرے موجود تھے۔ رومین نے پھر امریکی کو بتایا کہ جوہری نے ان کی قیمت کا کیا تعین کیا ہے پھر اس نے الفریڈو سے پوچھا کہ وہ

دیوالی کی صفائی

ابا (سجاد ظہیر) دستاویز سنبھالنے میں ماہر تھے اور چھوٹی سی لال ڈائری میں اس سے چھوٹی گھومنے والی سنہری پنسل سے اس سے بھی چھوٹی لکھائی میں کاغذوں کا اتا پتا درج کرتے رہتے تھے۔ ہزاروں کاغذوں کے ڈھیر میں سے وہ کھوئے ہوئے دستاویز کا یوں پتا لگا لیتے جیسے دور تک پھیلے کیچڑ میں کوئی بنگالی مچھوارا دبے ہوئے کچھوے کو تلاش کر لیتا ہے۔

امی کا یہ عالم تھا کہ تین مہینے میں ایک بار انہیں اپنی میز اور درازیں صاف کرنے کا خیال آتا ہے۔ صفائی کا ان کا عجیب طریقہ تھا۔ کاغذ پھینکتی نہیں تھیں انہیں پھاڑ دیتی تھیں اور صاحب کیا تیزی دکھاتی تھیں پھاڑنے میں۔ یہ اٹھایا وہ پھاڑا' وہ اٹھایا یہ پھاڑا۔ اکثر بے کار کے کاغذ کم اور کام کے زیادہ پھاڑتیں۔ ایک بار تو لفافے کے تین سو سو کے نوٹ بھی پرزہ پرزہ ہوئے ابا ان کے صفائی کے دورے کی بھنک ملتے ہی وہ اپنے سارے اپائنٹ منٹ کینسل کر کے اپنے پڑھنے لکھنے کے کونے میں جم جاتے۔ امی آتیں' فائلیں کھسکاتیں' ایک آدھ کاغذ اٹھاتیں' یہاں بھی صفائی ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔ یا۔ سنتے ہو؟ یہ سب کاغذ کام کے ہیں کیا۔ جیسے ٹوہ لینے والے فقرے ابا کی طرف اچھالتیں۔ بس' ہوں میں جواب دیتے' کہنے کو وہ کچھ پڑھ رہے ہوتے پر ان کی نظریں امی پر ہوتیں اور جہاں ان کی انگلیاں فائل کھولنے کو ہوتیں کہ وہ ٹوکتے' ارے ارے' یہ سب اگلے سیمینار کے کاغذات ہیں' یا' ارے نہیں ابھی نہ چھونا' ایک آرٹیکل میں ان کی ضرورت ہے' آخر میں امی بڑبڑائی ہوتیں۔

اس گھر میں تو دیوالی کی سالانہ صفائی بھی نہیں ہوتی' ہتھیار ڈال دیتیں۔

(انتخاب ہے جناب انور سجاد ظہیر صاحب کی کتاب میرے حصے کی روشنائی سے)

ان ہیروں کے لیے کتنی رقم لینا پسند کرے گا؟" الفریڈو نے کہا۔ "میں انہیں دو ہزار ڈالر میں دے دوں گا۔"

رومین ساکت ہو کر رہ گیا۔ پھر جب اس نے امریکی کو مطلع کیا تو امریکی کی آنکھیں ایسے سستے سودے پر چمکنے لگیں۔ خود رومین کو خواہش محسوس ہوئی کہ وہ اتنے مہنگے ہیرے اتنے کم داموں لے لے۔ یہ ایک بہترین سودا تھا۔ وہ انہیں دوبارہ بیچ کر کافی رقم منٹوں میں کما سکتا تھا۔

تبھی امریکی نے اسے خیالوں سے چونکا دیا۔ "یہ جوہری! کیا یہ قابل اعتماد آدمی ہے۔"

"بالکل۔" رومین نے کہا۔ "یہ میرا واقف بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے میرا بینک میرے شہر میں ہے۔ میرے پاس اس وقت دو ہزار نہیں ہیں لیکن میں یہ سودا گنوانا نہیں چاہتا اس سے پوچھو کیا کل تک میرا انتظار کر سکتا ہے؟"

رومین نے الفریڈو کو آدمی کی بات سے آگاہ کیا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ وہ انتظار نہیں کر سکتا۔ اسے رقم کی فوری ضرورت ہے۔

جب رومین نے یہ بات امریکی کو دہرائی تو وہ سوچ میں ڈوب گیا پھر وہ جلدی سے بولا۔ "یہ ہیرے تم خرید لو۔ ان میں سے آدھے ہیرے میں تم سے ہزار ڈالر ادا کر کے واپس لے لوں گا۔"

"لیکن خود میرے پاس بھی رقم نہیں ہے۔" رومین نے اسے بتایا۔ "تم رقم کہیں سے حاصل تو کر سکتے ہو۔" امریکی نے پوچھا۔

رومین کی جیب میں چیک بک موجود تھی۔

"ہاں" سوچتے ہوئے اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" امریکی نے بے صبری سے کہا۔ "تم جلدی کرو اور یہ ہیرے لے لو۔" رک کر اس نے رومین کو گھورا اور جمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن یاد رکھنا ان میں سے آدھے میرے ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی چکر بازی نہیں پسند کروں گا۔"

بے شک ابھی کچھ دیر قبل وہ امریکی کو برا اور اجنبی کو مجبور سمجھ رہا تھا۔ لیکن یکا یک اس کا ضمیر جیسے سو گیا۔ معقول رقم ہاتھ آ رہی تھی۔ اس نے ہیرے خریدنے کا فیصلہ کر لیا پھر اس نے بینک سے رقم نکلوائی ہیرے الفریڈو سے لے لیے اسے دو ہزار ڈالر ادا کرنے کے بعد امریکی سے ملنے کا وعدہ کیا تا کہ آدھے ہیرے اسے دے سکے پھر رومین نے گھر کی راہ لی۔ اس نے ہیروں کی تھیلی احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔

رات بھر رومین اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دراصل رہ رہ کر اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ جب وہ بھی انہی سڑکوں پر مفلوک الحالی میں پھرتا رہتا تھا۔ اسے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ اپنے ایک مجبور ہم وطن کے ساتھ اس نے ایک سخت غلط حرکت کی ہے۔ یہ سودا نہ تھا یہ تو ایک ڈاکا تھا۔ اس نے ایک شخص کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور پھر کیسے شخص کی مجبوری سے ایسے شخص کی مجبوری سے جسے اس نے اپنا سمجھ لیا تھا اپنا بھائی سمجھا تھا کیونکہ وہ اس کی زبان جانتا تھا۔ اسی کا ہم وطن تھا۔

صبح تک اس نے فیصلہ کر لیا۔ بلا شبہ سارا قصور امریکی کا تھا۔ یہ امریکی اس کے ہم وطن سے ناجائز فائدہ اٹھانے جا رہا تھا اور رومین سے تو بس اس قدر خطا ہوئی تھی کہ وہ لالچ کے اس بھنور میں کسی طرح پھنس گیا تھا۔ بہر حال اب اس کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ امریکی کو اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ امریکی سے نہیں ملے گا۔ وہ اس لوٹ مار میں قطعاً حصہ داری کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ الفریڈو کے پاس اس کے اپارٹمنٹ میں جائے گا جو سڑک کے کنارے تھا۔ جہاں سے بچے جھانک رہے تھے۔ پھر وہ یہ ہیرے اسے دے کر اس سے اپنی رقم واپس لے گا اور الفریڈو کو اپنے جوہری کے پاس لے جائے گا تا کہ اسے ان ہیروں کی صحیح قیمت دلا سکے۔

پھر وہ چل پڑا۔ جب وہ اس عمارت میں پہنچا جہاں الفریڈو کی رہائش تھی تو اسے پتا چلا کہ وہاں کے لوگ کسی الفریڈو کو نہیں جانتے۔ پریشان ہو کر وہ اپنے جوہری کے پاس چل دیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ بٹوے میں رکھے ہوئے ہیرے نقلی ہیں بے قیمت پتھر اور تب اسے احساس ہوا کہ امریکی اور الفریڈو کے درمیان جابر و مجبور کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ بلکہ یہ رشتا تو دراصل اس کے اور ان دونوں کے درمیان تھا۔ یقیناً یہ ان دونوں کی ملی بھگت تھی اور پھر الفریڈو نے سودے کے وقت یقیناً تھیلی بدل دی تھی۔



فرار

ڈاکٹر وجاہت علی خان

قید سے فرار ہر موت کے قیدی کی پہلی اور آخری تمنا ہوتی ہے اور وہ اس تمنا کی تکمیل کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتا ہے مگر اسے عمر قید ہوئی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ سزا کی تکمیل کے بعد اس کی زندگی کا روشن دور اختتام کو پہنچ چکا ہوگا۔ اس لیے فرار اس کے لیے بہت ضروری تھا۔

ایک بے چین روح کی روداد اس کے ذہن میں انتقام کا خناس سمایا ہوا تھا

پورا دن لمبا آرلوف بے چینی کے عالم میں کال کوٹھری میں ٹہلتا رہا تھا۔ آج اس کے خیالات اتنے ہی بھیانک اور تاریک تھے۔ جتنی کہ ماحول پر چھائی ہوئی تاریکی' باہر سخت طوفان تھا۔ تیز ہواؤں کی بھیانک آوازیں کوٹھری کی موٹی موٹی دیواروں سے ٹکرا کر ایک بھیانک ماحول کو اور بھی بھیانک بنائے دے رہی تھیں۔ ہوا کا ایک تیز جھکڑ آیا اور پانی کے کچھ قطرے آرلوف کے چہرے کو نم کر گئے۔ آرلوف نے قطروں کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہ اپنی لمبی لمبی انگلیوں پر ٹھہر گئی۔ وہ انگلیاں جن کی ذرا سی حرکت کے باعث آج وہ موٹی موٹی دیواروں والی کوٹھری میں طویل عرصے کے لیے قید کر دیا گیا تھا آج ہی تو اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس کو اپنی انگلیوں سے مقتول کے خون کی بوندیں ٹپکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مقتول کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس کی نگاہوں میں پھر گئیں۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ سزائے موت سے بچ جانے کے بعد عمر قید کا تحفہ اسے مل چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ آرلوف قطعی دوسرے موڈ میں تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس قید خانے سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ کسی کو حق نہیں کہ اس کی آزادی اس سے چھین سکے۔ وہ بے قصور تھا۔ اسے آزاد رہنے کا حق تھا۔ انتقام کا شدید جذبہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ وہ ان لوگوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کی تباہی کا باعث بنے تھے۔ وہ ایک بار پھر، حال میں آزادی حاصل کرے گا کوٹھری کی تنہا میں اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ قاتل کس طرح بنا تھا۔ حقیقتاً وہ بے گناہ تھا۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ مقتول جو ایک بدمعاش تھا۔ ایک بااثر آدمی تھا۔ اس کے باپ کا قتل اسی کے ہاتھوں ہوا تھا لیکن قصبہ کا کوئی شخص اتنی جرأت نہ رکھتا تھا کہ اس کے خلاف گواہی دیتا اور اس طرح وہ صاف بچ نکلا تھا۔

ایک دن جب وہ اپنے کھیتوں سے واپس لوٹ رہا تھا تو راستے میں اسی بدمعاش نے اس کا راستا روک لیا تھا اور فصل کی ساری آمدنی جو آرلوف کو آج ہی ملی تھی حوالے کرنے کو کہا تھا۔ آرلوف کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ تھیلا ایک طرف رکھ کر اس نے بدمعاش کے ایک زوردار ہاتھ رسید کیا تھا۔ بدمعاش اس غیر متوقع حملے سے گھبرا کر دوسری طرف پلٹ گیا اور جب وہ دوبارہ اٹھا تو چمکدار خنجر اس کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔ پھر نہ جانے کس طرح آرلوف کے ہاتھوں میں اس کی

ا آ گئی تھی اور وہ اسے اس وقت تک دباتا ہی گیا تھا۔ جب تک کہ بدمعاش کی آنکھیں حلقوں سے باہر نہ آ گئیں۔

خون کی ایک دھار اس کے حلق سے بہہ نکلی تھی۔ بستی کے لوگوں نے آرلوف کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ ساری گواہیاں اس کے خلاف تھیں۔ اس نے تو اپنے دفاع کے لیے اس کی گردن دبائی تھی لیکن لوگوں نے یہ گواہی دی کہ آرلوف کی اس سے پرانی دشمنی تھی۔ جس کی بنا پر اس نے ایسا کیا تھا۔ آخرکار اسے عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

وہ ان تمام لوگوں کو قتل کر دینا چاہتا تھا جو اس کی تباہی کا باعث بنے تھے اور اس کی صرف ایک صورت تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح قید خانے سے فرار ہو جائے۔ غصے کے عالم میں وہ تیزی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سختی سے بھینچ کہ خون کے قطرے انگلیوں کے پوروں پر نمایاں ہو گئے۔ اچانک...... روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا اور ساتھ ساتھ تیز قسم کی گھڑگھڑاہٹ بھی یقیناً باہر کہیں بجلی گری تھی۔ آرلوف نے آج تک کوٹھری میں بھی اتنی تیز روشنی نہ دیکھی تھی۔ اس کی نگاہیں دیوار کے ایک بڑے پتھر پر جم گئیں۔ پتھر کے گرد دیوار پر سیمنٹ اکھڑا ہوا تھا۔ وہ بے قراری سے دیوار کے اس حصے کی طرف بڑھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس جگہ کا بغور جائزہ لینے لگا جہاں پلاسٹر اکھڑا ہوا تھا۔ اس کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔ پتھر کے گرد دراڑیں تھیں اور وہ اپنی جگہ پر کافی ڈھیلا تھا جھٹکا دے کر اس نے پتھر کو اپنی جانب کھینچا۔ پتھر کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیوں کا گوشت بھی ادھڑ گیا تھا۔ پسینہ اس کے ماتھے پر بہہ رہا تھا۔ آہستگی سے اس نے پتھر کو مزید ہٹایا اور تاریکی میں دوسری طرف دھکیل دیا۔ اچانک ایک بار پھر روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا اور پھر اسے اپنی نگاہوں پر بہ مشکل ہی یقین آیا تھا۔ چٹان میں ایک تنگ سرنگ کی شکل کا راستا چلا گیا تھا۔

زمین پر اسے کاغذ کا ایک پرزہ ملا۔ کانپتی انگلیوں سے تھامے اسے کھڑکی میں لایا اور نیچے کورٹ کے احاطے میں جلتے لیمپ کی مدھم روشنی میں اس تحریر کو پڑھنے کی کوشش کی۔ کاغذ پر گاڑھی سرخ روشنائی سے ایک پیغام تحریر تھا۔ اس وقت آرلوف کو اپنے پڑھنے کی پہلی مرتبہ خوشی ہوئی۔

دانش مندی

☆ صرف بزرگوں کی یاد منانے سے بزرگوں کا فیض ہی نہیں ملتا۔ بزرگوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے بات بنتی ہے۔

☆ میں یہ دعا نہیں کرتا کہ دشمن مر جائے۔ میں یہ دعا کرتا ہوں کہ دوست زندہ ہو جائیں۔

☆ شہر بھرے کے بھرے رہتے ہیں لیکن ہر دس سال بعد چہرے تبدیل ہو جاتے ہیں۔

☆ دعا یہ مانگنی چاہئے کہ اتنا کرم نہ ہو کہ ہم اس کی یاد سے غافل ہو جائیں اور اتنا ستم نہ ہو کہ ہم اس کی رحمت سے مایوس ہو جائیں۔

☆ انسان تب مکمل ہوتا ہے جب وہ اپنی تخلیق کا مطلب جان لیتا ہے۔

☆ جب ماں سے ڈانٹ پڑے تو اس کے لہجے کی سختی نہ دیکھ۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں دیکھ۔ وہاں تجھے لہجے کی نہیں محبت کی نرمی نظر آئے گی۔

☆ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے محبت نہیں آتی جبکہ میرا پیغام ہی محبت ہے اور مجھے اس سے محبت ہے جو محبت سے محبت کرتا ہے۔

معلومات

= تقریباً دو سو سال سے تھائی لینڈ آزاد ملک ہے۔
= قرآن شریف میں حرف تہجی ''ض'' ایک ہزار تین سو سات مرتبہ استعمال ہوا ہے۔
= قائداعظم محمد علی جناح نے ''وقف املاک'' کے ضمن میں مسودہ قانون 1911ء میں پیش کیا تھا۔

کیچڑ دیکھیں یا ستارے

کھلے منٹ اسٹون کہتے ہیں کہ لوگوں میں معمولی فرق ہوتا ہے لیکن یہ معمولی فرق بہت بڑا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ معمولی فرق رویے کا فرق ہے اور بہت بڑا فرق یہ ہے کہ رویہ مثبت ہے یا منفی۔

اس اصول کی کہیں بھی اتنی اچھی مثال موجود نہیں جتنی ایک نوجوان دلہن کی کہانی میں ہے۔ اس دلہن کا امریکہ کے مشرقی علاقے سے تعلق تھا۔ یہ خاتون اپنے شوہر کے ساتھ کیلی فورنیا کے صحرا میں واقع فوجی کیمپ تک گئی۔ اس دور دراز علاقے میں زندہ رہنے کے لیے معمولی سہولتیں بھی نہ تھیں۔ شوہر نے یہ بات اسے پہلے ہی سمجھا دی تھی۔ لیکن اس نے جانے پر اصرار کیا۔

خاتون کو یہاں رہنے کے لیے مقامی انڈین لوگوں کی بستی کے قریب شکستہ حال جھونپڑی ہی مل سکی۔ یہاں دن کے وقت گرمی ناقابل برداشت تھی اور تمام وقت گرم ہوا چلتی رہتی تھی۔ یہاں صرف انڈین باشندے رہتے تھے جنہیں انگریزی نہیں آتی تھی۔ جب اس خاتون کے شوہر کو مزید مشقوں کے لیے آگے جانا پڑا' تنہائی اور مشکل حالاتِ زندگی خاتون کے لیے مصیبت بن گئے تو اس نے ماں کو خط لکھا کہ میں واپس آ رہی ہوں۔ میں یہاں مزید نہیں رہ سکتی۔ جلد ہی اسے خط کا جواب موصول ہو گیا جس میں لکھا تھا۔ ''دو آدمیوں نے جیل سے باہر دیکھا۔ ایک کو کیچڑ دکھائی دی اور دوسرے کو ستارے۔''

خاتون نے ان لفظوں کو پڑھا اور بار بار پڑھا اور اسے بڑی شرم محسوس ہوئی۔

خاتون نے مقامی باشندوں سے میل جول بڑھانا شروع کیا۔ اس نے ان لوگوں سے کپڑا بننے اور برتن بنانے کا فن سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ شروع میں تو مقامی باشندوں نے جھجک محسوس کی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے دوستی کی پیشکش کا جواب دوستی سے دیا۔ خاتون کو ان لوگوں کا رہن سہن' ثقافت' تاریخ غرض ہر چیز بہت دلچسپ لگی۔ اس نے صحرا کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ دور افتادہ صحرا بھی اپنے اندر بے پناہ حسن رکھتا ہے۔ اس نے اپنی ماں سے صحرا سے متعلق کتابیں منگوائیں۔ یہاں پیدا ہونے والے عجیب و غریب پودوں' درختوں کا مطالعہ کیا۔ اس نے صحرا سے تین لاکھ سال پرانی سیپیاں جمع کیں کیونکہ کسی زمانے میں یہاں سمندر ٹھاٹھیں مارا کرتا تھا۔ بعد میں اس عورت نے اس علاقے کے بارے میں ماہر کی حیثیت حاصل کی اور ایک کتاب بھی لکھی۔

وہ کون سی چیز تھی جس نے اس عورت میں یہ انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ حالانکہ صحرا اور باشندے وہی تھے۔ یہ تبدیلی اس کے رویے کی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی نے ایک تلخ تجربے کو ایک بہت مفید اور شاندار تجربے میں بدل دیا۔

کاغذ پر تحریر تھا۔

''میں اس راستے سے فرار ہو رہا ہوں۔ میرے بعد یہ پیغام جو بھی پائے میری خوش قسمتی کی دعا کرے۔'' یکایک باہر سنتری کے قدموں کی آواز گونجی۔ آرلوف نے پتھر اپنے جسم کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ آرلوف گھبرا گیا۔ لیکن قدرت

نے اس کی یہ مشکل جلد ہی آسان کر دی۔ سنتری نے اس کی کوٹھری میں نہیں جھانکا تھا اور اب اس کے قدموں کی بازگشت دور ہو رہی تھی۔ آرلوف نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ وقفہ گزر جانے کے بعد اس نے پہلے شگاف میں اپنے سر ڈالا اور پھر بقیہ جسم۔

سرنگ نما راستے کی دیواریں نہایت تنگ تھیں۔ کیچڑ اور پھپھوندی دیواروں پر جمی ہوئی تھی۔ آرلوف گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگ رہا تھا۔ سرنگ میں ابھرے خاردار پتھر اس کے جسم کو لہو لہان کر رہے تھے لیکن آرلوف ان تمام مشکلات کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک تیزی چمک تھی۔ زندگی حاصل کرنے کی چمک اور ذہن میں صرف ایک بات...... فرار...... صرف فرار......!

ایک مگر مچھ کی طرح کیچڑ میں ناخن گاڑھتا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے ڈھلوان بڑھتی جا رہی تھی دیواریں بہت ہی زیادہ پھسلنی ہو چکی تھیں اور اب آرلوف کے لیے مزید آگے بڑھنا محال نظر آ رہا تھا۔ خاردار چٹانیں اس کے جسم پر جابجا زخم ڈال چکی تھیں اور زخموں سے سرخ سرخ خون رس رہا تھا۔ اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔ کافی دیر سے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن راستا ختم ہونے ہی نہ پا رہا تھا۔ تاریکی بھی مزید بڑھ گئی تھی۔

آرلوف ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس خیال سے کہ اب واپس ہو جانا قطعی ناممکن ہے۔ خوف کی ایک لہر سر سے پیر تک اس کے جسم میں سرائیت کر گئی لیکن ایک انجانی قوت کے تحت اس نے ہمت کر کے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

علم' دولت اور عزت

علم' دولت اور عزت کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد جدا ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم اپنا اپنا پتہ دیتے ہیں تاکہ اگر کسی سے ملنے کو دل چاہے تو مل لیں۔ سب سے پہلے علم بولا۔ ''اگر مجھ سے ملنا چاہو تو فہم و فراست و دانش ور لوگوں کی مجلس میں تلاش کر لینا۔''

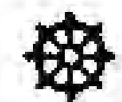
دولت بولی۔ ''اگر مجھ سے ملنا ہو تو بادشاہوں کے دربار میں ڈھونڈ لینا۔''

عزت ان دونوں کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔ اس کی خاموشی دیکھ کر دونوں بولے۔ ''ارے عزت! تو بھی کچھ بتا۔'' تو عزت نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

''اگر میں ایک مرتبہ چلی جاؤں تو لوٹ کر نہیں آتی۔''

سرنگ اب شاید مڑ رہی تھی اور مزید ڈھلوان ہو چلی تھی۔ کچھ فاصلہ پر ذرا سے روشنی کا ایک جھما کا نظر آیا کیا یہ بجلی کی چمک تھی؟ اپنی کامیابی کے تصور سے ایک نئی طاقت اس کے جسم میں عود کر آئی۔ کچھ دیر بعد وہ باہر ہو گیا۔ آزاد...... قطعی آزاد۔

لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ڈھلوان بڑھتا جاتا لیکن آرلوف اب اس مختصر سے فاصلہ کو پلک جھپکتے ہی طے کرنا چاہتا تھا۔ تاریکی نے اس کی بینائی کو ختم کر دیا تھا۔ دفعتاً آرلوف کا سر کسی ٹھوس شے سے بری طرح ٹکرایا اور کچھ دیر کے لیے اس کا ذہن مردہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب آرلوف نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اس کی جان ہی نکل گئی تھی۔ ایک کرب ناک چیخ اس کے منہ سے نکلی تھی۔ سرنگ کے دہانے پر لوہے کا ایک نہایت مضبوط جنگلہ جما ہوا تھا اور پاس ہی ایک مردہ شخص کا ڈھانچہ......!



قسط نمبر 6



حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی انسانوں کو عجیب تماشے دکھاتی ہے جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہوکر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی باگیں موڑ دیں حالات کا رخ تبدیل کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں امر ہوکر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت' اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھردیا لیکن اس نے وقت کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

سطر سطر تجسس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی دلچسپ و دلکش سلسلے وار کہانی

یہ سوال سنسنی خیز ہونے کے ساتھ ہی خطرناک بھی تھا۔ جانے والا گرے ہائی روف کے ساتھ جاچکا تھا اور بنگلے کا کھلا ہوا گیٹ ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ اس آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا جس کی تعبیر اس کے برعکس لے لی جاتی۔ مجھے اپنے پہلو میں مراد کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یہ کون ہوسکتا ہے......؟"

"بنگلا تمہارا ہے تم اس کے نگران ہو اور پوچھ مجھ سے رہے ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں پتا ہونا چاہیے' یہ کون تھا اور کس مقصد سے ہائی روف لے کر کہاں گیا ہے اور...... کب واپس آئے گا؟"

"میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میں تو تمہارے ساتھ اندر ڈرائنگ روم میں تھا۔ عمران اور شہبازی کو تم نے واش رومز میں بند کر رکھا ہے......"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم تینوں کے علاوہ کوئی اور شخص بھی بنگلے پر موجود تھا......؟"

"نہیں ...... بالکل نہیں!" وہ پوری قطعیت سے بولا۔ "بس' ہم تین ہی تھے۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے' شیروانی نے تم لوگوں کی خفیہ نگرانی کے لیے کسی خاص بندے کو یہاں متعین کر رکھا ہو......" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "اور وہ بندہ یہاں ہونے والی کارروائی کی رپورٹ پیش کرنے شیروانی کے پاس گیا ہو۔"

میری بات نے اسے خوف زدہ کردیا اور وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد الجھن پائی جاتی تھی۔ میں نے مزید کہا۔

"یہ ناممکن تو نہیں مراد......"

"میں فوری طور پر اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔" وہ بہ دستور الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پہلے ہمیں عمران اور شہبازی کی خبر لینا چاہیے لیکن ٹھہرو......"

لمحاتی توقف کرکے وہ آگے بڑھا اور بولا۔

"پہلے میں بنگلے کا گیٹ بند کردوں۔"

وہ گیٹ بند کرکے واپس آیا تو بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"کیا شہبازی نے گیٹ کو لاک نہیں کیا تھا؟"

"جب وہ عمران کے ساتھ میرے پاس آیا تھا تو میں نے اس سے گیٹ کے حوالے سے یہ سوال کیا تھا۔" مراد نے بتایا۔ "اور اس نے گیٹ کو بند کرنے کی بات کی تھی مگر لاک کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ پھر جب میں نے شہبازی کے بیان کی روشنی میں' کسی پراسرار بندے یعنی تمہیں ڈھونڈنے کے لیے بنگلے کا راؤنڈ لگایا تھا' اس وقت میں نے گیٹ کو بند ہی پایا تھا۔"

"تو اس کا مطلب ہے' جو میں سوچ رہا ہوں' وہ نہیں ہے......!" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

"مجھے کیا پتا' تم کیا سوچ رہے ہو......؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"میں چور اور چوری کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا "اور گیٹ کے کھلا رہ جانے کے بارے میں بھی......!"

"یعنی تمہارا مطلب ہے' بنگلے کا گیٹ کھلا رہ گیا ہوگا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور اس کھلے ہوئے گیٹ کے راستے کوئی چور' ہائی روف کو چرا لے گیا ہے؟"

"یہ ناممکن تو نہیں!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "جرائم پیشہ لوگ تو دن دہاڑے گن پوائنٹ پر گاڑیاں چھین لیتے ہیں' یہ تو پھر گلستان جوہر کا ایک دور افتادہ علاقہ ہے جو ابھی مکمل طور پر آباد بھی نہیں ہوا۔ یہاں تو چوری اور ڈکیتی کے امکانات اور بھی زیادہ ہیں۔"

اس نے میرے پیش کردہ تجزیے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ہال میں داخل ہوگئے۔ آگے پیچھے اس لیے کہ میں نے مراد کو خطرناک کلاشنکوف کے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی جانب سے ذراسی غفلت بھی کھیل کا پانسا پلٹ سکتی تھی اور میں جیتی ہوئی بازی کو ہار میں ہرگز ہرگز بدلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

یہ وہی ہال تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میرے اور مراد کے بیچ اچھی خاصی مارا ماری ہوئی تھی۔ اسی ہال میں' میں نے شہبازی کے بدن کے زیریں حصے کو لہولہان کرکے اسے کئی ماہ تک یا تاعمر اپاہج اور معذور بنانے کا بندوبست بھی کیا تھا اور...... یہیں پر شیطان ابن شیطان ندیم شیروانی اپنی خودساختہ فتح کے نشے میں کوئی شان دار جشن منانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بہرحال' حسرت ان غنچوں پر...... جو بن کھلے مرجھا گئے۔

اس بنگلے پر میرا کام ختم ہوچکا تھا۔ کم از کم اس سیشن کا کام مکمل ہوگیا تھا۔ "دوسرا سیشن" رات کی تاریکی میں شروع ہونے والا تھا۔ جب میں پوری تیاری کے ساتھ ایک بار پھر اس بنگلے میں وارد ہوتا پہلے بے ہوشی کی حالت میں ایک قیدی کی حیثیت سے مجھے یہاں لایا گیا تھا' اور میں بہ وقت رخصت شیروانی کو اچھے 'رزلٹ' دے کر جارہا تھا۔ ان شاء اللہ رات کو جب میں یہاں آتا تو شیروانی کے خلاف اتنا کچھ کر جاتا کہ کیا اس کے کسی دشمن نے کیا ہوگا۔ میں اسے اتنے زخم دینا چاہتا تھا کہ انہیں چاٹتے چاٹتے اس کی زبان گھس کر کاغذ بن جائے اور کاغذ بھی وہ جو ٹشو پیپر کو شرماتا ہو......!

مراد نے واش روم کا دروازہ کھولنے سے پہلے اجازت طلب انداز میں میری جانب دیکھا۔ میں نے دو مواقع پر اس کی ایسی درگت بنائی تھی کہ اس کے مزاج اور اسٹائل میں فرماں برداری اور اطاعت گزاری کا عنصر شامل ہوگیا تھا' چاہے یہ وقتی مجبوری اور بے بسی کا نتیجہ ہی کیوں نہ ہو۔ وقت پڑنے پر تو انسان گدھے کو بھی باپ بنالیتا ہے' میں تو پھر ایک انسان تھا۔

"ٹھیک ہے!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "دروازہ کھول کر دیکھو' اندر کیا ہو رہا ہے......!"

عام حالات میں میرا یہ "حکم" مضحکہ خیز اور عامیانہ

حرکت کے زمرے میں آتا کیوں کہ سب کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہے کہ بند واش روم کے اندر کیا ہو رہا ہوتا ہے لیکن یہ عام حالات تھے اور نہ ہی شہبازی ایسا کچھ کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

مراد نے دروازے کی کنڈی کھولی اور جب دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کی تو اس نے کھلنے سے انکار کر دیا۔ مراد نے ایک دو مرتبہ مزید کوشش کی پھر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے شہبازی نے اندر سے کنڈی لگالی ہے......!"

"اس کالے بھینسے کی حالت تو ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنی جرأت کا مظاہرہ کر پاتا۔" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "خیر...... دروازہ بجاؤ اسے آواز دو۔"

مراد نے فوراً میری ہدایات پر عمل کیا اور واش روم کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے بآواز بلند شہبازی کو پکارنے لگا۔

"شہبازی! دروازہ کھولو...... تم نے اندر سے کنڈی کیوں لگائی ہے؟"

"میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔" اندر سے اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں بے حد نقاہت پائی جاتی تھی۔

مجھے تو اس بات پر حیرت تھی کہ وہ اب تک ہوش وحواس میں کیسے تھا۔ میں نے اسے کچھ ایسے انداز میں گھائل کیا تھا کہ دہشت اور وحشت کے مارے اسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا' پھر اس کے بدن سے اتنا خون خارج ہو چکا تھا کہ اسے انٹا غفیل ہونے میں کسی 'مصلحت' یا 'غفلت' سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔ مگر بعض لوگوں کی قوت برداشت ناقابل یقین حد تک ہوتی۔ شہبازی بھی ایسا ہی ثابت ہو رہا تھا۔ وہ نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ اس کسمپرسی کی حالت میں اس نے اندر سے دروازے کو کنڈی بھی لگالی تھی۔

"کیوں نہیں کھولو گے دروازہ ......؟" مراد نے پوچھا۔

"وہ مجھے مار ڈالے گا......" وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔ "میں نے ابھی اس کی آواز سنی ہے۔ وہ یہاں موجود ہے اور...... کسی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' تم اندر ہی رہو۔" مراد نے ایک چال چلی۔ "میں تو اس لیے دروازہ کھلوا رہا تھا کہ تمہیں کسی اسپتال لے جاؤں اور تمہارے زخموں کا علاج ہو سکے۔ تم دروازہ نہیں کھولنا چاہتے تو تمہاری مرضی ہے۔"

"میں دروازہ ضرور کھولوں گا مگر اس کے دفع ہونے کے بعد۔" شہبازی کی محتاط اور ڈری سہمی سی آواز ابھری۔ "اس نے پہلے گولی کا نرخرا چیر کر اسے موت کے گھاٹ اتارا اور پھر ہم دونوں کا جو حشر کیا ہے' وہ بھی تمہارے سامنے ہے' یہ بہت ہی خطرناک شخص ہے مراد......"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" مراد نے میرے اشارے پر تسلی بھرے انداز میں کہا۔

"تم زیادہ بول کر اپنی توانائی ضائع نہ کرو۔ میں اس بندے کو رخصت کر کے تمہارے پاس آتا ہوں۔"

"میں نے تھوڑی دیر پہلے ہائی روف کی آواز سنی تھی۔" شہبازی کی تشویش بھری آواز ابھری۔ "کیا عمران کہیں گیا ہے......؟"

"ہاں...... میں نے عمران کو کسی خاص کام سے بھیجا ہے۔" مراد نے اس کی مزید تسلی کی غرض سے کہا۔ "فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس کے جانے کے بعد' گیٹ بند کر کے تمہارے پاس آتا ہوں۔"

مراد نے بات ختم کی پھر میرے اشارے پر ہال سے باہر نکل آیا۔ اب ہم راہ داری میں تھے۔ میں نے گھری سنجیدگی سے کہا۔

"مراد! میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ شیروانی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ تم اس کا حکم ماننے پر مجبور ہو لہٰذا میں بھی تمہارے معاملے میں یہ سب کچھ مجبوراً ہی کر رہا ہوں......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ہم دردی بھرے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے جانے کے بعد شہبازی کو فوراً کسی اسپتال پہنچا دینا۔ اگر اس کے بدن سے زیادہ خون خارج ہو گیا تو اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔"

اس نے میری ہم دردی کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی اور اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "اور...... عمران کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے۔ کیا اسے بھی فوری طبی امداد کی ضرورت ہوگی۔"

"میرا خیال ہے' وہ صرف بے ہوش ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تک یا تو اسے ہوش آ چکا ہوگا اور یا پھر ہوش آنے ہی والا ہوگا۔"

"میں سمجھتا ہوں' وہ بے ہوش ہی ہوگا۔" مراد نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "اگر وہ ہوش میں آ چکا ہوتا تو واش روم کا دروازہ بجا بجا کر اس بنگلے کو سر پر اٹھا لیتا۔"

مراد کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔

میں نے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "تم واش روم کا دروزہ کھولو...... ابھی سب پتا چل جاتا ہے۔"

مراد نے پہلے کنڈی اور ازاں بعد واش روم کا دروازہ کھول دیا۔

عمران اسی حالت میں واش روم کے فرش پر بے سدھ پڑا تھا جیسا میں اسے پھینک کر گیا تھا۔

اسے بے حس وحرکت دیکھ کر مراد نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"کہیں یہ گزر تو نہیں گیا......؟"

"چیک کرو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اندر جا کر اس کی نبض ٹٹولو اور سانس کی آمد وشد کا اندازہ لگانے کی بھی کوشش کرو۔"

مراد نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور بتایا۔ "یہ زندہ ہے مگر سانس بہت دھیمی چل رہی ہے۔"

"مبارک ہو......" میں نے بے ساختہ کہا۔

مراد نے گھور کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"بھئی! عمران کی زندگی کی مبارک دے رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میرے جانے کے بعد اس کے سلسلے میں تمہیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ بس' اسے جوتا سنگھا دینا۔ یہ خود ہی ہوش میں آ جائے گا۔"

اس نے میرے کڑوے بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور بہ دستور تشویش بھرے انداز میں بولا۔

"تمہاری بات ہی ٹھیک لگ رہی ہے۔ وہ کوئی چور اچکا ہی ہوگا جو ہائی روف اڑا لے گیا ہے۔ ایسے کم بختوں کے لیے گیٹ کھولنا کون سا مشکل کام ہے۔"

مراد مبینہ کار چور کے لیے ایسے الفاظ استعمال کر رہا تھا جیسے خود وہ نجیب الطرفین اور دودھ کا نہایا ہوا ہو۔ مجھے چور سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی وہ سوزوکی ہائی روف میرے باپ کی تھی جو اس کی چوری کا مجھے افسوس ہوتا۔ میں نے تو محض اپنی تسلی کی خاطر اور اندرونی تجسس سے مجبور ہو کر یہ کارروائی کی تھی۔ میرے ذہن میں شک جاگا تھا کہ کہیں عمران کسی طرح واش روم سے باہر نکلنے میں کامیاب نہ ہو گیا ہو اور...... ہائی روف پر سوار ہو کر اپنے آقا کو ان خونیں واقعات کی رپورٹ پیش کرنے نہ گیا ہو۔ بہرحال اس حوالے سے مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔

"جتنا جلدی ممکن ہو...... اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔" مراد نے منت بھرے انداز میں کہا۔ "جنید خان کسی بھی وقت اپنے یونٹ کے ساتھ یہاں پہنچ سکتا ہے۔ ان لوگوں کی آمد سے پہلے مجھے عمران اور شہبازی کو بھی دیکھنا ہے۔"

"تم نے میری ڈھیر ساری باتیں مانی ہیں مراد......" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری یہ فرمائش ضرور پوری کروں گا۔ میں یہاں سے جارہا ہوں لیکن......!"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔

"لیکن...... کیا؟"

"لیکن یہ کہ......" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے یقین ہے عمران اور شہبازی پر توجہ دینے سے پہلے تم نمک حلالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہزاد کے ذریعے اپنے باس تک یہ اطلاع ضرور پہنچاؤ گے کہ میں نے ...... اس بنگلے اور یہاں رہنے والے شیروانی کے بندوں کی ایسی کم تیسی کردی ہے۔ ہیں نا...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بے بسی بھری مگر کینہ توز نگاہ سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ ان لمحات میں مراد جس ذہنی اذیت اور فکر فردا میں مبتلا تھا اس کا میں بہ خوبی اندازہ لگا سکتا ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت تھا اور نہ ہی میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی کوئی رمق تھی کہ میں وہاں بیٹھ کر اس کے زخموں پر مرہم کاری کرتا۔

میں نے اسے مختلف حوالوں سے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور اسے ڈرائنگ روم میں مقید کر کے بنگلے سے باہر نکل آیا۔ مجھے یقین تھا کہ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح ڈرائنگ روم سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ بس' مجھے اتنی ہی مہلت درکار تھی تاکہ اس کی آزادی سے پہلے میں بنگلے سے محفوظ فاصلے پر پہنچ جاؤں۔ اور...... میں نے اپنا مقصد پالیا تھا۔

❁......❁......❁

شام کے چھ بجے تھے۔ موسم سرما کی مناسبت سے یہ رات کا آغاز تھا۔ میں اس وقت عاطف رشید کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ گلستان جوہر والے اس فتنہ پرور اور شر انگیز بنگلے سے نکلنے کے بعد میں نے گھر کا رخ کرنے کے بجائے عاطف صاحب سے ملاقات کرنے کو ترجیح دی تھی۔ میں ان سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اصولی طور پر میں عاطف صاحب کے بڑے بھائی خالد رشید کا ملازم تھا لیکن میں سمجھتا تھا' میرے معاملے کو عاطف صاحب زیادہ بہتر انداز میں ڈیل کرسکتے تھے۔ مجھے ان کے تدبر' دانش مندی اور قوت فیصلہ پر زیادہ اعتماد تھا۔

اس وقت میرا پورا بدن کسی پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ کل رات سے لے کر تھوڑی دیر پہلے تک میں جن ہنگامہ خیز حالات سے گزرتا رہا تھا انہوں نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے سر کے عقبی حصے سے بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جب تک میں "ایکشن" میں رہا تھا' اس تکلیف کی طرف میرا زیادہ دھیان نہیں گیا تھا مگر اب پتا چل رہا تھا اور بڑا "ٹھیک ٹھاک" پتا چل رہا تھا۔

جسمانی تکلیف کو تو انسان کسی نہ کسی طور جھیل ہی لیتا ہے مگر ذہنی اور قلبی اذیت سوہان روح بن جاتی ہے۔ میں ان لمحات میں ان دونوں تکالیف سے گزر رہا تھا۔ کھوپڑی کے عقبی حصے کی تکلیف اپنی جگہ مسلم تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی اور فرحانہ کی فیملی کی بھی فکر تھی۔ اس سب سے بڑھ کر خوش ولی اور فرحانہ کا خیال۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں خود پر گزرنے والی بپتا عاطف صاحب کے گوش گزار کردی۔ انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور

وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔

"حالات خاصے سنگین اور تشویش ناک ہیں مگر آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ سیدھے میرے پاس چلے آئے۔"

"سر! آپ نے بالکل درست فرمایا کہ میں بہت فکر مند ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں' فکر مند ہوئے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میری ساری فکر اور تشویش فرحانہ اور خوش ولی کے لیے ہے۔ یہ دونوں اس وقت ندیم شیروانی کی کسٹڈی میں ہیں اور جیسا کہ میں آپ کو بتاچکا ہوں' میری معلومات کے مطابق' خوش ولی شدید زخمی بھی ہے؟" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بیھبیر لہجے میں استفسار کیا۔

"عاطف صاحب! کیا خوش ولی کے گھر والوں نے آپ سے کوئی رابطہ کیا؟"

"ایک نہیں' دس بار رابطہ کرچکے ہیں۔"

"پھر......!" میں نے دزدیدہ نظر سے انہیں دیکھا۔ "آپ نے انہیں کیا جواب دیا۔"

"مصلحت بھرا جواب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔

"کیا مطلب......؟" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھو مسٹر اسد" عاطف صاحب نے مربیانہ انداز میں کہا۔ "خوش ولی کل آپ کے ساتھ اس مشن پر روانہ ہوا تھا۔ وہ نہ تو کل آفس آیا تھا اور آج تو خیر اس کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا میں نے اس کے حوالے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے البتہ اس کے گھر والوں کو یہ تسلی ضرور دی ہے کہ خوش ولی اور اسد یعنی آپ دونوں ہی منظر سے غائب ہیں۔ آپ لوگ جہاں بھی ہیں' ایک ساتھ ہی ہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد بہ خیریت واپس آجائیں گے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کے گھر والوں سے بھی رابطہ کیا تھا مگر انہیں وہاں سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا......!"

"وہاں سے خوش ولی کے گھر والوں کو کوئی حوصلہ افزا جواب کیسے مل سکتا تھا۔" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "فرحانہ کے اغوا والا معاملہ بہت خفیہ رکھا گیا ہے۔ میری اور فرحانہ کی فیملی کے سوا اور کسی کو اس کی خبر نہیں لہٰذا انہوں نے خوش ولی کے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔"

"بس' صورت حال کچھ اسی طرح کی ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ "جیسا کہ آپ نے بتایا' شیروانی نے آپ کے گھر کی نگرانی پر اپنے دو' تین بندے مامور کر رکھے ہیں تاکہ آپ پر نظر پڑتے ہی وہ آپ کو دوبارہ قابو کرلیں' ان حالات میں آپ نے براہ راست گھر کا رخ نہ کر کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا ہے مگر......"

"مگر کیا سر؟" ان کے ادھورے جملے کے جواب میں' میں نے فوراً سوال کر ڈالا۔

"مگر یہ کہ......" وہ بڑی رسان سے بولے۔ "میں آپ کو گھر بھیجنے کا بندوبست تو بعد میں کروں گا لیکن فی الحال آپ اپنے گھر فون کر کے انہیں اپنی خیریت کی اطلاع تو دے دیں۔"

بات ختم کرتے ہی انہوں نے اپنی میز پر رکھے ہوئے تین ٹیلی فون سیٹ میں سے ایک میری جانب کھسکا دیا۔ میں نے ممنونیت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"سر! گلستان جوہر والے بنگلے پر جب میں نے

شیروانی کے بندوں کو اپنے قابو میں کر لیا تھا تو اس وقت وہیں سے میں نے اپنے گھر فون کرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے اس بات پر سخت حیرت بلکہ پریشانی ہوئی تھی کہ متعدد بار کوشش کے باوجود بھی دوسری جانب فون اٹینڈ نہیں کیا گیا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب پھر ٹرائی کر کے دیکھتا ہوں۔"

عاطف صاحب نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے ٹیلی فون سیٹ کو اپنے قریب کر لیا پھر بڑے اطمینان سے اپنے گھر کے نمبرز ڈائل کرنے لگا۔ دوسری گھنٹی پر کسی نے فون اٹینڈ کر لیا پھر ایک جانی پہچانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو......!"

"ہاں شازی! یہ میں ہوں۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔ "اسد......"

"بھائی جان......!" وہ وارفتگی کے عالم میں بولی۔ "آپ کہاں ہیں۔ فرحانہ کا کچھ پتا چلا......؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے سنبھلی ہوئی آواز میں کہا۔ "فرحانہ کو میں جلد ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم بتاؤ' گھر میں سب خیریت ہے نا؟"

"نہیں بھائی جان......!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"گڑبڑ......" میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "کیسی گڑبڑ شازی؟" میں نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بھائی جان!" وہ روہانسے لہجے میں بتانے لگی۔ "ہم سب کو یہ امید تھی بلکہ یقین تھا کہ آپ کل ہی فرحانہ کو صحیح وسلامت لے کر واپس آ جائیں گے لیکن آپ ایسے گئے کہ پھر آپ کی کوئی خبر نہیں ملی' ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہماری فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہم نے آپ کے اور خوش ولی کے موبائل فون پر کئی بار کال کی لیکن دونوں کے فون آف آ رہے تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تک آف ہی آ رہے ہیں۔"

"سیل فونز کو گولی مارو شازی۔" وہ سانس لینے کے لیے تھمی تو میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تم کسی گڑبڑ کا ذکر کر رہی تھیں۔ بتاؤ' کیا ہوا ہے گھر میں......امی تو ٹھیک ہیں نا......؟"

"امی ٹھیک ہیں اور سو رہی ہیں۔" وہ گھبرائی ہوئی آوز میں بولی۔ "گڑبڑ ادھر فرحانہ کے گھر میں ہوئی ہے۔"

"میں سن رہا ہوں۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ "بولتی جاؤ......فرحانہ کے گھر پر کیا گڑبڑ ہوئی ہے؟"

"انکل کو اٹیک آیا ہے......!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہارٹ اٹیک۔"

"شازی......یہ تم...... کیا کہہ...... رہی ہو......؟" میں نے بکھری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں بھائی جان۔" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں بتانا شروع کیا۔ "جیسا کہ میں نے کہا' ہم توقع لگائے بیٹھے تھے کہ آپ اور خوش ولی فرحانہ کو لے کر واپس آ جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری تشویش بڑھنے لگی۔ اس پر آپ دونوں کے سیل فونز بھی آف آ رہے تھے۔ فرحانہ کی وجہ سے انکل اور آنٹی سخت پریشان تھے' پریشان تو میں اور امی بھی بہت تھے مگر انکل آنٹی کی حالت زیادہ خراب تھی پھر آدھی رات کے وقت انکل کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ انہوں نے سینے میں تکلیف کی شکایت کی اور فرش پر گر گئے۔ دونوں گھروں کے لوگ پہلے ہی بہت پریشان تھے۔ اس نئی صورت حال نے ہماری پریشانی کو بڑھا دیا۔ میں نے اور امینہ آنٹی نے

کوشش کر کے انکل کو اسپتال پہنچایا تو پتا چلا انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔"

"اوہ......!" میں نے ایک افسردہ سانس خارج کی۔ "یہ تو بہت افسوس ناک صورت حال ہے۔"

"انکل کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں۔" شازیہ نے بتایا۔ "اسپتال والوں نے انہیں آئی سی یو میں رکھا ہوا ہے۔ امینہ آنٹی انہی کے پاس ہیں۔ میں رات کو واپس آ گئی تھی۔ امی کو گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ آج صبح امی ضد کر کے میرے ساتھ اسپتال گئی تھیں۔ دن کا زیادہ تر حصہ ہم نے وہیں گزارا ہے۔ ایک گھنٹا پہلے ہی ہم واپس آئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں' امی کی اپنی طبیعت کتنی خراب رہتی ہے۔ آج کی بھاگ دوڑ نے انہیں اتنا تھکا دیا ہے کہ اب بے خبر سو رہی ہیں......"

اب میری سمجھ میں آ گیا کہ جب میں نے گلستان جوہر والے بنگلے سے اپنے گھر فون کیا تھا تو کسی نے فون اٹینڈ کیوں نہیں کیا تھا۔ امی اور شازیہ اس وقت یقیناً اسپتال میں تھیں۔

"ٹھیک ہے شازیہ! تم امی کا خیال رکھو۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا "میں بہت جلد گھر آنے کی کوشش کروں گا۔"

"کوشش کروں گا......کیا مطلب بھائی جان؟" وہ بڑی معصومیت سے پوچھ بیٹھی۔ "آپ ابھی فوراً گھر آ جائیں۔ ہم خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہے ہیں۔"

میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میری گڑیا! میں چویشن کو سمجھ رہا ہوں مگر فوری طور پر گھر آنا ممکن نہیں۔ آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' میں صبح سے پہلے آپ کے پاس موجود ہوں گا اور میں اکیلا نہیں آؤں گا بلکہ میرے ساتھ فرحانہ بھی ہو گی۔"

"اور خوش ولی......؟" شازیہ نے بے ساختہ پوچھا۔

اس کے سوال میں ایک خاص نوعیت کی تشویش پائی جاتی تھی۔ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ خوش ولی شازیہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا......اور شازیہ کی طرف سے بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ تھا جبھی خوش ولی کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے اس کے لہجے میں گہری تشویش در آئی تھی۔

"وہ بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔" میں نے اپنے لہجے کو ہر ممکن توانا رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تینوں ہی آج رات کسی وقت آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

اس سے پہلے کہ شازیہ کچھ کہتی' ائرپیس میں مجھے امی کی آواز سنائی دی۔ "شازیہ' کس سے باتیں کر رہی ہو...؟"

"امی......!" شازیہ نے جوشیلے انداز میں بتایا۔ "بھائی جان کا فون ہے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا اسے سمجھنے کے لیے کسی خاص سمجھ بوجھ کی ضرورت نہیں۔ اگلے ہی لمحے امی لائن پر تھیں۔ شازیہ کے بیان کے مطابق امی بے خبر سو رہی تھیں لیکن وہ نادان اس حقیقت سے ناواقف تھی کہ جوان اولاد کے والدین' خصوصاً ماں کو کبھی آنکھیں بھر کر گہری نیند سونا نصیب نہیں ہوتا۔! میں نے مختصر جامع اور تسلی بھرے انداز میں انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ وہ شیر کا دل رکھنے والی ایک جہاں دیدہ اور بردبار خاتون تھیں۔ جن لوگوں کی زندگی حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے سخت مشکلات میں گزری ہو' انہیں مصلحت کوشی آ ہی جاتی ہے۔ امی بھی بہت دانش منداور معاملہ فہم خاتون تھیں لہٰذا میری بیان کردہ صورت حال سے انہوں نے اس معاملے کی نزاکت کو بھانپ لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے اسد! کوئی رسک لینے کی ضرورت

نہیں۔ جب تم سمجھو کہ گھر کی طرف آنا محفوظ ہے' اسی وقت ادھر کا رخ کرنا اور جتنی جلدی ممکن ہو' خود کو اس جھمیلے سے نکال لو......"

"جی امی! میں یہی کوشش کررہا ہوں۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا محلے والوں کو ابھی تک فرحانہ کی غیر موجودگی کا علم ہوچکا ہے؟"

"یہ بات ابھی تک چھپی ہوئی ہے بیٹا۔" امی نے بتایا۔ "ہم نے اور نہ ہی فرحانہ کے گھر والوں نے کسی کو بتایا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں' یہ راز زیادہ عرصے تک راز نہیں رہے گا۔ فرحانہ کے باپ کی حالت ٹھیک نہیں اور امینہ بھی بہت پریشان ہے۔ پتا نہیں' کس وقت کیا ہوجائے۔"

"آپ فکر نہ کریں امی۔" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "میں صبح ہونے سے پہلے فرحانہ کو حاصل کرکے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"بیٹا! تم نے بتایا ہے کہ اس منحوس شیروانی نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ پانچ لاکھ بھی گئے اور فرحانہ بھی ابھی تک تمہاری پہنچ سے دور ہے۔" امی نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

"یہ شیطان کی اولاد شیروانی تمہارا دشمن کیوں بن گیا ہے۔ تم نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ کہیں شیروانی کے پیچھے کوئی اور تو تم سے دشمنی نہیں کررہا......؟"

"شیروانی کے پیچھے نہیں' بلکہ ساتھ ساتھ۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ساتھ ساتھ......" امی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"امی' آپ نے کسی خفیہ فون کا ذکر کیا تھا نا..." میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "دو دن پہلے دوپہر میں کسی نے گھر کے نمبر پر فون کرکے آپ کو میرے حوالے سے دھمکانے کی کوشش کی تھی۔ آپ کو یاد ہے نا......"

"ہاں ہاں [illegible] مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" امی نے خاصے توانا لہجے میں بتایا۔ "اس نے کہا تھا' میں آپ لوگوں کا دشمن [illegible] ایک ہوں اور اس دشمنی کی وجہ اسد ہے۔ وہ کم بخت [illegible] ہماری ترقی کی وجہ سے خاصا غصے میں تھا۔ مجھے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دینے کے بعد اس نے فون بند کر [illegible]۔" لمحے بھر کے لیے توقف کرکے امی نے سانس [illegible] پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"کہیں تم [illegible] دو کا ذکر تو نہیں کررہے......؟"

"جی امی! [illegible] کا انداز بالکل درست ہے۔" میں نے اثبات میں [illegible] دیا پھر محتاط الفاظ میں بتایا۔ "میں نے اس بندے کا سراغ لگالیا ہے۔ جس نے آپ کو دھمکی دی تھی۔ اس کی شیروانی کے ساتھ گہری دوستی ہے۔"

"وہ ہے کون......؟" امی نے پوچھا۔

"میری وجہ سے جن تین افراد کو فیکٹری سے بے دخل کیا گیا تھا ان میں سے ایک۔" میں نے بتایا۔ "اس شخص کا نام مرزا یاسین بیگ ہے۔ یہ بندہ اس فیکٹری میں مارکیٹنگ منیجر [illegible] کرتا تھا۔ اب یہ شیروانی کے ساتھ مل گیا ہے۔"

"اللہ غارت کرے ان شیطانوں کو۔" امی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم جلدی سے فرحانہ کو لے کر واپس آجاؤ بیٹا۔ ہم ان خطرناک لوگوں کی دشمنی افورڈ نہیں کرسکتے۔"

میں امی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دشمنی تو اب شروع ہوئی ہے۔ [illegible] یہ کہاں تک جائے گی۔ میں نے شیروانی پر اور اس نے مجھ پر اتنا ادھار چڑھا دیا تھا کہ ہم دونوں اس قرض کی ادائی میں ایک دوسرے کو مزید قرض دار [illegible] کرنے والے تھے۔ حالات جس رخ پر جارہے تھے ان کی سفاکی اور بے رحمی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک کھلی حقیقت تھی کہ میرے اور شیروانی کے درمیان جس جنگ کا آغاز ہوا تھا' یہ اب آسانی سے رکنے والی نہیں تھی۔ یہ کھلی اور سنگین حقیقت میں امی کے گوش گزار نہیں کرسکتا تھا۔

"میں آپ کی بات کو سمجھ رہا ہوں امی۔" میں نے ان کی تسلی کی خاطر کہا۔ "میں خود بھی جلد از جلد اس جھمیلے سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہ سارا کھٹ راگ فرحانہ کی واپسی کے لیے پھیلایا ہے۔ جب میں فرحانہ تک رسائی حاصل کرلوں گا تو یہ سلسلہ خود بہ خود رک جائے گا۔"

"اللہ کرے' ایسا ہی ہو......" وہ دعائیہ انداز میں بولیں۔

میں نے کہا۔ "امی! آپ اپنا بہت زیادہ خیال رکھیے گا۔ میں جب مناسب سمجھوں گا' خود ہی آپ لوگوں سے رابطہ کرلوں گا۔"

"اللہ تمہاری حفاظت کرے بیٹا۔" انہوں نے خلوص دل سے کہا پھر بولیں۔ "یہ شازیہ سے بات کرلو۔ کافی دیر سے مجھے اشارے کررہی ہے۔"

"جی دیں' اس کو فون۔" میں نے کہا۔

اگلے ہی لمحے شازیہ لائن پر تھی۔ "بھائی جان! آپ نے فرحانہ کو دیکھ تو لیا ہوگا' وہ کہاں پر ہے......؟"

"اگر دیکھ لیا ہوتا تو پھر حاصل کرنے میں کیا مشکل تھی؟" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "البتہ میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں' کمینے شیروانی نے اسے کہاں قید کررکھا ہے۔ میں آج رات فرحانہ کو شیروانی کی قید سے چھڑا لوں گا۔"

"انشاء اللہ۔" وہ پرذوق انداز میں بولی۔ "میں پوری رات آپ کی کامیابی کے لیے دعا کروں گی۔"

"اپنی دعاؤں میں انکل عبدالخالق کو بھی یاد رکھنا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ان کو دواؤں کے علاوہ دعاؤں کی بھی ضرورت ہے۔"

"جی بالکل۔" وہ جلدی سے بولی پھر پوچھا۔ "کیا آپ نے ان لوگوں کا سراغ لگالیا جو فرحانہ کو اٹھالے گئے تھے؟" لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "میں نے آپ کو ان دونوں خطرناک بندوں کا حلیہ پوری تفصیل کے ساتھ بتایا تھا نا۔"

شازیہ کی بات سن کر میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا سا ہوا اور فوراً سے پیشتر مجھے یاد آگیا کہ دراز قامت' بھاری بھرکم ہٹا کٹا' سانولا اور مونچھوں والا تو شہبازی تھا جب کہ گورا چٹا' کلین شیوڈ دبلا پتلا اور پستہ قامت عمران کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے ان دونوں بندوں کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا تھا لیکن ایک لمحے کے لیے بھی میرا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا کہ انہی کم بختوں نے شازیہ کے مغالطے میں فرحانہ کو اغوا کرلیا تھا۔

یہ تمام تر مبنی بر حقائق خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے پر میں نے شازیہ کے سوال کے جواب میں کہا۔

"ہاں شازیہ! میں نے ان دونوں شیطانوں کو ڈھونڈ کر ایسا سبق سکھادیا ہے کہ وہ اب کسی کی ماں' بہن اور بیٹی پر میلی نگاہ نہیں ڈالیں گے۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا بھائی جان..." وہ کسی ننھے بچے کی مانند مچل کر بولی۔

میں نے یہ کہتے ہوئے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کردیا۔ "ٹھیک ہے' تم اپنا اور امی کا بہت زیادہ خیال رکھنا۔ میں پھر کسی وقت مناسب موقع دیکھ کر فون کروں گا۔"

ریسیور رکھنے کے بعد میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی پھر عاطف صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر! ساری صورت حال آپ کے سامنے ہے۔ بتائیں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

وہ چند لمحات تک گہری نظر سے مجھے دیکھتے رہے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "سب سے پہلے آپ فریش ہو جائیں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ میرے آفس کے واش روم میں آپ کو ہر سہولت ملے گی اور اگر چاہیں تو چینج بھی کر لیں۔ میں اپنا ایک آدھ سوٹ آفس میں بھی رکھتا ہوں۔"

میں نے خود پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور کہا۔ "لباس ٹھیک ہے سر..... بس میں فریش ہو جاتا ہوں۔"

"ایز یو وش۔" وہ معتدل انداز میں بولے۔

میں اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔

عاطف صاحب کے کمرے کے اٹیچڈ باتھ میں دنیا کی ہر سہولت موجود تھی۔ میں نے اپنے لباس کو اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر کھونٹی پر ہینگ کر دیا۔ کسی سوٹ کی بہ نسبت جینز اور شرٹ میرے لیے زیادہ موثر تھی۔ میں آج کی رات جس نوعیت کی ہنگامی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا ارادہ رکھتا تھا ان کی مناسبت سے یہی لباس زیادہ موزوں تھا۔ ڈریس پینٹ کی بہ نسبت جینز میں انسان خود کو زیادہ چست اور چاق و چوبند محسوس کرتا ہے۔

میں پچھلے چوبیس گھنٹے میں جتنا مصروف رہا تھا ان میں ڈھنگ سے کھانے پینے اور آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میرا بدن بری طرح دکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے جسم کی تھکاوٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک بھرپور شاور لیا۔ نیم گرم پانی کی پھوار کے نیچے سے ہٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ شیمپو کرتے وقت سر کے عقبی حصے کی چوٹ نے بڑی شدت سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ کھوپڑی کے متاثرہ حصے کو دھو ڈالا۔ گرم پانی کی دھاروں نے ٹکور کی تو مجھے سر کی تکلیف میں اچھی خاصی کمی محسوس ہوئی۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد میں ایک بار پھر عاطف صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔

اس دوران میں عاطف صاحب نے جو سرگرمی دکھائی تھی، میرے بیٹھتے ہی اس کے نتائج بھی سامنے آ گئے۔ ابھی ہمارے درمیان دوبارہ گفتگو کے سلسلے کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"آ جاؤ.....!"

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ اٹھا رکھا تھا۔ جس پر ایک معروف انٹرنیشنل فوڈ چین کا مخصوص لوگو اور نام چھپا ہوا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ عاطف صاحب نے میرے لیے فاسٹ فوڈ کا بندوبست کیا تھا۔

میں نے آج صبح گولی کے ہاتھ سے ناشتا کیا تھا اور وہ بھی اس احساس کے ساتھ کہ تھوڑی دیر بعد شیروانی اس بنگلے پر پہنچ کر میری ذلت کا سامان کرنے والا ہے۔ میرے اللہ نے میری عزت رکھ لی تھی اور الٹا شیروانی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور وہ گولی جس نے مجھے ناشتا دیا تھا..... وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس کی خوں چکاں لاش اسی بنگلے کے ایک ویران کونے میں ایک خالی ڈرم کے اندر فالتو سامان کی طرح ٹھنسی پڑی تھی اور آدھی رات کے بعد کسی بھی وقت ٹھکانے لگنے والی تھی۔

میری گولی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ وہ میرے دشمن شیروانی کا نمک خوار تھا لہٰذا وہ مجھے بھی اپنا دشمن بلکہ ایک خطرناک دشمن سمجھتا تھا۔ میں نے ان نازک لمحات میں جو کچھ بھی کیا تھا، وہ حفظ ماتقدم کے زمرے میں

آتا تھا۔ اگر میں چیتے کی مانند جست بھر کر اس کے گلے میں جڑے ہوئے دستے والا پیچ کس پیوست نہ کرتا تو وہ اپنی کلاشنکوف کے برسٹ سے مجھے بھون کر رکھ دیتا۔

گولی کی وہ کلاشنکوف ازاں بعد میرے بہت کام آئی تھی تاہم گلستان جوہر والا بنگلہ چھوڑتے وقت میں نے مذکورہ گن کو بنگلے کے باہر کچرے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا تھا البتہ مراد والا سلم ماڈل پسٹل ابھی تک میری تحویل میں تھا۔

فاسٹ فوڈ کی مخصوص خوشبو کی اشتہا انگیزی میں کوئی کلام نہیں تھا اور میں تو ویسے بھی بھوکا تھا۔ صبح میں نے برائے نام سا ہر مار ٹائپ کا ناشتا کیا تھا اور اس کے بعد سے ایک کھیل بھی اڑ کر میرے منہ میں نہیں گئی تھی اور اس دوران میں، میں نے جو مارا ماری کی تھی اس نے میرے جسم و جان کی ساری توانائی کو نچوڑ ڈالا تھا اور ان لمحات میں خصوصاً فاسٹ فوڈ کی آمد کے بعد تو میری بھوک گویا چمک اور دمک اٹھی تھی۔

کھانا لانے والے بندے نے ایک بھورے رنگ کا لفافہ بھی عاطف صاحب کی طرف بڑھایا تھا جو انہوں نے اپنی میز کی دراز میں ڈال لیا تھا۔ یقیناً اس لفافے میں عاطف صاحب کے ذاتی استعمال کی کوئی چیز ہوگی۔

مذکورہ بندہ کمرے سے نکل گیا تو عاطف صاحب نے کھانے والے شاپنگ بیگ کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔

"شروع ہو جائیں۔ یہ میں نے آپ کے لیے منگوایا ہے۔ آپ نے آج صبح سے لے کر اب تک بہت محنت کی ہے۔ یقیناً آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔"

میں نے کسی تکلف کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے عاطف صاحب کی ہدایت کی تعمیل کی اور انہیں بھی کھانے کی صلاح ماری مگر انہوں نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اللہ کی نعمتوں سے انصاف کے تقاضے نبھانا شروع کر دیے۔ اس دوران میں ہم گفت گو بھی کر رہے تھے۔

"سر! میں فریش ہو گیا۔" میں نے کھانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب بتائیں، میرے لیے آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

"مشورہ تو بہت نیک ہے....." وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ "لیکن مجھے یقین ہے، آپ میرے مشورے کو مانیں گے نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی سر....." میں نے نظر اٹھا کر حیرت سے انہیں دیکھا۔ "میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"مسٹر اسد! میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ....." وہ اپنے مخصوص، ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرنے لگے۔ "کہ آپ یہاں سے چپ چاپ اپنے گھر چلے جائیں۔"

"جی.....!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور میں نے دو چند حیرت کے ساتھ کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ نے میرے اس عمل کو سراہا تھا کہ میں نے گھر کا رخ کرنے کے بجائے آپ کی طرف آ کر دانش مندی کا ثبوت دیا ہے؟"

"میں اب بھی اپنے اس بیان پر قائم ہوں۔" وہ بڑی رسان سے بولے۔ "آپ نے عقل مندی کا مظاہرہ تو کیا ہے..... اگر آپ گھر کی طرف جاتے تو دھر لیے جاتے، شیروانی کے آدمی آپ کو دوبارہ گھیر گھار کر اپنے باس کے پاس پہنچا دیتے۔"

"لیکن سر....." میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "یہ خطرہ تو اب بھی موجود ہے پھر آپ مجھے گھر جانے کا مشورہ کیوں دے رہے ہیں؟"

"خطرہ اپنی جگہ موجود ہے۔ میں اس حقیقت سے

ب انکار کر رہا ہوں۔" وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولے۔ "میں اس خطرے کے توڑ کے ساتھ آپ کو گھر بھجوانا چاہتا ہوں۔"

"خطرے کے توڑ کے ساتھ......" میں نے تعجب خیز نظر سے انہیں دیکھا۔ "سر! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ اتنی الجھی ہوئی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟"

"میری بات میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں ہے مسٹر اسد۔" وہ گمبھیر انداز میں بولے۔ "میرے ایک دوست ہیں، نجیب غوری۔ غوری صاحب پولیس ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہیں اور اپنی محنت سے ترقی کرتے ہوئے "ایس پی" کے عہدے تک پہنچے ہیں۔ نہایت ہی ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر ہیں۔ میں انہیں ایک فون کروں گا تو وہ دوڑے چلے آئیں گے۔ میں انہیں کہہ کر آپ کو بہ حفاظت گھر پہنچانے اور پھر گھر میں آپ کی مکمل حفاظت کا انتظام کروا سکتا ہوں۔"

"آپ کا مطلب ہے، میں یہاں سے اٹھ کر پولیس کی نگرانی میں اپنے گھر جاؤں۔" میں نے شکایتی نظر سے انہیں دیکھا۔ "اور پھر پولیس کی حفاظت میں چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جاؤں......"

"اس میں بزدلی کا کوئی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ کو چند روز تک اپنے گھر تک محدود رہنا چاہیے۔"

"مصلحت......!" میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے تلخ ہو گیا۔ "سر! آپ صورت حال کی سنگینی کو نظر انداز کر رہے ہیں۔"

"ہرگز نہیں مسٹر اسد۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ "میں آپ کو یہ صلاح موجودہ سچویشن کے پیش نظر ہی دے رہا ہوں۔ میرا دوستانہ اور مخلصانہ شورہ یہ ہے کہ چند دن کے لیے آپ منظر سے آؤٹ ہو جائیں۔"

"اور فرحانہ......؟" میں نے دزدیدہ نظر سے انہیں دیکھا۔

"فرحانہ کی واپسی کے معاملات پولیس کو ڈیل کرنے دیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ "میں اپنے ایس پی دوست نجیب غوری کو صورت حال سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ شیروانی کے حوالے سے آپ نے مجھے جتنی معلومات فراہم کی ہیں ان کی روشنی میں، مجھے یقین ہے کہ غوری صاحب جلد از جلد فرحانہ کو بازیاب کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"سر......! میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کچھ عرض کروں۔"

"نیور مائنڈ......" وہ ٹھوس لہجے میں بولے۔

"خالد رشید صاحب کی فارماسیوٹیکل کمپنی میں جو کچھ ہوتا رہا اس کے مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے بعد آپ نے پولیس کے حوالے نہیں کیا بلکہ کسی بھی مرحلے پر آپ نے اس معاملے میں پولیس کو انوالو ہی نہیں کیا اور میرے کیس میں آپ پولیس کو ملوث کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں؟"

"ہاں......" انہوں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "کیونکہ دونوں معاملات کی سچویشنز اور تقاضے الگ ہیں۔"

"کیا الگ ہیں!" میں نے کھانا ختم کرتے ہوئے پوچھا۔ "ذرا مجھے بھی تو سمجھائیں سر؟"

"اس موضوع پر ہماری پہلے بھی بات ہو چکی ہے جب میں نے ان تینوں مجرموں سے تحریری بیانات لینے کے بعد انہیں بھائی صاحب کی فیکٹری سے بے دخل کیا تھا۔" وہ معتدل انداز میں بولے۔ "اور میں نے آپ کے سامنے اس مصلحت کا بھی ذکر کیا تھا جس کی وجہ سے

ان تین شیطانوں کو پولیس کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔"

"جی ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے خالد صاحب کے بزنس کی "ریپوٹیشن" کی بات کی تھی۔ انہیں پولیس کے حوالے کرنے اور اخبارات میں اس کرپشن کی تفصیل چھپنے کے بعد خالد صاحب کے بزنس کی ساکھ کو دھچکا لگ سکتا تھا۔"

"جی ہاں، آپ میری نظر میں ایک عقل مند انسان ہیں۔ مجھے امید ہے، آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "یہ ٹھیک ہے کہ میں ان تین بدمعاشوں کو پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا مگر آپ جانتے ہیں، میں نے اس تحریری بیان کی مدد سے ان تینوں موذیوں کے ڈنک نکال دیئے تھے۔"

"میں بھی ایسا ہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں سر......" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "آپ کے نقش قدم پر چلنے میں مجھے خوشی محسوس ہو گی۔"

"میں سمجھا نہیں مسٹر اسد۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولے۔ "آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"دیکھیں سر......" میں نے بڑے معقول انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "انور صاحب، عظیم احمد اور مرزا یاسین بیگ کے معاملے میں آپ کے پیش نظر خالد صاحب کی فیکٹری کی "ساکھ" تھی اور آپ نے اس ساکھ کو بچانے کے لیے ایک مشکل اور معذرت کے ساتھ خلاف قانون فیصلہ کیا تھا۔ میرے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی مجبوری ہے۔"

"آپ مجبوری کی وضاحت کریں مسٹر اسد۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"آپ کے پیش نظر خالد صاحب کے بزنس کی ساکھ کا معاملہ تھا اور میرے پیش نظر اپنی انا اور خودداری کا معاملہ ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شیروانی نے اب تک مجھ پر جو قرض چڑھایا ہے اور بھی مجھے مزید مقروض کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اسے میں اپنے ہاتھوں سے خود ہی ہینڈل کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ اب تک کرتا آیا ہوں۔ میں اس معاملے میں پولیس کو ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میری اور شیروانی کی جنگ ہے بلکہ اس جنگ میں اب مرزا یاسین بیگ بھی میرے مدمقابل ہے۔ یہ جنگ میں اپنے بل بوتے پر لڑنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے، میں بہت جلد فرحانہ کو اس بدبخت کے چنگل سے چھڑا لاؤں گا۔ مجھ سے دشمنی شیروانی کو بہت مہنگی پڑے گی۔"

"ہوں......" عاطف صاحب نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "تو میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ آپ میرا مشورہ ماننے کو تیار نہیں ہیں۔"

"آپ میرے جذبات اور احساسات کو سمجھنے کی کوشش کریں سر۔" میں نے اصراری لہجے میں کہا۔ "فرحانہ والا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں البتہ دوسرے معاملات میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہو گی۔"

"دوسرے معاملات......" انہوں نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ "وضاحت کریں مسٹر اسد! آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟"

"سر! آپ ایک بزنس مین ہیں اور امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق، ندیم شیروانی بھی امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے۔ میں نے دو تین بار اسے اسی علاقے میں دیکھا ہے تو غالب امکان اسی بات کا ہے کہ اس کا آفس آئی آئی چندریگر روڈ پر ہی ہو گا۔ آپ اس کے بارے میں مجھے مکمل معلومات فراہم کر سکیں تو یہ بھی آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔"

"اس میں احسان والی کوئی بات نہیں مسٹر اسد۔" وہ گمبھیر انداز میں بولے۔ "آپ ہمارے خیر خواہ ہیں۔ ہمیں بھی اپنا محسن ہی سمجھیں۔ آپ کی زبانی ندیم

شیروانی کے حوالے سے جو باتیں مجھ تک پہنچی ہیں ان کی روشنی میں وہ بندہ بزنس مین کم اور غنڈا بدمعاش زیادہ لگتا ہے۔ کوئی بھی معتدل اور سنجیدہ بزنس مین شیروانی جیسی غیر نصابی سرگرمیوں میں نہیں پڑتا بلکہ اپنے بزنس پر دھیان دیتا ہے۔ اینی ہاؤ......'' انہوں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے اندازے کے مطابق شیروانی امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کی آڑ میں کوئی غیر قانونی دھندا کر رہا ہے جس کے لیے اسے غنڈوں اور بدمعاشوں کی ضرورت ہوتی ہے، جبھی مرزا یاسین بیگ جیسے لوگ اس کی ٹیم میں شامل ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں خیر آپ فکر نہیں کریں، میں بہت جلد اس بزنس مین کی ہسٹری معلوم کرلوں گا۔''

''تھینک یو سر!'' میں نے ممنونیت بھری نظر سے انہیں دیکھا اور کہا۔ ''ایک کام آپ کو اور بھی کرنا ہے اور وہ یہ کہ...... کسی بھی طرح خوش ولی کے گھر والوں کو تسلی دیں گے کہ ہم بہت جلد بہ خیر و عافیت واپس آجائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، یہ بھی ہوجائے گا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولے۔

''میں آج کی رات بہت مصروف رہوں گا۔'' میں نے عاطف رشید کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا ٹارگٹ جنید خان ہے۔ فرحانہ اسی ڈائریکٹر، پروڈیوسر کی تحویل میں ہے۔ اگر میں کسی طرح اس شخص پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا تو پھر فرحانہ تک رسائی بہت آسان ہوجائے گی۔ میری معلومات کے مطابق، شیروانی آج رات کسی وقت اپنے امریکی دوست جوزف کے ہمراہ بیرون ملک جارہا ہے۔ اس کے غیاب میں میرے لیے کوئی بھی ہنگامی کارروائی کرنا نسبتاً آسان ثابت ہوگا۔ میں اس کے چیلوں چانٹوں کو بڑی حکمت عملی سے کنٹرول کرلوں گا۔''

''آپ کی باتوں سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ گلشن جوہر والے اسی بنگلے کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جہاں سے ابھی آئے ہیں۔'' انہوں نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔

''جی ہاں، بالکل۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میرا یہی ارادہ ہے۔''

''اور اگر آج کی رات جنید خان اپنے یونٹ کے ساتھ شوٹ کرنے اس بنگلے پر نہیں پہنچا تو......'' انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''آج دن میں اس بنگلے پر جس نوعیت کی ہنگامہ آرائی ہوچکی ہے، اس کی اطلاع آپ کے آنے کے بعد مراد نے شہزاد کے ذریعے ندیم شیروانی تک ضرور پہنچائی ہوگی پھر وہاں سے ہوتے ہوئے یہ خبر جنید خان تک بھی پہنچی ہوگی۔ جنید خان اس شوٹنگ کو کینسل بھی کرسکتا ہے۔''

''آپ کی بات سے میں مکمل طور پر اختلاف نہیں کروں گا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ جنید خان آج کی شوٹنگ کینسل کرسکتا ہے مگر اس امر کے امکانات بھی بہرحال ہیں کہ وہ شوٹ کینسل نہ کرے۔ میں جس طرح آج صبح گولی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد غائب ہوا اور ازاں بعد میں نے اس بنگلے پر عمران، شہباز ی اور مراد کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، میرے دشمن میری اس ہنگامی اور سنسنی خیز کارروائی کو نظر انداز نہیں کرسکتے اگر جنید خان کی شوٹنگ کینسل بھی ہوجاتی ہے تو اس بنگلے پر میری دلچسپی کے اور بھی بہت سے سامان موجود ہیں لہٰذا میں وہاں جاؤں گا تو ضرور......''

''دلچسپی کے دیگر سامان......'' عاطف رشید سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''مثلاً؟''

''میری معلومات کے مطابق آج آدھی رات کو کوئی ی کسی بندے کی لاش لے کر اس بنگلے پر پہنچنے والی ہے اور گولی کی لاش کو بھی اسی گاڑی پر سوار کرکے وہاں روانہ کیا جائے گا۔ وہ گاڑی اور اس میں آنے والے آنے والا بندہ میرے لیے اہم معلومات کا ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔'' میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا فوکس تو جنید خان پر ہے لیکن بافرض محال وہ شوٹنگ کینسل بھی کردیتا ہے تو میں آدھی رات کو وہاں پہنچنے والی گاڑی کو اپنا ٹارگٹ بنا کر اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرسکتا ہوں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اگر شہبازی کو میڈیکل ٹریٹمنٹ کے لیے اسپتال بھجوا بھی دیا ہوگا تو عمران اور مراد کا اسی بنگلے پر پایا جانا لازمی ہے۔ میری اب تک کی تحقیق کے مطابق، فرحانہ کو شیروانی کے جن آدمیوں نے اغوا کیا تھا ان میں ایک عمران اور دوسرا شہبازی تھا۔ میں کسی طرح عمران کو اپنے قابو میں لاکر اس کی زبان سے یہ تو اگلوا ہی سکتا ہوں کہ انہوں نے اغوا کرنے کے بعد فرحانہ کو کہاں پہنچایا تھا۔ مجھے یقین ہے، میری ان کوششوں کے نتیجے میں مجھے فرحانہ تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی راستہ مل ہی جائے گا۔''

''آپ کے عزم کی مضبوطی اور ارادے کی پختگی کو دیکھتے ہوئے مجھے یہی لگتا ہے کہ اللہ آپ کو کامیابی دے گا۔'' وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ ''آپ نے جب اتنی تفصیل کے ساتھ سب کچھ طے کر رکھا ہے تو پھر میں آپ کو نہیں روکوں گا لیکن میرا مشورہ ہے کہ آپ وہاں اکیلے نہ جائیں۔ آپ کے ساتھ کسی اور کو بھی ہونا چاہیے۔''

''اور کون جناب......'' میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ''میرا یار غار تو اس وقت شیروانی کی قید میں ہے۔ اور کسی پر مجھے بھروسا نہیں ہے۔''

''اگر میں تمہارے ساتھ کسی بھروسے کے آدمی کو لگا دوں تو......؟'' انہوں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

اس سوال کے ساتھ ہی وہ ''آپ'' سے تم پر آگئے تھے۔ ان کا بے تکلفی کا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''کون بھروسے کا آدمی؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو......'' وہ بے تکلفی کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''یہ بتاؤ، تم کب تک اس بنگلے کی جانب جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''ابھی آٹھ بج رہے ہیں۔'' میں نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے، مجھے نو بجے تک یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''نو نہیں، تم یہاں سے دس، ساڑھے دس بجے نکلو۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ جب تک میں بھروسے کے اس بندے کو یہاں بلا لیتا ہوں جس کا ذکر کیا ہے اور ہاں......'' لمحاتی توقف کرکے انہوں نے مشورہ دینے والے انداز میں اضافہ کیا۔

''اس دوران میں تم ایک چھوٹی سی نیند لے لو تاکہ سابق مشقت کی تھکن اتر جائے۔ آگے پتا نہیں، کون کون سے ہنگامے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔''

عاطف صاحب کا مشورہ میرے دل کو لگ رہا تھا۔ میرا بدن تو تھکن سے پہلے ہی چُور تھا۔ پیٹ بھر کر کھانا کھالینے اور اس سے قبل نیم گرم پانی سے ایک بھرپور شاور لینے کی وجہ سے میں اس وقت واقعی آرام کی حاجت محسوس کر رہا تھا۔ تاہم ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

''سر! کیا آپ میری خاطر رات دس بجے تک اپنے آفس میں بیٹھے رہیں گے؟''

"میں کام کے سلسلے میں اکثر لیٹ میٹنگ کرتا ہوں۔" انہوں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "آج تمہارے سلسلے میں سہی...... یہ بھی تو ایک ضروری کام ہے نا۔"

"سر! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں..... آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔" میں نے جذبات سے لب ریز لہجے میں کہا۔

"اگر الفاظ نہیں مل رہے تو شکریہ ادا کرنے والا کام فی الحال ملتوی کر دیں۔" انہوں نے بڑی سادگی سے کہا "اس بارے میں بعد میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔"

"آپ میرے سچے خیر خواہ ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں سر!" بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

"آپ نے بھی تو خیر خواہی نبھاتے ہوئے بھائی صاحب کے بزنس کو دیمک فری کرنے میں ہماری مدد کی تھی۔" وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولے۔

"وہ تو میرا فرض تھا جناب!" میں نے جلدی سے کہا۔ "مگر جس حد تک آپ میرے فائدے اور بھلائی کا سوچ رہے ہیں' ایسا کون سوچتا ہے سر......؟"

"دوسروں کا تو مجھے پتا نہیں مگر میں ایسا سوچنے کا عادی ہوں۔" وہ سرسری سے لہجے میں بولے۔

پھر اپنی میز کی دراز میں سے وہ بھورا لفافہ نکال لیا جو تھوڑی دیر پہلے میرے لیے کھانا لے کر آنے والا بندہ انہیں دے گیا تھا۔

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تو وہ میری نگاہ کا مفہوم سمجھ کر جلدی سے بولے۔ "مسٹر اسد! میں نے آپ کے لیے کچھ میڈیسنز منگوائی تھیں۔ ایک خوراک آپ ابھی لے لیں' دوسری رات میں کسی وقت لے لیجیے گا۔ اس سے آپ کے سر کی تکلیف کو آرام ملے گا اور آپ زیادہ توجہ کے ساتھ اپنے مشن کو انجام دے سکیں گے۔"

میں عقیدت بھری نظر سے عاطف رشید کو تکنے لگا یہ اللہ کا بندہ' حد سے زیادہ میرا خیال رکھ رہا تھا۔ عاطف صاحب کے لیے میرا دل محبت اور چاہت سے معمور ہو گیا۔ جب میں ان کی دی ہوئی دوا حلق سے نیچے اتار چکا تو میں نے کہا۔

"سر! آپ کو ایک مہربانی اور کرنا ہو گی......!"

دوسری خوراک میں نے جینز کی پاکٹ میں رکھ لی تھی۔ میری بات کے جواب میں انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"کون سی مہربانی؟"

"مجھے فوری طور پر ایک سیل فون کی ضرورت ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "سائنس کی اس ایجاد نے انسان کو اس قدر اپنا عادی بنا دیا ہے کہ اس کی غیر موجودی میں زندگی ادھوری محسوس ہونے لگتی ہے۔ یوں لگتا ہے' ہم دنیا جہان سے کٹ کر رہ گئے ہوں۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" وہ آپ اور تم کے ملے جلے استعمال کو جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "میں نہ صرف آپ کے لیے سیل فون کا بندوبست کر دوں گا بلکہ آپ کو ایک معقول رقم بھی فراہم کر دوں گا۔"

"رقم کی ضرورت نہیں سر۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میری جیب میں اس وقت ساڑھے نو ہزار سے زیادہ رقم موجود ہے۔ آپ بس ایک سیل فون مع سم کارڈ مہیا کر دیں تو آپ کی نوازش ہو گی۔"

"ہو جائے گا...... سب ہو جائے گا" وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے۔ "فی الحال' تم سونے کی کوشش کرو۔ تمہارے لیے ایک چھوٹی موٹی نیند بہت ضروری ہے۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر عاطف رشید

کے اشارے پر اس چرمی کاؤچ پر جا کر لیٹ گیا جو انہوں نے اپنے ریلیکس کرنے کے لیے کمرے کی ایک دیوار کی ساتھ لگوا رکھا تھا۔

ایک تو میں بہت زیادہ تھکا ہوا تھا' دوسرے معدے میں اترنے والے فاسٹ فوڈ نے میرے اعصاب پر ایک خمار سا طاری کر دیا تھا اور تیسرے' اس آرام دہ چرمی کاؤچ نے کسی مہربان اور قدردان محبوبہ کی مانند مجھے اپنی بانہوں کی نادیدہ گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ اس سکون بخش کاؤچ پر دراز ہونا تو مجھے یاد ہے' پھر کچھ خبر نہیں کہ میں کب اور کیسے نیند کی آغوش میں جا چھپا تھا۔

انسان خیالات کا مجموعہ ہے اور خیالات خوابوں کو جنم دیتے ہیں۔ خواب کے حوالے سے اور ان کی تعبیر کے ذیل میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں جن کی روشنی میں خوابوں کی اقسام کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ بامعنی خوابوں میں علامتی خواب اور بشارتی خواب بہت زیادہ اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں تاہم ایسے خواب خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں اور انہیں مشیت الٰہی کے بغیر دیکھنا ممکن نہیں' تاہم عام طور پر ہمارے خواب روز مرہ کی زندگی اور ہماری مصروفیات ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس مختصری نیند میں' میں نے بھی ایک ایسا ہی خواب دیکھا۔

میں دیکھتا ہوں کہ..... میں اور فرحانہ ایک رتھ پر سوار ہو کر بڑے شاہانہ انداز میں کہیں جا رہے ہیں۔ فرحانہ کی حیثیت میری شریک زندگی جیسی ہے۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ میں نے اپنی جان تمنا کو پالیا ہے۔ ہم دونوں بادشاہ اور ملکہ کی طرح محو سفر ہیں۔ ہمارے آگے اور پیچھے بھی شاہانہ پروٹوکول' دور تک نظر آ رہا ہے۔ ہمارا قافلہ ست روی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے کہ اچانک ایک شخص کو ہمارے سامنے لایا جاتا ہے۔ قافلہ چند لمحات کے لیے رک جاتا ہے۔

وہ شخص آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے بدن پر صرف ستر ڈھانپنے کی حد تک لباس نظر آ رہا ہے۔ اس کی حالت ابتر اور حلیہ خاصا خستہ ہے۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے ہیں۔ اس کی حیثیت ایک قیدی کی سی ہے۔ وہ تیزی سے رتھ کی جانب بڑھ کر میرے قدموں پر اپنا سر رکھ دیتا ہے۔ مجھے اس شخص کی صورت جانی پہچانی تو لگتی ہے تاہم یہ یاد نہیں آتا کہ میں نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے۔

وہ میرے قدموں سے لپٹ جاتا ہے اور بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے آنسو میرے پاؤں کو بھگونے لگتے ہیں۔ اس کی فریاد اور آہ وزاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آنسو ندامت' پشیمانی اور پچھتاوے کے ہیں۔ وہ کسی بات' اپنی کسی خطا پر مجھ سے معافی کا خواستگار ہے۔ جس شخص نے اس قیدی کی زنجیر تھام رکھی ہے' میں اس سے پوچھتا ہوں۔

''کون ہے یہ بدبخت......؟''

میرے سوال میں شاہانہ تحکم پایا جاتا ہے۔ میرا غلام نما ملازم بڑے ادب واحترام سے بتاتا ہے۔

''ظل الٰہی! یہ بدنصیب آپ کا قیدی ہے۔''

''اس قیدی کا کوئی نام تو ہوگا؟'' میں شاہانہ تمکنت اور جاہ وجلال سے سوال کرتا ہوں۔

''یہ شیروانی ہے.....آپ کا مجرم.....ندیم شیروانی۔'' غلام بتاتا ہے۔ ''کافی عرصہ پہلے آپ نے اس پر فتح پائی تھی اور اسے اپنی قید میں ڈال لیا تھا۔''

غلام کے ریفرنس سے مجھے سب کچھ یاد آ جاتا ہے۔ بیتے ہوئے ماہ وسال میری نگاہ کے سامنے کسی ڈراؤنے خواب کی مانند فلم کی صورت چلنے لگتے ہیں۔ مجھے سب یاد آ جاتا ہے کہ ندیم شیروانی کون ہے۔ اس کا مجھ سے کیا رشتہ ہے۔ میں بہ دستور تحکمانہ انداز میں اپنے غلام سے

پوچھتا ہوں'

''یہ کمینہ کیا چاہتا ہے مجھ سے.....؟''

''حضور! یہ آپ سے معافی چاہتا ہے۔'' غلام بتاتا ہے۔ ''اس کی خواہش ہے کہ آپ اس کی خطاؤں کو معاف کر دیں۔ اسے بخش دیں۔'' غلام کی زبان اور دل میں مجھے شیروانی کے لیے ہمدردی کے جذبات محسوس ہوتے ہیں لیکن میری سوچ میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوتی۔ میں شیروانی کو نفرت بھری نظر سے گھورنے کے بعد کہتا ہوں۔

''میں کوئی اس کا خدا نہیں جو اسے بخش دوں۔ اسے اپنے اللہ سے گناہوں اور خطاؤں کی معافی مانگنا چاہیے اور جہاں تک میرے اور اس کے معاملے کا تعلق ہے' تو جب تک میں اس کا چڑھایا ہوا سارا قرض ادا نہیں کر دیتا اس کی نجات ممکن نہیں۔''

میری بات سنتے ہی شیروانی دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے۔ میں ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیتا ہوں۔ پھر میری غضب ناک آواز ابھرتی ہے۔

''لے جاؤ اس نامراد کو..... قید میں ڈال دو اسے..... ابھی اس بدبخت کی سزا پوری نہیں ہوئی.....!''

میرا غلام شیروانی کو کھینچ کر رتھ سے دور ہٹانے لگتا ہے۔ شیروانی اس کی کوشش کے خلاف مزاحمت پیش کرتا ہے۔ دوسرے غلام اپنے ساتھی غلام کی مدد کو دوڑ پڑتے ہیں۔ رتھ حرکت میں آ جاتا ہے۔ پھر شیروانی اور غلاموں کی کھینچا تانی والا منظر دھیرے دھیرے مدھم ہو کر دھندلا جاتا ہے۔

اگر اس خواب کی تعبیر لینے کی کوشش کی جاتی تو اسے ایک نفسیاتی اور حالات حاضرہ کا عکاس خواب کہا جا سکتا تھا جس میں میری ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔

فرحانہ اس وقت شیروانی کی کسٹڈی میں تھی اور یہ میری خواہش تھی کہ وہ میرے پاس پہنچ جائے۔ فی الحال یہ ایک ناآسودہ خواہش تھی' خواب میں جس کی تکمیل ہوتے میں نے دیکھی تھی بلکہ یہ تکمیل ہر حد سے گزر کر فرحانہ کو میری بیوی کے روپ میں دکھا رہی تھی۔ میں بادشاہ تھا اور فرحانہ میری ملکہ۔ بادشاہ اور ملکہ کامیابی اور اختیار واقتدار کی علامت بھی تھے۔ یعنی میں فاتح تھا۔

اسی طرح میں شیروانی سے حقیقت میں بہت نفرت کرتا تھا اور اسے سخت سے سخت سزا دینے کی تمنا تھی میرے دل میں' جبھی خواب میں' میں نے اسے ایک محکوم اور مجبور قیدی کی حیثیت میں دیکھا تھا۔

یہ خواب میرے ناآسودہ جذبات کا عکاس تھا یا کسی خواہش کا ترجمان' اس بحث سے قطع نظر مجھے اس خواب سے بڑی تقویت محسوس ہوئی تھی۔ شیروانی کو اپنے قدموں پر سر رکھ کر زاروقطار روتے دیکھ کر مجھے بڑی طمانیت کا احساس ہوا تھا اور یہی احساس میرے آج رات والے مشن کے لیے عظیم توانائی کا کام کرنے والا تھا۔ میں اپنے رگ وپے میں بجلیاں سی کوندتی محسوس کر رہا تھا۔ سر کی تکلیف کا دور دور تک کہیں نام ونشان نظر نہیں آتا تھا۔ درحقیقت' یہ ایک ایسا خواب تھا جس نے میرے عزم اور حوصلے کو مہمیز کر دیا تھا۔

❀.....❀.....❀

رات کے ساڑھے دس بجے تھے' میں اور ماجد جوہر موڑ سے پیدل ہی چلتے ہوئے اس بنگلے کی جانب بڑھ رہے تھے جو میرا ٹارگٹ تھا۔ عاطف صاحب نے اپنی گاڑی میں ہمیں جوہر موڑ تک چھوڑا تھا۔ اور یہاں سے پیدل آگے بڑھنے کا منصوبہ میرا تھا۔ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا اس لیے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانے کی ضرورت تھی۔ ماجد ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا جس کے ہاتھوں میں فولاد ایسی سختی

اور کسی شکنجے کے مانند گرفت پائی جاتی تھی۔ یہ "تحفہ" آج رات کے لیے عاطف صاحب نے مجھے دیا تھا۔

ماجد ایک خاموش طبع اور انتہائی سنجیدہ شخص تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس سے مل کر مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ میں کسی پتھر کے انسان سے مل رہا ہوں۔ عاطف صاحب نے ماجد کی صلاحیتوں کی بہت تعریف کی تھی۔

ہمارے درمیان جو بھی تھوڑی بہت گفتگو ہوئی تھی وہ عاطف صاحب کے آفس میں اُن کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے بڑے واضح الفاظ میں بتادیا تھا کہ ماجد اگرچہ کم گو ہے مگر یہ بہت کام کا بندہ ہے۔ جب اس کے جوہر تم پر کھلیں گے تو تم حیرت زدہ رہ جاؤ گے۔

جوہر تو ماجد کے اس وقت کھلتے جب ہم عملی طور پر کسی کام میں ہاتھ ڈالتے' ابھی تو میں عاطف صاحب کی صرف اس بات پر ایمان لے آیا تھا کہ ماجد ایک کم گو انسان تھا۔

ہم سبک رفتار سے قدم قدم اس بنگلے کی جانب بڑھ رہے تھے جو گلستان جوہر کے کم غیر آباد حصے میں واقع تھا۔ میں نے مراد کو کمرے میں بند کرنے کے بعد یہاں سے رخصت ہوتے وقت اس بنگلے کا محل وقوع اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا کیونکہ یہ بات میرے ذہن میں کسی کیل کے مانند مضبوطی سے ٹھکی ہوئی تھی کہ آدھی رات سے قبل مجھے دوبارہ یہاں آنا ہے۔

اس وقت تک رات پوری طرح بھیگ چکی تھی جوہر کے میں علاقے میں تو رات گئے تک اچھی خاصی رونق ہوتی ہے مگر ہم جس حصے سے گزر رہے تھے وہاں ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ جنوری کے مہینے میں' رات میں ویسے بھی اچھی خاصی خنکی ہوتی ہے۔ یہ علاقہ چونکہ کھلا تھا اس لیے سردی کا کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا' تاہم یہ خنکی قابل برداشت اور خوش گوار تھی۔

میں اس بنگلے میں دوسری مرتبہ قدم رکھ رہا تھا۔ پہلی بار کل شام یا سہ پہر میں مجھے بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کن راستوں سے گزار کر یہاں پہنچایا گیا تھا مگر اب کی بار میں اپنی مرضی سے ایک خاص مقصد کے تحت آیا تھا۔ جلد ہی مطلوبہ بنگلے سے محدود فاصلے پر پہنچ گئے۔ ماجد ابھی تک خاموش تھا۔ اس کی خاموشی میں ایک خاص نوعیت کی سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ وہ چپ شاہ اندر سے بہت گہرا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے صم بکم ماجد سے کہا "بس وہ سامنے بنگلا دیکھ رہے ہو نا..... جس کے گیٹ کی دونوں جانب لائٹس روشن ہیں.....؟"

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ گلستان جوہر کا وہ علاقہ ابھی زیر تعمیر تھا اور خال خال گھروں ہی میں لوگوں نے رہائش اختیار کی تھی۔ ہم اس وقت جس زاویے پر کھڑے تھے وہاں سے روشن گیٹ والا صرف ایک ہی بنگلا نظر آتا تھا' جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔

"ہاں....." اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ماجد نے چپ شاہ کا روزہ توڑ ڈالا۔ "کیا ہمیں اسی بنگلے میں جانا ہے؟"

اگر روزہ توڑنے کے الفاظ سے کسی کی دل آزاری کا امکان پیدا ہو رہا ہو تو آپ اسے روزہ افطار کرنا سمجھ لیں..... اور میرے خیال میں زیادہ مناسب الفاظ "روزہ افطار" کرنا ہی ہیں کیونکہ افطار ہی میں انسان دل کھول کر کھاتا پیتا ہے۔ ماجد بھی اب "چل سو چل" ہوگیا تھا۔

میں نے جواباً کہا۔ "بالکل یہی بنگلا ہمارا ٹارگٹ ہے۔"

عاطف صاحب کے آفس سے نکل کر جوہر موڑ تک آنے میں' میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ماجد کو اس بنگلے کی اندرونی صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بتادیا تھا کہ دراصل ہم یہاں کس مشن کے تحت آئے ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے سنجیدہ اور چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"تو بسم اللہ کریں......"

"بسم اللہ کرنے سے پہلے میرا خیال ہے' ہمیں وضو وغیرہ کرلینا چاہیے۔" میں نے مطلوبہ بنگلے کے گیٹ پر نگاہ جمائے جمائے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"وضو......!" اس کی چونکی ہوئی آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کرلی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس بنگلے کے اندر قدم رکھنے سے قبل ہمیں ایک ہنگامی حکمت عملی تیار کرلینا چاہیے تاکہ بعد میں کسی مشکل کا سامنا نہ ہو۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور الجھن زدہ انداز میں بولا۔ "گیٹ کے علاوہ باقی بنگلہ اس طرح تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے کہ لگتا ہے اندر کوئی بندہ بشر نہیں ہوگا جب کہ تم نے بتایا تھا کہ کوئی یونٹ کسی ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے یہاں آنے والا ہے......!"

"میں نے غلط نہیں بتایا تھا۔" میں نے بدستور بنگلے پر نظر جمائے ہوئے کہا۔ "اس خاموشی بھری تاریکی سے تو یہی لگتا ہے کہ یا تو وہ ڈراما یونٹ ابھی بنگلے پر پہنچا نہیں ہے یا پھر وہ لوگ ہال کے کھڑکیاں دروازے بند کر کے پردے وغیرہ برابر کرنے کے بعد شوٹنگ کر رہے ہوں تاکہ باہر سے کسی کو ان کی سرگرمیوں کا علم نہ ہو۔"

"ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ تم نے دن میں اس بنگلے پر جو مار اماری کی ہے' اس کے پیش نظر یہ احتیاط تو بہرحال ضروری ہے۔"

"بنگلے کے اندر داخل ہو کر کوئی بھی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں اندرونی صورت حال سے باخبر ہوجانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اگر جنید خان آج کی رات یہاں شوٹ نہیں کر رہا تو پھر ہمارا کام آدھا رہ جائے گا۔"

"اگر یہ پتا چل جائے کہ اندر شوٹنگ ہو رہی ہے تو میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آرہا ہے۔" ماجد نے گمبھیر انداز میں کہا پھر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "میں شوبز کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتا ہوں اور اکثر آرٹسٹوں کو بھی بہ خوبی پہچانتا ہوں۔ میں ایکٹنگ کے ایک شوقین کی حیثیت سے بہ آسانی بنگلے کے اندر رسائی حاصل کرسکتا ہوں' جس شخص کے دماغ میں ایکٹنگ کا کیڑا ہوتا ہے اسے شوٹنگ دیکھنے کا بھی بہت شوق ہوتا ہے۔ یہ لوگ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے لہٰذا مجھ پر انہیں کسی قسم کا شک نہیں ہوسکتا۔"

"درست" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح ہم دو مختلف سمتوں سے اس بنگلے پر دھاوا بول سکتے ہیں مگر شرط وہی ہے کہ بنگلے کے اندر شوٹنگ ہو رہی ہو تو......!"

وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔ "ہاں' یہ تو ہے۔"

"ٹھہرو! میں چیک کرتا ہوں......" میں نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔

وہ سگریٹ سے شغل کرتے ہوئے سوچ بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

یہ سیل فون تھوڑی دیر پہلے مجھے عاطف صاحب نے

مہیا کیا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں تمام ضروری نمبرز اس میں فیڈ کرلیے تھے جن میں میرے گھر کا نمبر بھی شامل تھا۔ کچھ نمبر عاطف صاحب سے مجھے مل گئے تھے۔ جب سہ پہر میں میں نے اس بنگلے کو چھوڑا تھا تو ندیم شیروانی کے ایک خاص بندے اور ڈرائیور شہزاد کا سیل نمبر بھی مجھے حاصل ہوچکا تھا۔ جب میں بنگلے کے ڈرائنگ روم میں مراد کا "انٹرویو" کررہا تھا اسی دوران میں شہزاد کا فون بھی آیا تھا۔ اسپیکر فون کے ذریعے مراد سے ہونے والی اس کی تمام تر گفتگو میں نے سنی تھی۔ شہزاد ہی نے مراد کو اطلاع دی تھی کہ آج سرشام جنید خان اپنے یونٹ کے ساتھ شوٹنگ کرنے اس بنگلے پر آرہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شہزاد نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ آدھی رات کو ایک گاڑی کسی کی لاش کو لے کر بنگلے پر پہنچے گی۔ اسی گاڑی میں گولی کی لاش کو لاد کر وہاں سے روانہ کرنا ہوگا تاکہ گاڑی ان لاشوں کو ٹھکانے لگادے۔ شہزاد شیروانی کا ڈرائیور ہونے کے علاوہ ایک طرح سے دست راست بھی تھا۔ اس سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں جانتا ہوگا کہ میری طرف سے "پیش" کی جانے والی ہنگامہ آرائی کے بعد بھی جنید خان وہاں شوٹنگ کرنے آیا تھا یا نہیں لیکن...... میں سردست شہزاد کو ٹچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے مذکورہ بنگلے کا نمبر فون بک سے نکال کر ایک کاغذ پر شہزاد کا نمبر نوٹ کیا تھا تو مراد سے پوچھ کر وہاں کا نمبر بھی نوٹ کرلیا تھا۔ اب یہ دونوں نمبرز اور بہت سے نمبروں کے ساتھ ہی میرے موجودہ سیل فون کی فون بک میں محفوظ تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کسی چالاکی کے خیال سے مراد نے مجھے غلط نمبر دے دیا ہو۔ بہرحال؛ ابھی پتا چل جانا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔

دوسری گھنٹی پر دوسری جانب سے کسی نے فون ریسیو کرلیا۔ میں توقع تو یہی کررہا تھا کہ مراد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائے گی مگر میری یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ دوسری طرف سے ایک نامانوس آواز نے میرا استقبال کیا تھا۔

"ہیلو......!"

"ہیلو...... کون؟" میں نے آواز کو حتی الامکان بھاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں عمران ہوں...... عمران علی۔" اس طرف بولنے والے نے بتایا۔ "اسسٹنٹ ڈائریکٹر عمران علی۔"

اس شخص کو اپنا تفصیلی تعارف کرانے کا بہت شوق محسوس ہوتا تھا اور اس کا یہی شوق میرے لیے باعث رحمت یعنی ذریعہ معلومات ثابت ہورہا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ جنید خان کا یونٹ شوٹنگ کی غرض سے اس بنگلے پر پہنچا ہوا تھا ورنہ کسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا وہاں کیا کام۔ جنید خان بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا یا نہیں اس امر کا پتا چلانا ابھی باقی تھا۔

"بھائی! میں منظور بلوچ بات کررہا ہوں۔" میں نے بہ دستور بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ "مجھے میرے ایک دوست شہبازی نے یہ نمبر دیا تھا۔ کیا آپ شہبازی سے میری بات کرواسکتے ہو......؟"

"کون ہے......؟" میری سماعت سے ایک نئی آواز ٹکرائی۔

یقیناً کسی نے عمران علی سے استفسار کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ عمران علی نے بڑے احترام سے جواب دیا تھا۔

"سر! اس بنگلے کے ملازمین میں سے کسی کے لیے فون ہے۔ کوئی منظور بلوچ ہے اور کسی شہبازی کا پوچھ رہا ہے۔"

"تم مراد کو جاکر بتاؤ۔" عمران علی کے سر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "وہی دیکھ لے گا اس فون کو......"

"اوکے سر......" عمران علی کی مودبانہ آواز ابھری۔

"اور ہاں......" عمران علی کے سر نے گہری سنجیدگی سے اضافہ کیا۔ "یہ سین بھی لے جاؤ...... رخسار سے کہو کہ میک اپ کے دوران ہی میں اپنے ڈائیلاگز بھی یاد کرتی جائے۔ یہ اکثر اپنی لائنیں بھول جاتی ہے اور آؤٹ آف اسکرپٹ بولنے لگتی ہے۔"

"جی سر......" عمران علی نے فرماں برداری سے کہا۔ عمران کے سر کی بڑبڑاہٹ ابھری۔ "نئے آرٹسٹوں کا بہت جلد دماغ خراب ہوجاتا ہے۔ دو چار ڈرامے چل جائیں تو خود کو پتا نہیں؛ کیا سمجھنے لگتے ہیں؛ اسکرپٹ کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ مرض خاص طور پر فیمیل آرٹسٹ میں زیادہ پایا جاتا ہے...... اونہہ!"

یقیناً عمران علی ریسیور کو ہولڈ پر ڈال کر مراد کو بلانے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کے "سر" نے نئے اداکاروں کے حوالے سے جو تبصرہ کیا تھا وہ میرے "آن لائن" ہونے کی وجہ سے مجھ تک پہنچا تھا۔ اس شخص کی آواز سن کر میرے اعصاب تن گئے تھے۔ عمران علی اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا اور وہ جس شخص کو "سر" کہہ کر مخاطب کررہا تھا اس کے ڈائریکٹر و پروڈیوسر ہونے میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ جنید خان کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ جنید خان میرا ہدف خاص تھا۔ اپنے ٹارگٹ کے تصور نے میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑادی۔

میں نے لائن کاٹ دی۔ میرا کام ہوچکا تھا۔ میں نے صرف یہی معلوم کرنے کے لیے بنگلے پر فون کیا تھا کہ آج رات وہاں جنید خان ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے آرہا تھا یا نہیں اور...... میں اس راز تک پہنچ گیا تھا کہ جنید خان اس وقت اپنے یونٹ کے ساتھ بنگلے کے اندر موجود تھا۔

"کیا ہوا......؟" ماجد نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے فون کیوں بند کردیا......؟"

"میں نے جس مقصد کے لیے فون کیا تھا وہ پورا ہوگیا۔" میں نے ماجد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جنید خان اور اس کا یونٹ یہاں پہنچ چکا ہے۔ مگر ابھی انہوں نے ریکارڈنگ شروع نہیں کی۔ فیمیل آرٹسٹ رخسار کا میک اپ ہورہا ہے۔"

"اوہ رخسار......" ماجد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اندھیرے کے باوجود بھی میں اس کے تاثرات دیکھنے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ تاریکی میں گویا دو جگنو سے جگمگا اٹھے تھے۔

"رخسار تو میری فیورٹ آرٹسٹ ہے۔" اس کی آواز سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ "میں رخسار کا بہت بڑا فین ہوں۔"

"رخسار کا یا اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا۔" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"دونوں چیزوں کا۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "رخسار کمال کی آرٹسٹ ہے۔"

ان لمحات میں ماجد کہیں سے بھی "کم گو" یا چپ شاہ نظر نہیں آتا تھا۔ دراصل انسان کی گویائی یا گفتار کا تعلق اس کی پسند اور ناپسند سے بھی ہوتا ہے۔ اگر انسان کا پسندیدہ موضوع سامنے ہو تو وہ خاموش نہیں رہ سکتا' کم یا زیادہ وہ بولتا ضرور ہے۔ یہی سب ماجد کے ساتھ بھی ہورہا تھا۔

"دیکھو باس!" میں نے ماجد کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "رخسار کے تم کتنے بڑے فین ہو یہ اس وقت ہمارا ٹاپک نہیں ہے۔ میں تمہیں رخسار کے حسن اور اداکاری سے اپنی آنکھوں کو فیض یاب کرنے سے تو نہیں روکوں گا مگر تمہارا فوکس جنید خان ہونا چاہیے۔ ہمیں کسی طرح جنید خان کو اس

بنگلے سے نکال کر کسی ایسی جگہ لے جانا ہوگا جہاں میں اس سے سوال جواب کرسکوں۔ مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"میں حالات کی نزاکت کو سمجھ رہا ہوں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "اگر اس بنگلے میں ممکن نہ ہوسکا تو ادھر ہی تم اس کا "انٹرویو" کرلینا ورنہ میرے پاس ہے ایک خفیہ ٹھکانا ہے۔ ہم اسے وہاں لے چلیں گے پھر تم تسلی سے بیٹھ کر اس سے پوچھتے رہنا جو بھی پوچھنا ہے۔"

"ویری گڈ۔" میں نے سراہنے والی نظر سے ماجد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم کسی اداکاری کے شوقین کی حیثیت سے بنگلے کے سامنے والے حصے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کروگے اور میں بنگلے کے عقبی حصے سے اندر کودوں گا۔ میں نے اس بنگلے کو اندر سے اچھی طرح دیکھا ہوا ہے لہٰذا میرے لیے کہیں بھی چھپنا یا نقل و حرکت کرنا مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ ہمارے سیل فونز سائیلنٹ موڈ پر رہیں گے اور ہم "ایس ایم ایس" یا بہ وقت ضرورت کال کرکے ایک دوسرے سے رابطہ رکھیں گے۔"

"ڈن......" ماجد نے پراعتماد انداز میں کہا۔ "لیکن۔"

اس نے جملہ نامکمل چھوڑا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا "لیکن کیا؟"

"میں سمجھ رہا ہوں' شوٹنگ میں ابھی لگ بھگ ایک گھنٹا باقی ہے۔ ابھی تو رخسار کا میک اپ ہو رہا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے' یہ لوگ پوری رات شوٹنگ کریں گے۔"

"تو......؟" میں نے سوالیہ نظر سے ماجد کی طرف دیکھا۔

میں نے توجہ سے اس کی بات سن تو لی تھی تاہم میری سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہا تھا۔

میرے "تو" کے جواب میں وہ وضاحت کرتے ہو بولا۔

"اسد! میں سمجھتا ہوں' جنید خان پر ہمیں اطمینان سے ہاتھ ڈالنا چاہیے' پہلے اگر اس معاملے کو نمٹالیں جو گولی کی لاش سے متعلق ہے تو یہ زیادہ اچھا ہوگا' جنید خان کہیں بھاگا نہیں جا رہا...... مجھے معلوم ہے' یہ لوگ رات گئے تک شوٹنگ کرتے ہیں اور پھر ان میں سے اکثر لوکیشن پر ہی پڑ کر سو جاتے ہیں۔"

"تمہیں شوبز کے لوگوں کے بارے میں بڑی معلومات ہیں؟" میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے ماجد کی طرف دیکھا۔

"ہاں یار...... کسی زمانے میں مجھے ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ کام اپنے نصیب میں نہیں تھا اور اب...... صرف ڈرامے دیکھ کر اپنا یہ شوق پورا کرلیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "بنگلے کے اندر شوٹنگ کب تک جاری رہتی ہے' یہ میرا مسئلہ نہیں' ہمیں جلد از جلد بنگلے میں داخل ہوکر اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لینا چاہیے پھر جس کام کا موقع پہلے ملے گا اسے پہلے کرلیں گے۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

ماجد کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں اور نہ ہی میں نے اسے اس سلسلے میں کریدنے کی کوشش کی تھی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ عاطف صاحب کے لیے بھروسے کا بندہ تھا اور انہوں نے میری مدد کے لیے اسے میرے ساتھ بھیجا تھا۔

ویسے تھوڑی دیر پہلے اس نے جنید خان کو اپنے کسی

ٹھکانے پر لے جانے کی بات کی تھی' اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ماجد کوئی چھپا رستم قسم کا بندہ تھا۔ "خفیہ ٹھکانے" ایسے ہی چلتا پرزہ قسم کے لوگوں کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ کم گو انسان اندر سے بہت گہرا معلوم ہوتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کے جواب میں کچھ کہتا' میرے سیل فون میں کال کی مخصوص تھرتھراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے احتیاطاً سیل فون کو وابریشن پر سیٹ کر رکھا تھا تاکہ اس کی گھنٹی سے کہیں میری موجودی کا اظہار نہ ہو۔

میں نے سیل فون کو جیب سے نکالا اور اس کے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی پھر چونک کر ماجد کی طرف دیکھا۔ اس نے پوچھا۔

"کس کا فون ہے؟"

"اسی بنگلے سے کال کی گئی ہے۔" میں نے سامنے والے بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے' مراد چیک کررہا ہو کہ تھوڑی دیر پہلے کس نے فون کیا تھا۔ میں نے اس کے فون' تک پہنچنے سے پہلے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

"فون اٹینڈ کرو باس۔" ماجد نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اس بنگلے والوں کو تمہارے نمبر کے حوالے سے کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے۔"

ماجد کا مشورہ انتہائی معقول اور برمحل تھا۔ اس سے میں اس کی ذہانت کا قائل ہوگیا۔ واقعی' اس وقت ہم جن سنگین حالات سے گزر رہے تھے ان میں بنگلے کے کسی بھی مکین کو کسی پراسرار کال کے حوالے سے کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اوکے کا بٹن دبا کر کال ریسیو کرلی۔

"ہیلو......!" میں نے آواز بدل کر بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔

اگلے ہی لمحے مراد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی...... "کون......؟"

"میں منظور بلوچ بات کررہا ہوں۔" میں نے ان جان بنتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کون ہو بھائی۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"میں اسی بنگلے سے تمہیں فون کررہا ہوں جہاں تھوڑی دیر پہلے تم نے کال کرکے شہبازی کے بارے میں پوچھا تھا۔" مراد نے بتایا۔

"اوہ......اچھا اچھا......!" میں نے بہ دستور بدلی ہوئی آواز اور دیہاتی لہجے میں کہا۔ "بھائی شہبازی سے میری بات کرادو۔"

"تم کون ہو اور شہبازی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" مراد نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

"میں شہبازی کے گاؤں کا ہوں۔" میں نے سادگی سے بتایا۔ "ادھر کراچی آیا ہوا تھا۔ سوچا' اس سے ملاقات کرتا جاؤں۔ کل میں واپس گاؤں چلا جاؤں گا۔

میں نے آج دن میں کئی مرتبہ شہبازی کو بات کرتے سنا تھا۔ اس کا لب ولہجہ میرے ذہن میں نقش تھا۔ اور یہ لب ولہجہ اندرون سندھ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا تھا جبھی میں نے اس وقت مراد سے بات کرتے ہوئے شہبازی کے گاؤں کا حوالہ دیا تھا۔

"شہبازی تو آج صبح ہی گاؤں گیا ہے۔" مراد کی مخصوص آواز سیل فون کے اسپیکر میں سنائی دی۔ "وہ تین چار دن کے بعد واپس آئے گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی! میں شہبازی سے گاؤں جاکر ہی مل لوں گا۔" میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

اختتامی کلمات کی ادائی کے بغیر دوسری جانب مراد نے ریسیور رکھ دیا جس سے یہی تاثر ابھرتا تھا کہ مراد میری طرف سے یعنی شہبازی کے ملاقاتی منظور بلوچ

کی جانب سے مطمئن ہوگیا تھا۔ میں ایک سکون بھری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

ویسے میں نے دن میں شہباز کے ساتھ جو شان دار سلوک کیا تھا اس کے پیش نظر اس وقت اسے کسی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ہونا چاہیے تھا یا اسپتال سے ضروری ٹریٹ منٹ کے بعد کسی پرسکون جگہ پر آرام فرما ہونا چاہیے تھا۔ یہ مقام آرام اسی بنگلے میں بھی ہوسکتا تھا اور کسی دوسری جگہ پر بھی!

"کیا ارادہ ہے باس۔" ماجد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "پیش قدمی کریں؟"

"اوکے......!" میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

ماجد نے سگریٹ کا آخری گہرا کش لگانے کے بعد اسے اپنے جوتے کے نیچے مسل دیا پھر ایک جانب دھواں "پھینکنے" کے بعد بولا۔ "موو......"

ہم دونوں طے شدہ پروگرام کے مطابق حرکت میں آگئے۔ ماجد کو سیدھا بنگلے کے گیٹ پر پہنچ کر اپنے لیے اندر داخلے کی راہ ہموار کرنا تھی۔ جب کہ مجھے بنگلے کے عقبی حصے سے اندر پہنچنا تھا۔ میں ماجد کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے بنگلے کے پہلو میں پہنچ گیا۔ پھر ایک جگہ پر رک کر ماجد کا انتظار کرنے لگا۔ یہ مقام بنگلے کے پہلو میں گیٹ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ یہاں کھڑے ہو کر میں ماجد اور بنگلے کا گیٹ کھولنے والے کے درمیان ہونے والی گفتگو کو آسانی سے سن سکتا تھا۔

ماجد بنگلے کے گیٹ پر پہنچا اور اطلاعی گھنٹی بجادی۔

کسی فلیٹ اور بنگلے کی گھنٹی بجانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ فلیٹ کی گھنٹی بجانے والے کو زیادہ دیر تک ردعمل کا انتظار نہیں کرنا پڑتا جبکہ بنگلے کے معاملے میں جب تک اندرونی حصے سے نکل کر کوئی گیٹ تک نہیں پہنچ جاتا' یہ انتظار بہرحال کرنا ہی پڑتا ہے۔ لگ بھگ ایک منٹ کے بعد بنگلے کا دروازہ کھلا' یعنی گیٹ کے اندر موجود چھوٹا دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی ماجد کی آواز سنائی دی۔

"السلام وعلیکم۔"

"وعلیکم السلام!" دوسری طرف سے روکھے لہجے میں کہا گیا۔

یہ آواز مراد کی نہیں تھی۔ میں مراد کی آواز کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس بنگلے میں مراد' عمران اور شہبازی کے علاوہ یونٹ کے لوگ تھے۔ شہبازی اگر بنگلے میں موجود بھی تھا تو وہ اٹھ کر گیٹ تک آنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ 'وعلیکم السلام' کہنے والا عمران بھی نہیں تھا۔ پھر یہ کون ہوسکتا تھا......!

میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ماجد کی آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ اندر سے برآمد ہونے والے سے کہہ رہا تھا۔

"میرا نام فیصل آزاد ہے۔ مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے......" اس کے لہجے میں لجاجت پائی جاتی تھی۔

"میں تمہیں نہیں جانتا بھائی۔" اس شخص نے کہا۔ "کیا کام ہے مجھ سے؟ کہاں سے آئے ہو......اور مجھے کیسے جانتے ہو......؟"

"جی' میں ادھر صفورا گوٹھ میں رہتا ہوں۔" ماجد کمال کی اداکاری کر رہا تھا۔ "ادھر ایک بنگلے میں کام کرتا ہوں' ابھی گھر سے ہوکر آرہا ہوں۔"

"تم ادھر کسی بنگلے میں کام کرتے ہو اور گھر سے ہوکر آرہے ہو۔" اس شخص نے شک بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی بھائی؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔" ماجد نے کہا۔ "شام کے وقت میں ادھر بنگلے سے چھٹی کر کے اپنے گھر صفورا گوٹھ چلا جاتا ہوں۔ آج بھی میں نے ایسا ہی کیا تھا۔"

"جب تم اپنے گھر چلے گئے تھے تو پھر واپس کیوں

آئے۔" اس شخص کی آواز میں بیزاری پیدا ہوگئی۔ "اور واپس بھی آئے ہو تو یہاں کیوں......؟"

"یہاں میں نے دیکھا تھا......شام کے وقت!"

"کیا دیکھا تھا؟" پوچھا گیا۔

"میڈم رخسار کو دیکھا تھا میں نے۔" ماجد نے کہا۔

"کون میڈم رخسار؟" تیکھے لہجے میں کہا گیا۔ "میں تو کسی میڈم رخسار کو نہیں جانتا۔ تم یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کررہے ہو......؟"

"دیکھیں بھائی صاحب! آپ مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔" ماجد نے منت ریز لہجے میں کہا۔ "میں نے خود میڈم رخسار کو ان کے یونٹ کے ساتھ اس بنگلے پر آتے اور ان کی گاڑی کو اندر داخل ہوتے دیکھا ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتی ہیں۔ وہ ٹی وی کی معروف اداکارہ ہیں۔ میں ان کا بہت بڑا فین ہوں۔ میں انہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا۔ وہ یقیناً یہاں کسی شوٹنگ وغیرہ کے لیے آئی ہوں گی۔ میری آپ سے چھوٹی سی درخواست ہے اگر مان لیں گے تو بڑی نوازش ہوگی۔ اگر آپ چاہو تو میں......آپ کی کچھ خدمت بھی کرسکتا ہوں۔"

"خدمت......کیا مطلب؟"

"مطلب' کچھ چائے پانی......!"

دوسری طرف ایک لمحے کے لیے خاموشی چھاگئی۔ غالباً وہ آدمی سوچ میں پڑگیا ہوگا۔ ماجد نے کہا۔

"آپ کا کچھ نہیں جائے گا بھائی صاحب۔ آپ مجھے تھوڑی دیر تک رخسار صاحبہ کی شوٹنگ دیکھنے کا موقع دیں۔ میری حسرت ہے کہ میں میڈم رخسار کو قریب سے دیکھوں۔ اتفاق سے آج اگر اس خواہش کو پورا کرنے کا موقع مل رہا ہے تو آپ تھوڑی مہربانی کریں۔"

"اچھا اچھا' ٹھیک ہے۔" دوسری طرف سے بڑے سرسری انداز میں کہا گیا۔ "اور یہ پیسے جیب میں رکھ لو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ تم غریب آدمی ہو۔ یہ تمہارے بیوی بچوں کے کام آجائیں گے۔"

اس شخص کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ماجد نے "چائے پانی" کے ذیل میں کوئی عملی مظاہرہ کرنے کی کوشش بھی کرڈالی تھی۔ یعنی اپنی جیب سے کوئی رقم وغیرہ نکال کر شو کی تھی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی صاحب۔" ماجد نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا پھر ایک تکا چلایا۔ "کیا آپ اس بنگلے پر نئے آئے ہیں۔ ادھر سے میرا اکثر گزر ہوتا ہے۔ میں نے آپ کو پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں آج ہی یہاں آیا ہوں۔" ماجد کا تکا تیر بن کر نشانے پر لگا تھا۔ اس شخص نے بتایا۔ "اب میں ادھر ہی ڈیوٹی کروں گا۔ میں تمہیں اندر آنے کی اجازت تو دے رہا ہوں مگر ایک بات کا خیال رکھنا......"

"کون سی بات؟" ماجد نے پوچھا۔

"تم زیادہ دیر تک یہاں نہیں رکو گے۔" اس شخص نے تنبیہہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "اپنا شوٹنگ دیکھنے کا شوق پورا کر کے تم واپس چلے جاؤ گے......"

"ٹھیک ہے بھائی" ماجد نے فرماں برداری سے کہا۔ "آپ فکر نہ کرو' میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"آجاؤ......" اس شخص نے ماجد کو بنگلے کے اندر داخلے کا پروانہ تھماتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں' تمہیں اس شوٹنگ کی خبر کیسے ہوگئی......" وہ خود کلامی والے انداز میں بڑبڑایا۔ "حالانکہ اس معاملے کو نہایت ہی خفیہ رکھا گیا تھا۔ یونٹ والوں کی وین اور دیگر گاڑیوں کو بھی بنگلے کے اندر پارک کیا گیا ہے تاکہ کسی کا اس طرف دھیان نہ جائے۔"

میں اس شخص کی مزید "بڑبڑاہٹ" سماعت کرنے

کے لیے وہاں نہیں رکا اور دبے قدموں بنگلے کے عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ ماجد بڑی خوش اسلوبی سے اس بنگلے کے اندر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

بنگلے کے اندر ہمارے داخلے کا سیدھا اور آسان طریقہ تو یہی تھا کہ ہم کسی پرسکون عقبی حصے سے دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ جائیں مگر ماجد نے جو فارمولا آزمایا تھا وہ خاصا دلچسپ، پرکشش اور منطقی تھا۔ اس سے ماجد کو اندرونی ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے میں بڑی آسانی رہتی۔

جس شخص نے ماجد کو بنگلے کے اندر جانے کی اجازت دی تھی۔ وہ ایک نیا اضافہ تھا جیسا کہ اس نے خود بھی ماجد کو بتایا تھا کہ وہ آج ہی یہاں آیا ہے اور یہ کہ ......اب وہ اس بنگلے میں ڈیوٹی دے گا۔ میں نے اس نئے ملازم کو دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی اس کے نام سے واقف تھا تاہم ماجد اور اس کے بیچ ہونے والی گفتگو سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس کے سینے میں ایک نرم اور دوسروں کی خواہشات کا احترام کرنے والا دل دھڑکتا تھا۔ اگر وہ بھی گوبی، عمران، شہبازی اور مراد جیسا کوئی سفاک اور سخت گیر انسان ہوتا تو ماجد کو ہرگز ہرگز بنگلے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دیتا بلکہ اسے باہر ہی سے بھگا دیتا۔

انہی خیالات کو میں اپنے ذہن میں بسائے بنگلے کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ ماجد لیگل وے میں اس بنگلے کے اندر رسائی حاصل کرچکا تھا۔ اب مجھے ان لیگل وے اختیار کرنا تھا اور یہ کام میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ ٹھیک دو منٹ کے بعد میں بنگلے کے اندر تھا۔

یہ بنگلے کا وہی عقبی حصہ تھا جہاں ایک لان بھی آباد تھا۔ پہلے میں آج دن میں یہاں کا مکمل سروے کرچکا تھا لہٰذا رات کی تاریکی میں بھی مجھے یہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ میں نے گھوم کر ماحول کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا یہ بہت ضروری تھا اس سن گن سے پوزیشن کلیئر ہوجاتی۔ لیکن ابھی ایک قدم بھی اٹھا نہیں پایا تھا کہ موبائل فون جاگ اٹھا۔

یہ ماجد کی کال تو نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ جتنے سازگار ماحول میں بنگلے کے اندر داخل ہوا تھا اس کے مطابق، اتنی جلدی اسے مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی تھی۔ یہ یقیناً کسی اور ہی کی کال تھی۔

میں نے کال ریسیو کرنے سے پہلے چوکنا انداز میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ وہاں تاریکی اور گہری خاموشی کا راج تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، یہ دو میں سے کسی ایک شخص کی کال ہوسکتی تھی۔ نمبر ایک مراد، وہ دوبارہ اس نمبر کو چیک کرسکتا تھا۔ نمبر دو، عاطف صاحب، یہی سوچتے ہوئے میں نے سیل فون جیب سے نکال لیا۔ میرے اندازے کا دوسرا حصہ درست نکلا تھا۔ وہ عاطف صاحب کی کال تھی۔

''ہیلو سر!'' میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''اسد! سب خیریت ہے نا؟'' ان کی مخصوص آواز ابھری۔

''یس سر!'' میں نے مختصراً بتایا۔ ''ہم دونوں بنگلے کے اندر داخل ہوچکے ہیں۔ جنید خان اپنے یونٹ کے ساتھ شوٹنگ کے لیے یہاں پہنچا ہوا ہے۔ یہ لوگ بنگلے کے ہال میں تقریباً ساری رات ڈرامے کی ریکارڈنگ کریں گے لیکن......''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے رکا تو عاطف صاحب نے جلدی سے پوچھا ''لیکن کیا مسٹر اسد؟''

''شاید میں صبح تک انتظار نہ کرسکوں۔''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میری یہی کوشش ہوگی کہ جلد از جلد میں جنید خان کو اپنے قابو میں لاکر اس کی زبان سے یہ راز اگلوانے میں کامیاب

ہوجاؤں کہ اس نے شیروانی کے حکم پر فرحانہ کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ میں جنید خان کے گھر کا ایڈریس جان چکا ہوں، مگر ظاہر ہے، فرحانہ کو اس نے اپنے گھر میں قید نہیں کیا ہوگا......!''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے مسٹر اسد!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''جرائم پیشہ افراد کے دو بڑے گروہ یا دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک وہ جو چوبیس گھنٹے سرتاپا جرائم کی دلدل میں دھنسے رہتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی سوشل لائف نہیں ہوتی جبکہ دوسری قسم کے مجرم افراد کی ایک معزز معاشرتی زندگی بھی ہوتی ہے۔ معاشرہ ان کے کالے کرتوتوں اور گھناؤنے کاروبار سے واقف نہیں ہوتا کیونکہ یہ اپنے کالے دھندے کو معاشرتی زندگی سے بہت دور رکھتے ہیں۔ یہ مہذب شریف بدمعاش اول الذکر جرائم پیشہ افراد سے زیادہ خطرناک اور قابل مذمت ہیں۔ ندیم شیروانی اور جنید خان کا شمار انہی ناسوروں میں ہوتا ہے۔''

''جی سر...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''میں جنید خان کی زبان کا تالا کھول کر یا توڑ کر صبح سے پہلے اپنی فرحانہ تک پہنچ جاؤں گا۔''

''وِش یو گڈ لک مسٹر اسد۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''میں اب فون کرکے آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ یہ ماجد بہت کام کا بندہ ہے۔ آپ کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔''

''جی سر...... ماجد کتنا کام کا بندہ ہے، یہ مجھ پر کھلنا شروع ہوگیا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

انہوں نے نیک خواہشات کے ساتھ سیلولر رابطہ موقوف کردیا۔ میں نے سیل فون کو اپنی جیب میں رکھا اور ماحول میں حاضر ہوگیا۔

یہ وہی مقام تھا جہاں سے میں پہلے بھی اس بنگلے کے اندرونی حصے میں داخل ہوا تھا لیکن اب کی بار مجھے بے دھڑک اندر کا رخ نہیں کرنا تھا۔ یہ بہت ہی نازک اور حساس دورہ تھا۔ اگر ایک بار جنید خان میرے ہاتھ سے نکل جاتا تو دوبارہ اس تک رسائی اتنی آسان نہ ہوتی جیسی اتفاق سے ابھی ہوگئی تھی۔ لہٰذا ایک ایک قدم پھونک کر اٹھانے کی ضرورت تھی۔

ماجد کے ساتھ میں نے جو پروگرام طے کیا تھا اس کے مطابق، مجھے بنگلے کے اندر کسی بھی محفوظ مقام پر دبک کر بیٹھ جانا تھا۔ ماجد، جنید خان کے یونٹ میں گھل مل جاتا اور میسج وغیرہ کے ذریعے مجھے پل پل کی خبر دیتا رہتا۔ شوٹنگ دیکھنے کے بہانے اسے جنید خان پر گہری نگاہ رکھنا تھی اور جیسے ہی کوئی مناسب موقع ہاتھ لگتا، وہ جنید خان کو گھیر کر میرے پاس لے آتا یا مجھے اس کے پاس پہنچادیتا۔ اس کے بعد ہی کوئی کارروائی عمل میں لائی جاتی۔

بنگلے کا عقبی حصہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے لمحے بھر کے لیے سوچا پھر بنگلے کی چھت پر جانے کا سوچ کر اس گھوڑی کی جانب بڑھ گیا جس کی مدد سے میں دن میں بھی چھت کی سیر کرچکا تھا۔ چھت ایک ایسی محفوظ پناہ گاہ تھی جہاں میری موجودی کا کسی کو شک نہیں ہوسکتا تھا اور میں بھی بنگلے کے گردوپیش کے علاوہ گیٹ کا بھی بہ خوبی نظارہ کرسکتا تھا۔ چھت پر سے بنگلے کے گیٹ کا اندرونی اور بیرونی حصہ بڑا واضح نظر آتا تھا۔

میں نے گھوڑی پر قدم رکھنے سے پہلے ماجد کو میسج کیا ''ہاں باس! کیا پوزیشن ہے؟''

اس کا رپلائی آیا۔ ''میں اس ہال میں پہنچ گیا ہوں جہاں شوٹنگ ہونا ہے۔ جنید خان بھی یہاں سیٹ پر موجود ہے۔''

''کیا شوٹنگ ابھی شروع نہیں ہوئی؟'' میں نے

پوچھا۔

"بس شروع ہونے ہی والی ہے۔" اس نے ریپلائی میسج کیا۔ "میں ان لوگوں میں گھل مل گیا ہوں۔ تم جب بھی کہو گے' کارروائی شروع کر دیں گے۔"

"یہ کل کتنے افراد ہیں؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"یونٹ تو نو افراد پر مشتمل ہے۔" اس نے بتایا "ان کے علاوہ بنگلے کے ملازموں میں مجھے دو افراد ہی نظر آئے ہیں..... گیٹ والے ملازم کے علاوہ۔"

"یہ دونوں مراد اور عمران ہو سکتے ہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا پھر پوچھا۔ "تم پر کسی کو شک تو نہیں ہوا.....؟"

"بالکل نہیں۔" اس نے بتایا۔ "میں نے رخسار کو اپنی نگاہ کا مرکز و محور بنا رکھا ہے۔ تمہیں میسج کرتے ہوئے بھی میری نظر اسی پر ٹکی ہے۔ یہ لوگ مجھے رخسار کا سچا پرستار سمجھ رہے ہیں۔ ویسے ملازمین میں سے اس وقت ہال کے اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ لہٰذا پریشانی والی کوئی بات نہیں۔"

"جب انسان یہ سوچ لیتا ہے کہ پریشانی والی کوئی بات نہیں تو اسی وقت کوئی پریشانی سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔" میں نے ٹائپ کیا۔ "ماجد! تمہیں بہت زیادہ احتیاط کرنا ہے۔ اتنے ہجوم میں جنید خان پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں ہوگا۔ جب یہ لوگ بریک وغیرہ کریں گے تو ہم کوئی عملی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس کا ریپلائی آیا۔ "جب ایسا موقع آیا تو میں تمہیں انفارم کر دوں گا۔ تم نے کہاں پوزیشن لے رکھی ہے؟"

"بنگلے کی چھت پر۔" میں نے بتایا۔ "تمہارے اشارے پر میں دو منٹ کے اندر جہاں کہو گے' پہنچ جاؤں گا۔"

"اوکے..... اب میں ان لوگوں کے ساتھ مصروف ہو رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے لکھا۔ "اپنے سیل فون میموری میں سے سارے میسجز ڈیلیٹ کر دو۔ اگر بدقسمتی سے تمہارا سیل فون دشمن کے کسی بندے کے ہاتھ لگ گیا تو ہمارا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔ اب ہمارے درمیان اسی وقت رابطہ ہوگا جب جنید خان پر ہاتھ ڈالنے کا سنہری موقع ابھر کر سامنے آئے گا۔"

"اوکے!" اس کی جانب سے مختصر سا ریپلائی آیا۔

❁.....❁.....❁

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی.....!

موسم کوئی بھی ہو' رات دن کی لمبائی کیسی بھی ہو مگر رات کے بارہ بجے کو مڈ نائٹ یعنی آدھی رات ہی کہا جاتا ہے اور اس وقت سوا بارہ ہو رہے تھے۔ جبھی میں نے رات کے آدھا سفر طے کرنے کی بات کی ہے۔ میری کلائی پر رسٹ واچ موجود نہیں تھی اور اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب سے موبائل فون کا استعمال عام ہوا ہے' گھڑی کی اوقات دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب صرف گھڑی کے سچے عاشقوں کی کلائی پر ہی گھڑی دیکھنے کو ملتی ہے ورنہ ٹائم دیکھنے کے تمام تر معاملات کو سیل فون کی مہربانی سے نمٹا لیا جاتا ہے۔

میں بنگلے کی چھت پر ایک ایسے مقام پر جما بیٹھا تھا جہاں سے محض دو منٹ میں بنگلے کے اندر کسی بھی حصے تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ اس دوران میں' تھوڑے تھوڑے وقفے سے ماجد سے بھی چیٹ ہو رہی تھی۔ اس کے آخری میسج سے مجھے پتا چلا تھا کہ ڈراما یونٹ نے ایک بجے بریک کرنے کا اعلان کیا ہے۔ وہ چائے کے ساتھ ہلکا پھلکا ناشتا کریں گے اور دوبارہ اپنے کام میں جت جائیں گے۔ یہ پندرہ بیس منٹ کا وقفہ کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے نہایت ہی موزوں تھا اور ماجد نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ اس بریک کے درمیان جنید خان کو ہجوم سے نکال کر سائیڈ لائن کرنے کی کوشش کرے گا۔ مجھے اس کی کوشش پر کوئی شبہ تو نہیں تھا تاہم اصل صورت حال تو وقت آنے پر ہی سامنے آ سکتی تھی۔ ایک بجنے میں ابھی پونا گھنٹا باقی تھا۔ میں بنگلے کے بیرونی گیٹ پر نگاہ جمائے جمائے اپنے تازہ ترین حالات پر غور کرنے لگا۔

جب بھی میں خود پر یا اپنے حالات پر نگاہ ڈالتا تھا تو درمیان آپوں آپ فرحانہ کی طرف چلا جاتا تھا۔ جب سے میرے دل میں فرحانہ کی محبت نے انگڑائی لی تھی' میرا ذہن سب سے زیادہ اسی کے بارے میں سوچتا تھا اور یہ بھی عجیب ستم ظریفی تھی کہ فرحانہ کی محبت کے انکشاف کے ساتھ ہی وہ مجھ سے دور چلی گئی تھی۔ حالات کے بے رحم ہاتھوں نے اسے میری نظر سے اوجھل کر دیا تھا۔ مجھ سے چھین لیا تھا۔

بعض مخصوص حالات میں وقت بہت بے رحم ہو جاتا ہے۔ یہ وقت ظالم اور سفاک لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس وقت بھی میں ندیم شیروانی کے ہاتھوں' بے پناہ ذہنی اذیت اٹھا رہا تھا۔ ظالم وقت نے شیروانی کے ساتھ ایکا کر لیا تھا اور جنید خان اس مذموم کارروائی میں شیروانی کا مہرہ بنا ہوا تھا۔ میری فرحانہ اسی منحوس جنید خان کے قبضے میں تھی اور ان شاء اللہ یہ جنید خان بہت جلد میرے قبضے میں آنے والا تھا۔

اس سوچ کے ساتھ ہی میرے اعصاب تن گئے۔ مجھے اپنے رگ و پے میں زہریلا سیال سا دوڑتا محسوس ہوا۔ فرحانہ کی بے بسی کے احساس نے جنید خان کے لیے میرے دل و دماغ کو غم و غصے اور نفرت سے بھر دیا تھا۔ جی یہی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچوں اور اس کی گردن کو اپنے بازو کی گرفت میں جکڑ کر اتنی قوت سے دباؤں کہ فرحانہ کا پتا ٹھکانا اس کی زبان سے پھسل جائے۔

میں جیسا سوچ رہا تھا' یہ ناممکن نہیں تھا۔ میں اپنی اس سوچ پر صد فیصد عمل درآمد کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا مگر موجودہ صورت حال میں یہ میرا ایک جذباتی فیصلہ ہوتا جو بنے بنائے کھیل کو بگاڑ سکتا تھا۔ یہ لمحات ہوش میں رہنے کے تھے۔ جوش کوئی ایسا گل بھی کھلا سکتا تھا جس کے کانٹے میرے ہاتھوں کو لہولہان کر کے فرحانہ کو مجھ سے اور بھی دور لے جا سکتے تھے اور میں فرحانہ کی مزید دوری برداشت نہیں کر سکتا تھا میں اس کے بغیر خود کو ادھورا اور کھوکھلا محسوس کرنے لگا تھا۔ پتا نہیں' یہ میرا پاگل پن تھا یا محبت کا اعجاز..... فرحانہ میری پہلی اور آخری ضرورت' میری خواہش' میری زندگی بن کر رہ گئی تھی۔

میں نے ایک بار پھر سیل فون کے اسکرین پر وقت دیکھا۔ بارہ بج کر اٹھارہ منٹ ہو رہے تھے۔ یونٹ والوں کو موجودہ سین مکمل کرنے کے بعد لگ بھگ ایک بجے بریک کرنا تھا۔ گویا اب بھی میرے پاس چالیس' پینتالیس منٹ کا وقت باقی تھا اور یہ وقت مجھے سیکنڈ سیکنڈ کر کے گزارنا تھا۔

میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں نیچے جا کر شوٹنگ دیکھوں۔ ہال کے اندر داخل ہو کر ڈرامے کی ریکارڈنگ دیکھنا تو خطرے سے خالی نہیں تھا تاہم میں بنگلے کے بیرونی حصے میں رہ کر اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ جس ہال میں شوٹنگ کا عمل جاری تھا اس کی کھڑکیاں بنگلے کے پہلو میں بھی کھلتی تھیں۔ ممکن تھا کہ ان کھڑکیوں کا کوئی پردہ تھوڑا بہت سرکا رہ گیا ہو اور مجھے اندر جھانکنے کا موقع مل جائے...

اس امر کے امکانات اگرچہ نہ ہونے کے برابر تھے تاہم

طالع آزمائی میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔

میں گھوڑی کی مہربانی سے چھت پر سے نیچے اتر آیا۔ پھر بنگلے کے عقبی حصے سے محتاط قدم اٹھاتے ہوئے پہلو میں نکل آیا۔ ہر طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ مراد اور اس کے ساتھی عمران نے گھوم پھر کر بنگلے کی نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو ان میں سے کوئی مجھے ضرور نظر آ جاتا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ مطمئن تھے البتہ درمیانے قد کا ایک شخص مجھے ایک دوبار گیٹ کے قریب آتا جاتا دکھائی دیا تھا۔ یہ چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ یہ وہی نیا ملازم ہوگا جس کی ماجد کے ساتھ بنگلے کے گیٹ پر گفتگو ہوئی تھی۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ بنگلے کے پہلو میں چلتے ہوئے اس طرف نکل آیا جدھر میرے اندازے کے مطابق، ہال کی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ میں نے بہ غور کھڑکیوں کا جائزہ لیا تو ہال کے اندر روشنی کی تصدیق ہوگئی۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ رات میں شوٹنگ ہو رہی ہو اور لائٹس آن نہ کی جائیں۔ ہال اندر سے پوری طرح روشن تھا اور کچھ اس نوعیت کے سماعتی اشارے بھی مل رہے تھے کہ اندر پورے دھڑلے سے شوٹنگ ہو رہی ہے کہتے ہیں، ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے، اندرونی مناظر تک بصارتی رسائی کے لیے راستہ تلاش کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اس مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

کھڑکیوں کے پردے بڑی احتیاط کے ساتھ برابر کیے گئے تھے تاہم ایک جگہ سے معمولی سی درز کھلی رہ گئی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر درز والے مقام پر لگایا، پھر اس پیالے میں اپنا چہرہ فٹ کر دیا۔ اگلے ہی لمحے میری نگاہ نے ہال کے اندرونی ماحول میں رسائی حاصل کرلی۔ اس معمولی سی درز کے توسط سے پورے ہال کو دیکھنا تو ممکن نہیں تھا تاہم وہی بات کہ کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا اچھا۔

میں لگ بھگ پانچ منٹ تک اندر کا نظارہ کرتا رہا اندر ایک بہت ہی رومانٹک سین کی شوٹنگ جاری تھی ڈرامے کے ہیرو اور ہیروئن میں جذباتی مکالموں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ میں ان کی آوازیں سننے سے قاصر تھا۔ تاہم ہونٹوں کی جنبشیں اور چہروں کے تاثرات سے سین کی کیفیت اور ڈیمانڈ کو سمجھنے میں مدد مل رہی تھی۔

ماجد نے رخسار کی تعریف کچھ غلط نہیں کی تھی۔ وہ واقعی حسن وخوب صورتی کا مرقع تھی۔ اس کے انگ انگ سے جوبن پھوٹ رہا تھا۔ اس کے روبرو دکھائی دینے والا ہیرو بھی وجاہت میں اپنی مثال آپ تھا تاہم رخسار پر تو گویا میری نگاہ جم کر رہ گئی تھی۔ اس کا حسن حیرت زدہ کر دینے والا تھا۔ ماجد اگر اس کا دیوانہ تھا تو اس میں اچنبھے والی کوئی بات نہ تھی۔

ٹی وی اسکرین پر جب کوئی ڈراما چل رہا ہوتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے مگر اس کی شوٹنگ اتنی ہی بور ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے شارٹس کو بار بار ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ ری ٹیک، ری ٹیک، ری ٹیک...... اور پھر کہیں جا کر کوئی سین اوکے ہوتا ہے...... اس دوران میں ڈائریکٹر کی ڈانٹ پھٹکار بھی جاری رہتی ہے۔

ہال کے اندر اس وقت جس ڈرامے کی شوٹنگ ہو رہی تھی اس کا ڈائریکٹر جنید خان تھا۔ اسی بندے کو دام میں لانے کے لیے میں پوری تیاری کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ میں جس درز سے آنکھیں چپکائے ہال کے اندرونی مناظر دیکھ رہا تھا وہاں سے ایک دوبار مجھے جنید خان کی پشت تو دکھائی دی تھی مگر ابھی تک اس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔

میرے اشتیاق میں ابال آیا اور میں روشن دان تک پہنچنے کے لیے اچک کر کھڑکی کے چھجے پر چڑھ گیا۔ یہ

بمشکل چھ انچ چوڑا رہا ہوگا۔ میں نے چھجے پر مضبوطی سے پاؤں جمائے اور پورے قد سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اب روشن دان میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اس کھلے روشن دان سے ہال کا منظر پوری وضاحت کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور توجہ ہال کے اندر مرکوز کر دی۔

ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ ہال میں آٹھ افراد اور بھی نظر آ رہے تھے۔ کیمرا مین، لائٹ مین بوم آپریٹر، میک اپ مین اسسٹنٹ ڈائریکٹر عمران علی اور ڈائریکٹر جنید خان، ایک ادھیڑ عمر خاتون فل میک اپ میں ہال کے ایک صوفے پر بیٹھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ فریم کے اندر نہیں تھیں تاہم اس کی سجاوٹ اور سنگار سے اس بات کا یقین ہوتا تھا کہ آج کی شوٹنگ میں اس کے سین بھی ریکارڈ ہونا تھے۔ ان تمام افراد کے علاوہ ماجد بھی مجھے دکھائی دیا۔ وہ ڈائریکٹر جنید خان سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا بہ ظاہر بڑے انہماک سے شوٹنگ دیکھ رہا تھا تاہم مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ اس کی تمام تر توجہ جنید خان پر ہی لگی ہوئی تھی۔

جنید خان ایک کرسی پر بیٹھا بڑے اطمینان سے شوٹنگ دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک میز پر مانیٹر رکھا ہوا تھا۔ جو ڈائریکٹ کیمرے سے اٹیچ (منسلک) تھا لہٰذا کیمرہ جو کچھ بھی ریکارڈ کر رہا تھا وہ بہ عین اس مانیٹر پر بھی ڈسپلے ہو رہا تھا گویا وہ مانیٹر جنید خان کو شوٹنگ کا رزلٹ دکھا رہا تھا اور اسی رزلٹ کی روشنی میں جنید خان فریم میں موجود آرٹسٹوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ عمران علی کے ہاتھ میں اسکرپٹ دکھائی دے رہا تھا اور وہ جنید خان کی ہدایات کے مطابق آرٹسٹوں کو گائیڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مجھے اس سست رفتار بور شوٹنگ سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ بلکہ میری تمام تر دلچسپی صرف اور صرف جنید خان میں تھی اور میں بڑی توجہ سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

جنید خان درمیانے قد اور بھاری جسم کا مالک ایک سانولا شخص تھا۔ چہرہ کلین شیو اور سر پر مناسب بال، اس کی عمر پچاس سے تجاوز نظر آتی تھی۔ اس کی آواز میں مخصوص قسم کا تحکم پایا جاتا تھا۔ اس کی آواز میں نے پہلے اپنے سیل فون پر بھی سنی تھی جب اس نے اپنے اسسٹنٹ عمران علی کو رخسار کے حوالے سے کچھ ہدایات دی تھیں۔ لیکن اس کی شکل، میں ابھی پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر مراد یا عمران مجھے اس ہال میں کہیں دکھائی نہ دیے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ اس وقت اسی ڈرائنگ روم میں موجود ہوں گے جہاں میں نے دن میں مراد سے ایک بھرپور "ملاقات" کی تھی۔ یہ اندازہ میں نے اس بناء پر بھی قائم کیا تھا کہ میں نے انہیں بنگلے کے بیرونی حصے میں کہیں گشت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس وقت شیروانی کے ملازمین میں سے بنگلے پر صرف تین افراد تھے۔ مراد، عمران اور وہ نیا بندہ ماجد کی جس سے گیٹ پر ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ شہبازی بچتا تھا۔ اول تو وہ اس وقت بنگلے پر موجود ہی نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو کسی کمرے میں بے ہوش پڑا، خواب میں میرے دیے ہوئے زخموں کو چاٹ رہا ہوگا۔

میں بڑے انہماک سے ہال کے اندر ہونے والی ایکٹی ویٹیز کو ملاحظہ کر رہا تھا کہ میں نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ جنید خان نے اپنی جیب سے سیل فون نکال کر اس کے اسکرین کو دیکھا تھا۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر جمی تھی اور مجھے وہاں عجیب سے تاثرات ابھرتے دکھائی دیے تھے۔ وہ یقیناً کوئی اہم فون تھا۔ اگلے ہی لمحے میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ جنید خان کال ریسیو کرنے کے لیے کرسی سے اٹھ کر ہال کے

ایک دور افتادہ کونے میں چلا گیا تھا۔ یہ کسی ایسی شخصیت کی کال تھی جو جنید خان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا اور وہ اپنے یونٹ کے سامنے اس سے گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کون ہوسکتا تھا..... کیا شیروانی؟

اس سوال نے میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑا دی اور میں شوٹنگ کو بھول بھال کر شیروانی کے بارے میں سوچنے لگا۔ گولی سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق' آج آدھی رات کو شیروانی اپنے امریکی دوست جوزف کے ساتھ بیرون ملک پرواز کرنے والا تھا۔ کہیں یہ کال اسی سلسلے میں تو نہیں تھی؟ کہیں شیروانی جنید خان کو فرحانہ کے حوالے سے کوئی نئی ہدایات تو نہیں دینے والا تھا......؟

یہ سوالات کسی برمے کی مانند میرے دماغ کو چھید رہے تھے لیکن میں چونکہ جنید خان کی سیلولر گفتگو سننے سے قاصر تھا لہٰذا میرے اندر کی بے چینی سات دیں آسمان کو چھو رہی تھی۔ یہ بہت ہی بے بسی کے لمحات تھے لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ ماجد نے تیزی سے بدلتی ہوئی اس صورت حال کو بھانپ لیا تھا اور اس کی عقابی نگاہ بڑی باریک بینی سے ہر چھوٹی بڑی شے کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے نزدیک کھڑا بہ ظاہر ڈرامے کی ریکارڈنگ دیکھ رہا تھا مگر اس کا دھیان کسی اور ہی طرف لگا ہوا تھا۔

چند سیکنڈ بعد جنید خان واپس پلٹا اور اس نے اپنے اسسٹنٹ عمران علی کو اشارے سے پاس بلایا۔ جنید خان کے چہرے کے تاثرات تو یہی بتاتے تھے کہ معاملہ گمبھیر ہے مگر اس گمبھیرتا کا اندازہ لگانا فی الحال میرے بس میں نہیں تھا۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کھڑکی کے چھجے سے نیچے اتر آیا۔ میری چھٹی حس نے اشارہ دے دیا تھا کہ حرکت میں آنے کا لمحہ آن پہنچا ہے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ”حرکت میں برکت ہے“ اور یہ برکت فوراً ظاہر بھی ہوگئی۔ میں کھڑکی چھجے سے کودنے کے بعد اپنے قدموں پر سنبھل کے کھڑا ہوا ہی تھا کہ سیل فون میں تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکال کر چیک کیا تو ماجد کا میسج دکھائی دیا۔

”جنید خان کو کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے۔ وہ اپنے اسسٹنٹ کو کام کے حوالے سے ضروری ہدایات دے رہا ہے۔ اس سین کے بعد شوٹنگ پیک اپ ہوجائے گی۔ جنید خان جانے ہی والا ہے تم جہاں بھی ہو بنگلے کے گیٹ پر پہنچ جاؤ......!“

میں نے اوکے ٹائپ کرکے ریپلائی کردیا۔ ان لمحات میں اس سے زیادہ طویل میسج ٹائپ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے چوکنا انداز میں اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سیل فون کو اپنی جیب میں رکھا اور بنگلے کے پہلو میں محتاط قدم اٹھاتے ہوئے کارپورچ کی جانب بڑھنے لگا۔ میری معلومات کے مطابق' ڈراما یونٹ والوں نے اپنی گاڑیاں بنگلے کے اندر پارک کی تھیں۔ یہ بات نئے ملازم نے ماجد کو بتائی تھی۔ اور میں نے سن لی تھی۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان گاڑیوں میں جنید خان کی گاڑی کون سی ہوگی۔ جنید خان کو اندرونی ہال سے نکل کر اپنی گاڑی تک پہنچنے میں دو منٹ لگ سکتے تھے جبکہ وہ مقام مجھ سے محض چالیس پچاس سیکنڈ کی دوری پر تھا۔ اگر میں جنید خان کی آمد سے قبل کارپورچ میں موجود ہوتا تو بہ آسانی اس سے نمٹا جاسکتا تھا۔

وہ بہت ہی اعصاب شکن لمحات تھے۔ ان لمحات میں میرا ذہن کسی برق رفتار کمپیوٹر سے بھی زیادہ تیز کام کررہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کارپورچ تک رسائی حاصل کرتا' میرے دماغ نے مشورہ دیا...... بنگلے میں ہاتھا پائی کرنے سے بہتر ہے کہ جنید خان کا تعاقب کیا جائے' پھر راستے میں کہیں اسے گھیر کر اپنا مقصد حاصل کرلیا جائے۔

میں اس وقت جس جگہ پر تھا وہاں سے کارپورچ کی ایک جھلک نظر آرہی تھی اور وہاں دو تین گاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک وین اور دو یا تین کاریں تھیں۔ یہ تمام کی تمام گاڑیاں ڈراما یونٹ والوں کی ہی ہوسکتی تھیں۔ کیونکہ اس بنگلے کی واحد گاڑی گرے سوزوکی ہائی روف کو تو آج سہ پہر میں کوئی پراسرار چور اڑا لے گیا تھا۔

میں کارپورچ سے چند قدموں کی دوری پر تھا کہ میں نے جنید خان کو بنگلے کی اندرونی حصے سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ غیر متوقع پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا جس سے معاملے کی سنگینی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے پہلو میں مجھے ماجد بھی نظر آیا۔ پتا نہیں' ماجد نے ایسی کون سی حکمت عملی اختیار کی تھی کہ وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے جنید خان کے ساتھ اس کی معیت پر اعتراض نہیں اٹھایا تھا' ماجد کے انداز اور رویے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ جنید خان ہی کا کوئی ساتھی ہو۔

کسی بھی لمحے جنید خان اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اس بنگلے سے روانہ ہونے والا تھا۔ ان لمحات میں مجھے فوراً سے پیشتر آگے بڑھ کر صورت حال کو اپنے حق میں کرنا تھا۔ میں نے کسی چیتے کی مانند جست بھر کر اندھیرے سے باہر آنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ماجد کی لجاجت بھری آواز نے میرے ارادے کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ جنید خان سے مخاطب تھا۔

”سر...... آپ سے ایک درخواست ہے!“

جنید خان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”ہاں بولو......“

”سر شوٹنگ کے شوق میں مجھے یہاں آدھی رات ہوگئی ہے۔“ ماجد نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ”آپ تو جا ہی رہے ہیں اگر مجھے یونیورسٹی روڈ تک چھوڑ دیں گے تو بڑی نوازش ہوگی۔ وہاں سے مجھے آسانی سے گاڑی مل جائے گی۔“

ماجد کی استدعا میں اتنی عاجزی تھی کہ جنید خان نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد سرسری لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے آجاؤ۔“

جنید خان جب تک گھوم کر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتا' گیٹ پر موجود نئے ملازم نے اس کی رخصتی کے لیے گیٹ کھول دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی کا انجن بیدار ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی حرکت میں آتی۔ میں تیر کے مانند اندھیرے سے نکلا اور پورچ کی جانب دوڑ لگادی۔

ماجد نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ابھی دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ یقیناً اسے میرا ہی انتظار تھا' پھر اس کی مجھ پر نظر پڑ گئی لیکن اس سے پہلے کہ میں چند قدم کا فاصلہ طے کرکے جنید خان کی گاڑی تک پہنچتا' میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور منہ کے بل کارپورچ کے پختہ فرش پر گرا۔

اگلے ہی لمحے میرے بائیں بازو میں جہنم سا دہک اٹھا۔ قبل اس کے کہ میں اٹھ کھڑا ہوتا۔

جنید خان کی گاڑی گیٹ کی جانب بڑھ چکی تھی......!

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

سانپ

محترم مدیر نئے افق
السلام علیکم!
یہ ایک بالکل سچا واقعی ہے۔ انسان اپنی خواہشات کا کتنا اندھا غلام ہوتا ہے اور لالچ اور ہوس کی برچھی انسان کے دل میں اتر کر رشتوں کے تقدس کو کس طرح پامال کرتی ہے۔ امید ہے یہ کہانی قارئین کے مزاج پر پورا اترے گی۔

راوی: نذیر الحق
تحریر: انجم فاروق ساحلی
لاہور

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں قصور ڈسٹرکٹ جیل میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں جیل میں ایک بزرگ کا بڑا چرچا تھا۔ بس کوئی بھلا سا نام تھا۔ سالوں کی گرد نے شاید ان کا نام میرے ذہن میں دھندلا دیا ہے۔

چلیے نام میں کیا رکھا ہے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ان بزرگ کا نام محمد رفیق تھا۔ مگر لوگ انہیں بابا جی کے نام سے پکارتے تھے۔ بابا جی کے بارے میں کئی قصے کہانیاں مشہور تھیں۔ جیل کی دنیا میں۔ جی ہاں جیل کی دنیا الگ ہی ہوتی ہے جس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جسے آپ عام معاشرے میں دیکھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں۔ کسی کہانی کا مشہور ہو جانا آسان بھی ہے اور مشکل بھی آسان یوں کہ قیدیوں میں کوئی بات تیزی سے پھیل جاتی ہے مگر اسے دوام صرف اس صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ جب اس میں کوئی حقیقت ہو ورنہ چوبیس گھنٹے میں بے وقعت اور فرضی کہانیاں دم توڑ جاتی ہیں۔

بابا جی اللہ والے تھے اور پکے نمازی تھے۔ اکثر روزے سے بھی رہتے تھے۔ رات اکثر عبادت کے دوران روتے ہوئے بھی دیکھا گیا تھا۔ وہ جو بھی دعا کرتے تھے وہ مقبول ہو جاتی تھی اور یہ کہانی زبان زدخاص وعام تھی۔ بابا جی کی آنکھوں میں بے چینی اور اداسی کی کیفیت میں دیکھ چکا تھا۔ وہ اچانک کھو سے جاتے تھے۔ جیسے ماضی کی کسی پگڈنڈی پر دور جا نکلے ہوں۔ میں نے دو تین مرتبہ بابا جی کو چائے پر بلایا انہیں کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے ٹالتے ہی رہے اور اپنی اداسی، کرب اور رات کو بہائے جانے والے آنسوؤں کا پس منظر نہ سنایا۔ میں ان کی حالت کے پیش نظر تجسس سا رہتا تھا۔ پھر محکمہ بھی ایسا ہی تھا ہم پولیس والے ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

اس روز عیدالاضحیٰ تھی۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی اجازت سے قیدیوں کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا۔ عید کی نماز جیل کے اندر ادا کی گئی۔ قربانی ہوئی اور قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ چنانچہ ظہر کی نماز سے قبل سب کو کھانا فراہم کر دیا گیا۔ نماز کے بعد میں اپنے دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔ جیل کے کچھ ملازم عید مبارک کہنے کے لیے آئے۔ تھوڑی دیر بعد بابا جی بھی آ گئے۔ وہ میرے کمرے میں بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر اضطراب اور رنج کی ملی جلی کیفیت تھی۔

جیل کے ملازم جلد ہی واپس چلے گئے اب کمرے میں بابا جی اور میں اکیلے تھے۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور بابا جی سے ان کی ذات کے بارے میں سوال کر دیا۔ بابا جی نے میری طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں کرب جھانک رہا تھا۔

''بابا جی میں آپ کی اداسی اور غم کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے نرم اور خلیق لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔ ''دل کی بات کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ آپ کی بات میرے سینے میں کسی قیمتی راز کی مانند محفوظ رہے گی۔'' میں نے بابا جی کو لب کشائی پر آمادہ کرنے کے لیے رازداری کی یقین دہانی کروادی۔

''میں، میں بہت بڑا گناہ گار ہوں۔ اپنے خالق کا مجرم، میں نے اس کی تخلیق کو تباہ کرنے کا جرم کیا ہے۔ ڈپٹی صاحب۔'' بابا جی نے کہا۔ ''نہ جانے روزِ محشر میرا کیا حشر ہوگا؟'' بابا جی کی آواز میں غم کا بوجھل پن اور نمایاں ہو گیا۔

''اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرنے والا اور غفور الرحیم ہے بابا جی۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے توبہ استغفار جاری رکھنا چاہیے، وہ توبہ قبول کرتا ہے وہ کریم ہے۔''

''ہاں اس کی رحمت ہی تو اب واحد سہارا ہے۔'' بابا جی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ میرے عمل تو اس قابل ہیں کہ مجھے جہنم رسید کر دیا جائے۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''کیا آپ مجھے نہیں بتائیں گے کہ آپ پر کیا گزری۔'' میں نے اپنا سوال نئے انداز سے دہرایا۔ ''آپ کے ساتھ کیا ہوا کیا گزری، کیا آپ سے کوئی زیادتی سرزد ہوگئی۔ آپ جیل میں کیسے آئے جسے دنیا میں جہنم کی مثل سمجھا جاتا ہے۔''

''یہ ایک طویل کہانی ہے ڈپٹی صاحب!'' بابا جی

نے سوگوار لہجے میں کہا۔ "آپ سن کر کیا کریں گے؟ مجھ سے کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ زیادتی کا مجرم تو میں خود ہوں۔ میں اپنی اس زیادتی کی سزا اس دنیا میں بھگت رہا ہوں۔ خلش کا خنجر میری روح کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہتا ہے۔ آخرت میں کیا ہوگا اس سے ڈرتا ہوں۔" بابا جی نے ایک انداز میں کہا۔ جس سے آمادگی ظاہر ہوتی تھی۔

"کچھ تو مجھے بتایئے۔" میں نے اپنائیت سے کہا۔ "میں آپ کے بچوں کی طرح ہوں۔ اگر آپ کا کوئی بیٹا ہوتا اور آپ سے آپ کی اداسی کا سبب پوچھتا تو آپ اسے بھی انکار کردیتے؟" میں نے بابا جی پر نفسیاتی داؤ آزمایا۔

بابا جی خاموش رہے وہ کسی سوچ میں گم تھے۔ میں سمجھ گیا کہ میری بات کا نفسیاتی اثر ہو رہا ہے۔ کوئی چار پانچ منٹ بعد انہوں نے سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ "تو تم پوچھے بنا نہیں رہو گے۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک طویل سانس لی۔ انہوں نے اپنا راز مجھ پر عیاں کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

مجھے ان کے چہرے پر ایک طرح کے عزم کی جھلک دکھائی دی۔ پھر انہوں نے سامنے کمرے کی دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تو سنو میں آج تمہیں اپنی کہانی سنا دیتا ہوں۔ میں شام کی نماز کے بعد آؤں گا۔"

اور بابا کی کہانی اب انہیں کی زبانی سنیے۔

یہ آج سے تیں پینتیس برس پہلے کا ذکر ہے میں چونیاں کے ایک قریبی گاؤں میں اپنی بیوہ ماں کے پاس رہتا تھا۔ میرا باپ بچپن میں فوت ہو گیا تھا اور میری ماں نے خدا اس کے گناہ معاف کرے اپنی چند بیگھے زمین پر خود محنت و مشقت کر کے مجھے پالا تھا۔

چونکہ میرے باپ کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بابو بنوں اس لیے میری ماں نے اپنے شوہر کی خواہش کا پاس کرتے ہوئے مجھے میٹرک تک تعلیم دلوائی۔ میری ماں کا ایک دور کا رشتہ دار انگریز کی پولیس میں ملازم رہ چکا تھا۔ میری ماں نے اس سے رابطہ قائم کیا اور مجھے نوکری دلوانے کی استدعا کی۔ ان دنوں دیہات میں نوکری کا مطلب پولیس یا فوج کی ملازمت ہوتا تھا۔ چنانچہ میرا یہ ننھیالی عزیز مجھے اپنے ساتھ لاہور لے آیا اور پولیس میں بھرتی کروادیا۔

میں نے ماڈل ٹاؤن کے قریب ایک کچی بستی میں واجبی سا مکان کرائے پر لے لیا اور ملازمت شروع کردی۔ میں چونکہ میٹرک پاس تھا۔ اس لیے مجھے ایس پی لاہور کے دفتر میں کلرک لگا دیا گیا اور کچھ دن بعد ہی میں "اعمالنامہ کلرک" بنا دیا گیا۔ میری تحویل میں پورے ضلع کے تھانیداروں کے اعمالنامے تھے۔ اعمالنامہ سروس بک کو کہتے ہیں۔

میں روزانہ ماڈل ٹاؤن بس سروس سے شہر جاتا اور کچہری کے قریب اتر کر دفتر چلا جاتا۔ میں گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گاؤں میں بزرگوں اور خواتین کی عزت اور احترام میری فطرت ثانیہ بن چکا تھا میں بس میں بیٹھا ہوتا اور کوئی بزرگ یا خاتون آجاتی تو میں جھٹ سے اپنی نشست اس کے لیے خالی کردیتا اگر کسی خاتون کے لیے جگہ خالی کرتا تو اس جگہ سے کافی ہٹ کر کھڑا ہوتا۔ مبادا خاتون کے دل میں کوئی وسوسہ میری طرف سے پیدا نہ ہو اور شاید میری یہی عادت تھی جو میری بدقسمتی کا سبب بنی۔

بابا جی نے افسردگی سے کہا اور پھر گہری سانس لینے کے بعد دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔

ایک روز میں بس میں بیٹھا تو بس تقریباً بھری ہوئی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ

بس میں سوار ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان سے کہا کہ ہمیں ان دونوں خواتین کے لیے نشستیں خالی کردینی چاہییں۔ بس میں خواتین کے لیے مخصوص اگلے حصے کی تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں۔ وہ نوجوان بھی کوئی بھلا آدمی تھا فوراً تیار ہو گیا۔ ہم اٹھ گئے اور ادھیڑ عمر خاتون سے کہا۔ "اماں جی آپ لوگ یہاں بیٹھ جائیں۔" اماں جی نے مجھے اور میرے ساتھی کو ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ اور پھر وہ دونوں سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ نوجوان لڑکی نے میری طرف مروت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ نہایت خوب صورت تھی اور اس کی آنکھیں تو ایسی پرکشش تھیں کہ ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ بے اختیار نظر اٹھ جاتی تھی۔

میں نے دل پر بڑا جبر کیا مگر...... مگر نہ جانے کیوں کوئی نصف گھنٹے کے سفر کے دوران میں نے دو تین بار اس لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی ہر دفعہ اسے اپنی جانب نگراں پایا۔ اس کی آنکھیں مجھے کچھ کہتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

اور پھر اکثر بس میں اس لڑکی سے ملاقات ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو وہ اپنی ماں کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ ہاں وہ ادھیڑ عمر کی عورت اس کی ماں ہی تھی جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا مگر پھر اس نے اکیلے آنا جانا شروع کردیا۔

نظروں کے ملاپ نے رنگ دکھایا اور نوبت بات چیت تک پہنچ گئی۔ پھر ہم باقاعدہ ملنے لگے۔ وہ ادویات بنانے والی چھوٹی سی فیکٹری میں ملازم تھی۔ اس کا نام ثمینہ تھا اور وہ میٹرک پاس تھی۔ مگر باپ سر پر نہ تھا۔ بیوہ ماں نے اسے بڑی محنت سے پالا تھا اور اب وہ بیوہ ماں کی خدمت کر رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی واحد اولاد تھی اور واحد سہارا بھی۔ وہ میرے بہت قریب آگئی پھر ایک دن اس نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں اس کے گھر گیا اس کی ماں نے بڑی عزت کی۔ چاہت سے بٹھایا اور اس طرح پیش آئی جیسے میں بھی اس کی اولاد ہوں۔ میں کچھ دیر بیٹھا ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر میں نے شربت کا گلاس پیا اور چلا آیا۔ چلتے وقت ثمینہ کی ماں نے ملتے رہنے کو کہا۔ میں نے بھی پھر آنے کا وعدہ کرلیا۔

پھر ایک روز ثمینہ کی ماں نے مجھ سے کہا۔ "بیٹا تم اپنی ماں کو لے کر آنا۔" اس کا انداز ایسا تھا گویا وہ میرے خاندان سے قریبی تعلقات قائم کرنے کی خواہش مند ہو۔ میں نے دفتر سے دو دن کی رخصت لی اور گاؤں چلا گیا۔ میں نے اپنی ماں کو سب کچھ بتا دیا اور اس سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ثمینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ماں میری خوشی اور جذبات کو دیکھتے ہوئے رضا مند ہو گئی اور دوسرے دن ہی میرے ساتھ چلی آئی۔ میں اسے ثمینہ کے گھر لے گیا۔ ثمینہ کی ماں میری ماں سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ باتیں شروع ہوگئیں اور باتوں کے دوران ہی میری ماں نے ثمینہ کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کردیا۔ ثمینہ کی ماں بھی یہی چاہتی تھی چنانچہ اس نے فوراً یہ رشتہ قبول کرلیا۔

میری ماں میری شادی دھوم دھام سے کرنے کی خواہش مند تھی مگر دھوم دھڑ کے کے لیے تو روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے ملازم ہوئے صرف ایک سال گزرا تھا۔ جمع پونجی اتنی نہ تھی کہ ہم اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنا سکتے۔ ادھر ثمینہ کے گھر کی حالت بھی ہم سے بہتر نہ تھی۔ میں نے اپنی ماں سے بات کی۔ اسے سمجھایا بالآخر اسے میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مگر اس کے دل میں یہ تمنا ضرور موجود تھی کہ کسی طرح ثمینہ کو ڈھیر سارا جہیز ملے۔ میں نے اپنی ماں کی اس خواہش سے اتفاق نہ کیا تو وہ مجھ سے

کھنچی کھنچی رہنے لگی۔

آخر میں نے ماں سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں ثمینہ کی ماں سے جہیز وغیرہ کی بات نہ تو خود کروں گا اور نہ اسے ایسا کرنے کی اجازت دوں گا۔ میں نے دھمکی دی کہ اگر ماں نے اپنی خواہش پر اصرار کیا تو میں ثمینہ سے شادی کر کے لاہور میں بس جاؤں گا اور باقی عمر اپنی ماں کو شکل تک نہ دکھاؤں گا۔ میری یہ دھمکی کام کر گئی اور ماں نے بادل نخواستہ مجھے شادی کی اجازت دے دی۔

پھر میں نے ثمینہ سے شادی کر لی بارات میں میرے چند دوست اور والدہ شریک ہوئیں۔ نہ جہیز نہ بری نہ شان و شوکت کا مظاہرہ نہ دھوم دھڑ کا مگر میں اور ثمینہ خوش تھے ہمیں ہماری دنیا مل گئی تھی۔ ہم دونوں ملازمت کرتے ثمینہ کی والدہ ہمارے ساتھ رہتی تھیں۔ ثمینہ نے کئی بار مجھ سے کہا کہ میں اپنی والدہ کو بھی لاہور لے آؤں مگر میری ماں اس پر تیار نہ تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس دوران ہمارے گھر کی حالت کافی سنبھل گئی اور گاؤں والوں میں میرے کماؤ ہونے کا چرچا ہو گیا۔

تین سال بعد ہمارے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ بچی کی ولادت کے بعد ثمینہ نے ملازمت ترک کر دی۔ اس نے گاؤں جا کر رہنے اور ساس کی خدمت کرنے کا عزم کر لیا۔ میں نے ثمینہ کی ماں سے بات کی تو اس نے کہا کہ ثمینہ کو اپنی ساس کی خدمت ضرور کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں ثمینہ کو گاؤں چھوڑ آیا۔ اس پر میری ماں نے پسندیدگی کا اظہار تو کیا مگر وہ زیادہ خوش نہ تھی۔ نہ جانے کیوں؟ شاید تقدیر کا چکر شروع ہو چکا تھا۔

ثمینہ کے گاؤں جانے کے بعد مجھے دفتر کے قریب رہائش مل گئی میں وہاں منتقل ہو گیا۔ ثمینہ کی والدہ نے اپنے مکان کا بڑا حصہ کرائے پر اٹھا دیا اور خود ایک کمرے میں منتقل ہو گئی۔ ثمینہ کے سسرال جانے اور میرے چلے آنے کے بعد اب اسے اتنے بڑے گھر کی ضرورت نہیں تھی کرایہ اتنا تھا کہ ثمینہ کی ماں کی گزر بسر آسانی سے ہو جاتی تھی۔

انہی دنوں میرے ایک ساتھی کانسٹیبل کی شادی ہوئی۔ وہ ٹریفک پولیس میں متعین تھا اور اکثر اپنی آمدنی کا ذکر کیا کرتا تھا۔ بالائی آمدنی سے اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں۔ میں اس کی شادی میں شریک ہوا اور اس کے جہیز کا سامان دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اسے فراہم نہ کی گئی تھی۔ ریڈیو، ریڈیو گرامو فون، درجنوں ریکارڈ، سوفہ سیٹ، قیمتی برتن، کرسیاں، میزیں، کھانے کی میز، شاندار پلنگ، کراکری، بہترین کپڑوں کے جوڑے، گھڑی غرض کیا کیا بتاؤں اسے دیکھ کر میرے دل کے کسی کونے میں حیرت بھری آواز ابھری۔ ”کاش ثمینہ کی والدہ نے بھی ایسا ہی کیا ہوتا۔“ میں نے اپنے دل کی آواز کو تو دبا دیا لیکن نہ جانے کیوں سارا دن میں افسردہ رہا۔ خواہشات کے جسم سے لالچ کا لہو رستا ہوا دل کو بے چین کرتا رہا۔ رات خواب میں بھی مجھے ساتھی کانسٹیبل کی بیوی کو ملنے والا جہیز نظر آتا رہا۔ صبح اٹھا تو بھی افسردگی طاری تھی اور اب اس میں افسوس کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا شاید میں نے ثمینہ سے شادی کر کے جلدی کی ہے۔ دفتر گیا تو اماں کا خط ملا۔ یہ خط ثمینہ کا لکھا ہوا تھا۔ اماں نے مجھے گاؤں بلایا تھا۔ اس روز ہفتہ تھا میں نے نصف دن کی چھٹی لے لی۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ میں نے اپنے انچارج کو بتا دیا کہ میں پیر کو دفتر لیٹ آؤں گا اس نے اجازت دے دی اور میں گاؤں چلا گیا۔ میں شام سے ذرا قبل ہی گاؤں پہنچا گرمیوں کے دن تھے۔ شام کے کھانے کے بعد میری ماں نے مجھ سے کہا کہ میں اس کی چارپائی مکان کی چھت پر چڑھا دوں۔ کھانا کھانے کے بعد اماں چھت پر چلی گئی۔ ثمینہ نے میری اور اپنی چارپائیاں بچھائیں ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ماں نے مجھے آواز دی میں ثمینہ سے ابھی آیا کہہ کر اوپر چلا گیا۔

”جانتے ہو رفیق میں نے تمہیں کتنی مصیبتوں سے پالا ہے۔“ ماں نے میرے سلام کے جواب میں بغیر کسی تمہید کے کہا۔

”مگر تم نے میری کوئی خوشی پوری نہیں کی اور صورت حال یہ ہے کہ میں شریکوں کے طعنے سن سن کر تنگ آ گئی ہوں۔ اس زندگی سے تو موت ہی اچھی ہے۔ خدا کرے کہ میں مر ہی جاؤں۔“ ساتھ ہی ماں نے رونا دھونا بھی شروع کر دیا۔ میں سخت پریشان تھا۔ میں نے کبھی ماں کی حکم عدولی نہیں کی تھی۔ ثمینہ بھی میری ماں کی تابعدار تھی۔ گزشتہ اتوار کو ہی میں گھر آیا تھا تو ماں نے ثمینہ کی بڑی تعریف کی تھی۔ میں ہر پندرہ روز بعد گھر آتا تھا اور دو راتیں قیام کر کے واپس لاہور چلا جاتا تھا۔

اس ہفتے میرا آنے کا پروگرام نہیں تھا۔ مگر ماں کا خط ملتے ہی میں آ گیا تھا۔ ان سات دنوں میں کیا ہو گیا تھا؟ کون سا انقلاب آ گیا کہ ماں کو میری فرمانبرداری نے بھی دکھ میں مبتلا کر دیا۔

”اماں ہوا کیا ہے؟ کچھ میں بھی سنوں۔“ میں نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب شریکوں نے کیا طعنے دیے ہیں۔ اگر کسی نے کوئی نازیبا یا نارو ا بات کی ہے تو میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔ ہم نے تو کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور اب تو ہم پر اللہ کا بڑا فضل ہے پھر کوئی کیوں طعنے دینے لگا۔“

مگر ماں کی تو ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ میرے بار بار پوچھنے پر ماں نے بتایا کہ میں نے ثمینہ سے شادی کر کے بڑی غلطی کی ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی بھلا اب ماں کو کیا سوجھی۔

”اماں جو ہونا تھا ہو گیا ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ثمینہ تیری فرمانبردار ہے خدمت کرتی ہے تم نے خود مجھے بتایا ہے کوئی اور آ جاتی تو لڑائی جھگڑا کرتی اور ہمارے گھر کو جہنم کا نمونہ بنا دیتی۔“ میں نے ثمینہ کی وکالت کی۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”ثمینہ ایک پیسے کا جہیز نہیں لائی۔ یہاں گاؤں میں لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور مجھ سے لوگوں کی باتیں نہیں سنی جاتیں تمہیں کچھ کرنا چاہیے میرے لیے۔ جس نے تجھے ماں اور باپ دونوں بن کے پالا ہے اور اپنی پوری عمر تیری خاطر بیوگی میں گزار دی ہے۔“

”آخر میں کیا کر سکتا ہوں۔ ماں ثمینہ سے میری شادی تمہاری مرضی اور رضا سے ہوئی ہے۔ ثمینہ کو میں بے حد چاہتا ہوں اور اب اس سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

”کر کیوں نہیں سکتے بیٹا تم مرد ہو جو چاہو کر سکتے ہو۔“ ماں نے کہا اب اس کے لبوں پر مسکراہٹ بھی

تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا
مرجائیں گے اگر اب یاد آیا
حال دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا
بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصر
ہم بہت روئے جب وہ یاد آیا
زرینہ ثقلین......خانیوال

آ گئی تھی۔ جس پر میں نے خود کو ذرا ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

”بیٹا! تم ہاں کر دو تو فضلاں اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کو تیار ہے۔ اس کی بیٹی جمیلہ کو تو تم جانتے ہی ہو وہ تمہارے ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی ہے اور تمہارے ساتھ اسکول بھی جاتی رہی ہے۔ تم جب پانچویں کلاس میں تھے تو وہ تیسری جماعت میں تھی اب تو بڑی ہو گئی ہے۔ گھر کا کام کاج کرتی ہے۔“ ماں نظر جھکائے جمیلہ کی تعریفیں اور اس کے والدین کی دولت مندی کے تذکرے کرتی رہی مگر میرا ذہن تو اب ثمینہ کی طرف ہی پختہ ہو چکا تھا۔ میں ماں کی طرف دیکھ کر کھو سا گیا ماں کیسی باتیں کر رہی تھی۔ جس بیٹے کو اس نے ماں اور باپ بن کے پالا تھا یہ اس کی خوشیوں کا سوال تھا لیکن ماں صرف دکھاوے اور دنیاوی مال و دولت کے لالچ میں مجھے تختہ مشق بنانا چاہتی تھی۔ ماں کی آواز میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترنے لگی۔

”وہ جہیز بھی بڑا دیں گے ضرورت کی ہر شے فضلاں نے بنا رکھی ہے۔ پیتل کے برتن، شیشے کے برتن، چینی کی پلیٹیں اور نہ جانے کیا کچھ بنا رکھا ہے اور فضلاں نے اپنی بیٹی کو چار بھینسیں اور ایک گائے بھی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ کیا بھینسیں ہیں رفیق دیکھ کر بھوک اترتی ہے۔ بس تم ہاں کہہ دو پھر گھر بھر جائے گا۔ تمہارا جہیز رکھنے کو جگہ بھی کم معلوم ہو گی۔ کھرلیاں پھر سے آباد ہو جائیں گی۔“ ماں خالص دیہاتی لہجے میں کہتی رہی۔

جہیز کی بات ہوئی تو میرے ذہن میں میرے ساتھی کانسٹیبل کی شادی گھوم گئی جو ٹریفک پولیس میں تھا کتنا جہیز دیا تھا اس کے سسرال والوں نے لوگوں کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور پھر میرے سادہ دل میں بھی دولت کی چمک ابھر آئی۔

”مگر ماں اب میں کیسے شادی کر سکتا ہوں۔ ثمینہ کیا کہے گی اس کی ماں کیا سوچے گی۔“ میں نے عجیب سی آواز میں کہا۔ نہ جانے میرے گلے میں کیا پھنس گیا تھا۔ اس وقت تو مجھے احساس نہیں ہوا مگر اب محسوس کرتا ہوں کہ میرے گلے میں پھندا لگ گیا تھا۔ یہ فطرت کی طرف سے وارننگ تھی۔ لیکن اس وقت ہوس کی جیت ہو گئی تھی۔ میرے تصور کے پردے پر خوش نما پنکھے، سوفا سیٹ، فریج اور خوش نما بھینسیں گھومنے پھرنے لگی تھیں۔ جن کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں سریلے سروں میں بج رہی تھیں۔

”بیٹا تم مرد ہو، ثمینہ سے کہہ دو تمہیں دوسری شادی کی اجازت دے دے۔ پھر میں تمہاری جمیلہ سے شادی کر دوں گی۔“ ماں نے اس طرح کہا گویا یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ ثمینہ کبھی اس کی اجازت نہیں دے گی اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ رات کو جب میں نے ثمینہ سے بات کی تو اس نے بچی اٹھا کر میرے ساتھ لٹا دی اور بولی۔

”اگر تمہیں اس کے ساتھ ذرا بھی محبت ہے تو دوسری شادی مت کرنا یا میرا اور اس بچی کا قصور بتا دو۔ جن کے سروں پر تم سوتن اور سوتیلی ماں کی تلوار لٹکانا چاہتے ہو۔“ ثمینہ نے یہ باتیں اس درد بھرے انداز میں کہیں کہ میں اندر سے دہل کر رہ گیا۔ میرے ذہن و قلب پر چھا جانے والی ہوس کی دھند اور گہری ہو چکی تھی۔ میں ماں کے ہاتھوں کھلونا بن گیا تھا۔

”تمہیں اس دیہاتی لڑکی سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں اسے شادی کے بعد گاؤں میں اور تمہیں لاہور میں اپنے پاس رکھوں گا۔ ننھی تمہارے پاس رہے گی اسے سوتیلی ماں سے کیا واسطہ۔“

”نہیں رفیق میں تمہاری محبت میں کسی کو شریک

نہیں کر سکتی۔ یہ میری محبت کی توہین ہے۔ محبت کی موت ہے اور محبت کی موت کے بعد میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“ ثمینہ نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم اور جو دل چاہے کرو لیکن میں اپنے جیتے جی تمہیں دوسری شادی کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اگر تم نے دوسری شادی کی تو ایک طرف ڈولی اٹھے گی اور دوسری طرف جنازہ بھی اٹھ جائے گا۔“ ثمینہ کا لہجہ ٹھوس تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خودکشی کا فیصلہ کر چکی ہے اگر میں نے......!؟

میں دہل گیا ثمینہ کی خودکشی کئی مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ میں پولیس کانسٹیبل تھا اور ایک چھوٹا سا امتحان پاس کر چکا تھا۔ جس کے بعد بطور ہیڈ کانسٹیبل میری ترقی ہونا تھی۔ ثمینہ کے ایسے اقدام سے میری ترقی اور مستقبل کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ ان دنوں نئے قوانین نافذ ہوئے تھے اور ثمینہ کی تحریری اجازت کے بغیر دوسری شادی کرنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ ایسا کوئی اقدام میرے خلاف قانون کو حرکت میں لانے کا سبب بن سکتا تھا۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ ثمینہ بھی روتی رہی۔ میں سخت پریشان تھا۔ جب میں اٹھا تو شب بیداری کی وجہ سے میرے سر میں شدید درد تھا اور صبح بخار کی سی کیفیت تھی۔ میں ٹھنڈے پانی سے خوب نہایا لیکن میری طبیعت نہ سنبھل سکی اور میں کمرے میں لیٹ گیا۔ ماں نے جب مجھے یوں دیکھا تو میرے پاس آئی۔ اس کے استفسار پر میں نے اسے بتایا کہ ثمینہ مجھے دوسری شادی کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں اور اس کی تحریری اجازت کے بغیر میں دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ثمینہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے اگر اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

”تم کیسے مرد ہو۔“ ماں نے غصے سے کہا۔ تمہاری بیوی تمہارے قابو میں نہیں، تم اس سے اپنی ایک معمولی سی بات بھی نہیں منوا سکتے۔“ ماں نے مجھے تاؤ دلانے کی کوشش کی۔ اسی وقت ثمینہ اندر آ گئی۔ اس نے ماں کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ باہر گئی اور بچی کو اٹھا لائی۔ اسے علم تھا کہ شادی کے تین سال بعد پیدا ہونے والی بچی مجھے بے حد عزیز ہے اس نے بچی میری گود میں ڈال دی۔

”رفیق اس ننھی سی جان کا صدقہ جسے ابھی میری ضرورت ہے اپنے ارادے سے باز آ جاؤ۔“ ثمینہ نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”ورنہ ورنہ یہ بچی میرے سائے سے محروم ہو جائے گی۔ میرے نانا نے بھی دو شادیاں کی تھیں اور ہماری نانی کو اس کا خمیازہ تمام عمر

محبت ہم سفر میری

کٹھن ہے زندگی
سفر دشوار ہے کتنا
کبھی پاؤں نہیں ملتے
کبھی رستا نہیں ملتا
ہمارا ساتھ دے پائے
کوئی ایسا نہیں ملتا
فقط ایسے گزاروں تو
یہ شب و روز نہیں کٹتے
یہ کٹتے تھے، کبھی پہلے
مگر ہاں اب نہیں کٹتے
مجھے پھر بھی میرے مالک
کوئی شکوہ نہیں تجھ سے
میں جاں پر کھیل سکتا ہوں
میرا ہر دکھ جھیل سکتا ہوں
اگر تو آج ہی کر دے
محبت ہم سفر میری

صابرہ کلثوم ...... خانیوال

بھگتنا پڑا تھا۔ ایک بچی کو اس کی ماں ہی پال سکتی ہے۔ ورنہ بچے کا ستیاناس ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوگا۔" ماں نے تیزی سے کہا۔ وہ غالباً ثمینہ کی بات سمجھ نہ سکی تھی۔ "تم نہ سہی اور سہی تم جہاں جانا چاہتی ہو چلی جاؤ۔ ہمیں تمہاری کوئی پروا نہیں ہم بچی کو بھی پال لیں گے۔" ماں نے کہا اور بچی کو میری گود سے اٹھا لیا۔ ماں کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ ثمینہ کو بھی غصہ آ گیا آخر وہ میری ماں کی خدمت کرتی رہتی تھی اور اس کے خلوص اور خدمت کا صلہ اسے یہ دیا جا رہا تھا کہ اس سے دوسری شادی کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔

"اگر تم لوگوں نے مجھے مجبور کیا تو میں مٹی کا تیل ڈال کر بچی سمیت جل مروں گی۔" اس نے بچی کو میری ماں کی گود سے چھین لیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں سخت مشکل میں تھا۔ ماں کی بات ٹال نہ سکتا تھا۔ نہ ہی ثمینہ کو نظرانداز کر سکتا تھا۔ میں نے دونوں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر ماں نے کوئی بات سننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ وہ سخت غصے میں آ گئی اور ثمینہ کے ساتھ مجھے بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

گھر میں شور اٹھا تو آس پاس کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ میری ماں نے جو منہ میں آیا کہا۔ میں نے خود اپنی ماں کو اس طرح غصے میں آتے اور اول فول بکتے نہیں سنا تھا۔ مگر آج تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ پھر میری ماں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہنا شروع کر دیا۔ "میرے تو نصیب ہی جل گئے۔ قسمت خراب ہو گئی۔ میں نے اسے باپ بن کر پالا مگر یہ بیوی کا غلام بنتا جا رہا ہے۔ یہ صلہ میری خدمت کا دے رہا ہے میری تو اس گھر میں کوئی سنتا ہی نہیں اور یہ رانی......!" ماں نے بہو کی طرف اشارہ کیا۔ "اب خودکشی کی دھمکیاں دے رہی ہے۔"

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ "ماں کیا کہہ رہی ہو۔" میں نے ماں کے قریب جا کر کہا۔ "تم شور مچا کر لوگوں کو تو نہ سناؤ۔ یہ لوگ کیا کہیں گے ہمارے بارے میں، میں تو تمہارا ہر حکم مانتا ہوں کبھی اف نہیں کی پھر بھی تم لوگوں کے سامنے کوس رہی ہو۔"

"ہاں میں تجھے کوس رہی ہوں تو اب نافرمان ہو چکا ہے۔ تجھے میری کوئی پروا نہیں۔ میری عزت بے عزتی سے تجھے کوئی واسطہ نہیں۔ میری خوشی سے تجھے کوئی غرض نہیں۔" اس کے بعد ماں نے رونا شروع کر دیا۔ آس پاس کی جو عورتیں تھیں انہوں نے ماں کو سمجھایا کہ تمہارا بیٹا اور بہو تمہارے خدمت گزار ہیں اور تم خود بہو کی تعریفیں کرتی رہتی تھیں پر اب کیا ہوا۔ مگر ماں پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ سونے و چاندی کی بنی برچھی اس کے دل میں اتر چکی تھی۔ جو بھی کئی خون اور بہانے کے درپے تھی۔

میرے اور ہمسایہ خواتین کے کہنے سننے پر ماں خاموش ہو گئی مگر وہ سارا دن بات بے بات آنسو بہاتی رہی۔ میں ماں کے رویے سے بیزار ہو گیا۔ ثمینہ نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے کام کا بہانہ کر دیا۔ دن ڈھلے میں گھر سے نکلا۔ چلتے وقت ماں نے پھر کہا۔ "تم جب آؤ گے تو بات پکی کی جائے گی مجھے تمہاری شادی فضلاں کی بیٹی سے کرنی ہے۔ میں اس گھر کو بھرا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں لاہور چلا آیا۔ آتے وقت میں نے گاؤں میں اپنے واحد دوست اسماعیل کو جو ہمارے ہمسائے کا بیٹا تھا کہہ آیا کہ وہ میرے گھر کے حالات کی خبر رکھے اور مجھے اطلاع دیتا رہے۔ اسماعیل نے میرے ساتھ آٹھویں تک جماعت تعلیم حاصل کی تھی اور اب

کاشتکاری کر رہا تھا۔ والد کی وفات کی وجہ سے وہ مزید نہیں پڑھ سکا تھا۔

میں پندرہ دن تک گھر نہیں گیا مگر اس دوران مجھے برابر اطلاع ملتی رہی کہ میرے گھر میں مسلسل جنگ جاری ہے۔ ماں ثمینہ کو دوسری شادی پر مجبور کرتی رہتی اور ثمینہ انکار کرتی رہتی تھی۔ اس میں تو تو میں میں بھی ہوئی اور ثمینہ کئی کئی روز کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہ کھاتی تھی۔ میں ایک ماہ بعد گھر گیا حالات دگرگوں تھے۔ میں نے ثمینہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بھڑک اٹھی اس میں اس کا بھی قصور نہ تھا۔

"آخر مجھ میں کیا برائی ہے کیا کمی ہے۔ جو تم دوسری شادی کرنا چاہتے ہو۔" ثمینہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "صرف یہ کہ میری ماں تمہاری ماں کی ہوس کے مطابق جہیز نہیں دے سکی اور اب تم جہیز اور چند مویشیوں کی خاطر میری زندگی اجیرن کرنے پر تلے ہوئے ہو۔"

ثمینہ کو اونچا بولتے سن کر ماں بھی کمرے میں آ گئی تھی۔ جب ثمینہ نے مجھے اور میری ماں کو ہوس پرستی اور لالچ کا طعنہ دیا تو ہم دونوں ہی بھڑک اٹھے۔ بات سچی تھی اور سچ کڑوا ہوتا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر ثمینہ کو دھکا دیا وہ چارپائی پر گر گئی۔ اس کی باتوں سے مجھے سخت غصہ آ گیا تھا۔ میں نے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ اس وقت بچی ثمینہ کی گود میں تھی وہ بھی چلانے لگی۔ میں نے بچی کو اس کی گود سے لینا چاہا تو ثمینہ نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور میری ماں کو برا بھلا کہنے لگی۔ اس نے جب ماں کو بار بار لالچی اور ہوس پرست ہونے کا طعنہ دیا تو ماں بھڑک اٹھی وہ تیزی سے کمرے سے نکلی میرا خیال تھا وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ مگر چند لمحوں بعد ہی ماں اچانک کمرے میں داخل ہوئی اس نے ثمینہ پر مٹی کے تیل کا بھرا ہوا ڈبا پھینک دیا۔ ابھی میں صورت حال کو سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ ماں نے ہاتھ میں موجود دیا سلائی جلا کر ثمینہ پر پھینک دی۔ چشم زدن میں ثمینہ کے ریشمی کپڑوں نے آگ پکڑی اور جسم سے چپک گئے۔

میں گھبرا گیا میں نے آگ بجھانے کی کوشش کی تو ماں نے مجھے دھکا دے کر پرے کر دیا۔ "جلنے دے اس کلموہی کو۔" ماں نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔ میں پھر ثمینہ کی طرف بڑھا مگر ماں پوری قوت سے مزاحمت کر رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر میں نے ماں کو ایک طرف گرایا اور خود ثمینہ کی آگ بجھانے کی کوشش کی مگر وقت گزر چکا تھا۔ ثمینہ بری طرح جھلس گئی اور بے ہوش تھی۔ جبکہ بچی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔

میں گھبرا گیا صورت حال نہایت نازک ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میری ماں نے بھی ننھی کو مردہ اور ثمینہ کو بے ہوش دیکھا تو کمرے سے نکل گئی اور صحن میں جا کر شور مچا دیا۔ "بچاؤ بچاؤ میری بہو نے خود کو آگ لگا لی۔" ماں کی آواز سن کر کچھ پڑوس کی عورتیں اور دوسرے لوگ بھی گھر کے

غزل

عشق کرے گا خود ہی روٹھ بھی جائے گا وہ شخص
آج ہنساتا ہے تمہیں کل کو رلائے گا وہی شخص
تمہاری ہر بات پر کرتا ہے جو اپنی گردن خم
کسی دن گردن تمہاری بھی کٹائے گا وہی شخص
یہ عشق کی عبادتیں، ریاضتیں بھول جاؤ گے تم بھی
جب کہیں یہ تنہا تمہیں چھوڑ کے جائے گا وہی شخص
اب دیتا ہے جو ساتھ دکھ درد میں تیرے اے منیر
مطلب نکل گیا تو تجھے بھی بھول جائے گا وہی شخص

منیر احمد ساغر...... میاں چنوں

اندر آ گئے۔ آگ بجھانے کی کوشش میں میرے کپڑوں پر بھی جلنے کے نشان پڑ گئے تھے۔ میرے ہاتھوں پر بھی آگ کا اثر ہوا تھا۔ یہ اس وقت تو ہمارے حق میں بہتر ہوا تھا لوگوں نے سمجھا ثمینہ نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ میں نے دو خواتین کی مدد سے ثمینہ کو چارپائی پر ڈالا۔ اتنے میں کچھ مرد بھی آ گئے اور میرا دوست اسماعیل بھی پہنچ گیا۔ ہم نے ثمینہ کی چارپائی اٹھائی اور سڑک پر لے آئے۔ خوش قسمتی سے ایک ٹرک مل گیا۔ ہم نے ثمینہ کو اس میں ڈالا اور لاہور لے آئے۔

میں ثمینہ کی روتی ہوئی ماں کو بھی اسپتال لے آیا۔ ڈاکٹروں نے طبی امداد اور یقین ظاہر کیا کہ ثمینہ کو بچا لیا جائے گا مگر وہ تو اب تک بے ہوش تھی۔ دوسرے دن میں چونیاں تھانے گیا۔ ایس ایچ او مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اسے تمام حالات بتائے اور ثمینہ کے خلاف خودکشی کا پرچہ درج کرا دیا اور بچی کی لاش دفن کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ بچی کا پوسٹ مارٹم پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ہم نے بچی کو دفن کر دیا۔

دو ہفتے گزر گئے میں لاہور میں ہی تھا۔ دفتر سے روزانہ میرا اسپتال جاتا اور پھر باقی وقت اسپتال میں ہی گزرتا۔ اس دوران ثمینہ کو ہوش نہیں آیا تھا اور ڈاکٹروں کی زبردست کوشش کے باوجود ثمینہ کی حالت بگڑتی گئی اور واقعہ کے سترہویں دن ثمینہ بھی بے ہوشی کی حالت میں دم توڑ گئی۔ میں نے ثمینہ کی لاش حاصل کی اور اس کی ماں کی خواہش کے مطابق اس کے گھر پہنچا دی اور پھر وہیں کفن دفن کیا۔ اس رات کو میں واپس چونیاں چلا گیا۔

دو تین دن گزر گئے گرمی کافی بڑھ گئی تھی۔ میں رات کو ماں کے پاس ہی چھت پر سو جاتا تھا۔ ماں اب بھی دبی دبی زبان سے فضلاں کی بیٹی سے شادی کا تذکرہ کرتی۔ مگر مجھے ثمینہ کے اس طرح مرنے کا اس قدر رنج تھا کہ میں نے ماں کی بات کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کر لیا اور بدستور خاموشی اختیار کیے رکھی اس رات حبس کچھ زیادہ ہی تھا۔

میں سرِ شام کھانا کھانے کے بعد چھت پر جا کر لیٹ گیا۔ نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

یہ کوئی نصف شب کا وقت تھا۔ جب قدموں کی بھاری چاپ کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں چارپائی سے اٹھا اور صحن میں جھانکا۔ وہاں چند سائے نظر آئے۔ دوسرے ہی لمحے کسی نے پکارا۔ ”رفیق نیچے آ جاؤ فرار کی کوشش بے سود ہو گی۔ تمہارا مکان پولیس کے گھیرے میں ہے۔“ میں حیران پریشان نیچے اتر آیا۔ یہ کرائمز برانچ کی ایک ٹیم تھی۔ جس نے میری اور میری ماں کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مارا تھا۔ میری ماں میرے بلانے پر نیچے آ گئی۔ پولیس والوں کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ کرائمز برانچ کا جہاندیدہ انسپکٹر بھانپ گیا اس نے مجھے صحن کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔ دو سپاہیوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر کچھ دور لے جا کر کھڑا کر دیا اور انسپکٹر نے میری ماں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

”تم حراست میں ہو اماں تم نے اپنی بہو کو زندہ جلا کر بچی سمیت ہلاک کیا ہے۔“ پولیس انسپکٹر نے میری ماں پر براہِ راست وار کیا۔ پھر اس کے لالچی ہونے کا ذکر کیا۔ دو چار جملے ہی اپنا کام کر گئے اور میری ماں نے چند منٹ کی تفتیش کے بعد سب کچھ قبول کر لیا۔ جب انسپکٹر نے مجھے بلا کر میری ماں کا بیان دہرایا تو مجھے بھی قبول کرتے ہی بنی اور پھر ہم دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

”مگر یہ کرائمز برانچ والے درمیان میں کہاں سے ٹپک پڑے۔“ میں نے باباجی کو ٹوکتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے ثمینہ کی خودکشی کا پرچہ تو درج نہیں کرا دیا تھا۔“

”کرایا تھا اور تھانیدار نے مہربانی کرتے ہوئے تمام کارروائی بھی مکمل کر لی تھی۔ مگر اخبار کی ایک خبر نے ہمیں پھنسا دیا۔“ باباجی نے کہا اور خاموش ہو گئے۔ ان کی نظریں چھت پر گڑی تھیں۔ چند منٹ بعد وہ پھر مخاطب ہوئے۔ ”مگر شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ میں دنیا میں بھی سزا بھگت رہا ہوں اور آخرت کی خبر خدا جانے۔“ باباجی نے اس طرح کہا گویا اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔ پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

”میری ماں نے جب ثمینہ کو دوسری شادی کے لیے مجبور کرنا شروع کیا تو ثمینہ نے پھر اپنی دھمکی دہرائی کہ وہ خود کو جلا کر خودکشی کر لے گی۔ اب اسے میری ماں کی کم عقلی یا گنوارپن کہیے کہ میری ماں نے اسے زندہ جلا ڈالنے کی دھمکی دے ڈالی۔ پھر میری ماں نے گاؤں کے کچھ لوگوں کے سامنے بھی یہ بات کی کہ رفیق دوسری شادی کرنا چاہتا ہے مگر یہ راضی ماں ہی نہیں رہی اور دھمکیاں دیتی ہے کہ اگر رفیق نے دوسری شادی کی تو وہ خود پر بچی سمیت تیل ڈال کر جل مرے گی۔

ثمینہ کو شک ہو گیا کہ اس نے تو محض صرف مرعوب کرنے کے لیے خود کو جلانے کی دھمکی دی تھی مگر رفیق کی ماں تو واقعی غصے میں اندھی ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں کو حالات سے باخبر کیا اور ساتھ ہی خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس کی ساس اسے زندہ جلانا چاہتی ہے۔ یہ خط ثمینہ کی موت کے دوسرے دن اس کی ماں کو مل گیا۔ وہ یہ خط لے کر ایک اخبار کے دفتر میں گئی۔ کسی رپورٹر سے ملی جس نے اس بارے میں خبر شائع کر دی۔ لکھا کہ تھانے والوں سے مل کر رفیق نے اپنی بیوی کے قتل کو خودکشی کا رنگ دے رکھا ہے۔

یہ خبر شائع ہوتے ہی کرائمز برانچ کے سربراہ نے ایک تجربہ کار انسپکٹر کو اس کی تفتیش پر مامور کیا۔ جس نے ہمارے گھر پر چھاپہ مارا اور دونوں ماں بیٹے سے اقبالِ جرم کروا لیا۔ قتل کا مقدمہ قائم ہوا۔ عدالت میں بھی ہم اپنے بیان پر قائم رہے۔ چنانچہ عدالت سے مجھے پھانسی اور میری ماں کو عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے عمر قید کی سزا سنائی گئی ہم نے رحم کی اپیل کی جس کے بعد میری پھانسی کی سزا بھی عمر قید میں تبدیل ہو گئی اور ہم دونوں مختلف جیلوں میں سزا کاٹنے لگے۔

ماں تو گزشتہ برس قیدِ حیات سے نجات پا گئی مگر میں ابھی تک پابندِ سلاسل ہوں اور ضمیر کی پھٹکار سے روز مرتا اور روز جیتا ہوں۔ آخر میں نے اس کی تخلیق کو تباہ کرنے میں تو حصہ لیا ہے نا اور۔“

باباجی کی آواز بھرا گئی۔ آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر داڑھی کو بھگونے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے برف کا کوئی تودا سورج کی تیز شعاعوں کی زد میں آ گیا ہو۔ پھر انہوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے کہا۔

”یا خدا اس دنیا سے لالچ کو ہوس کو اٹھا لے تاکہ انسان سانپ بن کے ایک دوسرے کو ڈسنا بند کر دیں۔“ پھر باباجی مزید کچھ کہے بغیر اٹھے اور میرے کمرے سے نکل گئے۔ اس طرح جیل کی کہانی ختم ہو گئی۔ میں نے گھڑی دیکھی بارہ بج چکے تھے اور ابھی مجھے عشاء کی نماز بھی ادا کرنی تھی۔

⌘

تسلسل

یعقوب بھٹی

ایک حساس منصف کا احوال اس کا ریکارڈ تھا کہ اس کی عدالت سے کبھی کسی گناہ گار کو معافی نہیں ملی۔ شومئی قسمت اس کی عدالت میں پیش ہونے والا آخری مجرم رہا ہونے کو جا رہا تھا۔

ایک جج قانون نافذ کرنے والے مستعد افسر اور ایک مجرم کے درمیان کھیلے جانے والے ڈرامے کی روداد

"میں چاہتا ہوں تمہارا آخری کیس یادگار ہو۔ اس لیے خلیل منگی کو کل جیل سے عدالت لانے اور فیصلے کے بعد بحفاظت وہاں سے نکال لے جانے کی ذمہ داری میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔" ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج آفاق احمد نے منہ اوپر اٹھا کر سگار کا دھواں اگلا۔

ان کے مقابل بیٹھے ڈی ایس پی خالد رندھاوا نے کرسی پر پہلو بدلا۔ "اس میں یادگار والی کیا بات ہے۔ اسے بہ حفاظت لانے اور لے جانے کا فریضہ میرا ماتحت عملہ بخوبی انجام دے لے گا۔ جج آفاق احمد اور ڈی ایس پی خالد رندھاوا اسکول لائف کے دوست تھے اور یہ دوستی وقت کے ساتھ مزید پروان چڑھی تھی۔ اب وہ سمدھی بھی تھے۔

جج آفاق احمد نے پھر سگار کا طویل کش لیا۔

"میں اسے کل بری کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

یہ الفاظ نہیں گویا کرنٹ کا جھٹکا تھا۔ خالد رندھاوا سیدھا ہو بیٹھا اور بڑی غیر یقینی سے اپنے بچپن کے دوست کی طرف دیکھنے لگا جو بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا اور جس کے بارے میں میڈیا کی گیلریوں سے لے کر عدل کے ایوانوں تک مشہور تھا کہ اس نے آج تک کسی گناہ گار کو چھوڑا نہیں ہے۔

"تم اس گھناؤنے قاتل کو چھوڑ دو گے۔ جس نے پندرہ سال کی ایک معصوم بچی کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا کر بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا فاقی!" خالد رندھاوا نے بے حد شاکی انداز میں کہا۔

جج آفاق احمد نے تھکے تھکے انداز میں اپنا سر کرسی کی پشت گاہ سے لگایا اور دھیرے سے بولے۔

"جس طرح میرے حکم پر تم اس کی حفاظت کرنے پر مجبور ہو اسی طرح قانونی تقاضوں کے سامنے میں بھی مجبور ہوں۔" خالد رندھاوا ہونٹ بھینچے اسے دیکھے گیا۔

جج آفاق احمد کا سلسلہ کلام جاری تھا۔ "تم عدالتی کارروائی سے لاعلم ہو چشم دید گواہ اپنے بیانات بدل چکے ہیں۔ میڈیکل رپورٹ بھی چمک کے زیر اثر بدل چکی ہے۔ محض واقعاتی شہادتوں کی بنیاد پر میں اسے سزا نہیں دے سکتا۔ کل اسے بری کرنے پر میں مجبور ہوں۔"

خالد رندھاوا کے چہرے پر افسردگی نظر آنے لگی۔ اس کا دوست واقعی مجبور تھا۔ مضبوط ایف آئی آر کے بعد گواہ اپنے بیانات پر ڈٹے رہتے تو دنیا کی کوئی طاقت خلیل منگی کو پھانسی کے تختے سے نہیں بچا سکتی تھی۔

جج آفاق احمد کی اسٹڈی میں خاموشی چھا گئی تھی۔ آواز تھی تو ان نصف درجن سے زائد دیوار گیر گھڑیوں کی جو اسٹڈی کی دیواروں پر چاروں جانب نصب تھیں۔ پرانی دیوار گیر گھڑیاں جمع کرنا آفاق احمد کا بہت پرانا شوق تھا۔

خاموشی کو خالد رندھاوا نے ختم کیا۔ "پھر تو دعا کی

ئے کہ اس معصوم مقتول دعا علی کا بھائی کیپٹن عاکف علی اپنے دعوئی میں کامیاب ہو جائے۔"

"دعا ہی کر سکتے ہیں مگر یہ ناممکن نظر آتا ہے۔"

حساس ادارے سے وابستہ عاکف علی زیر حراست ملزم خلیل منگی پر پہلے بھی ایک ناکام قاتلانہ حملہ کر چکا تھا اور اس کے بعد سے غائب تھا۔

چند دن پہلے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اس کا یہ دعوئی سامنے آ چکا تھا کہ اگر عدالت نے اس کی معصوم بہن کے قاتل کو بری کر دیا تو وہ اسی وقت بھری عدالت میں جج کے سامنے اسے ہلاک کر دے گا۔ رائی کا پہاڑ بنانے والے چینلز میں آج کل اسی دعوئی کا چرچا تھا۔

نصف درجن سے زائد دیوار گیر گھڑیوں نے رات کے نو بجنے کا اعلان کیا بہ یک وقت مختلف ساز و آواز سے اسٹڈی گونج اٹھا تھا۔

چند لحظوں کے لیے جج آفاق احمد نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ آوازیں انہیں بڑا سکون دیتی تھیں۔ انہوں نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "بہر حال ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے اور اس سر پھرے کیپٹن کو اپنا..... دیکھتے کون کامیاب ہوتا ہے۔"

"تمہارا یہ دوست۔" خالد رندھاوا نے بڑے یقین انداز میں کہا۔ "مگر میری نیک خواہشات اس کیپٹن کے ساتھ ہیں۔"

"دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ اسے کوئی رخنہ نہ دوں مگر ڈی ایس پی خالد رندھاوا اپنے بے داغ کیریئر کے ساتھ ہی اگلے ہفتے ریٹائرمنٹ چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کیپٹن عاکف اس موذی کو بری ہونے کے بعد بھی کہیں نہ کہیں گھیر کر چیر ڈالے گا۔" خلیل منگی کے لیے اس کے انداز میں نفرت ہی نفرت تھی۔

جج آفاق احمد نے بجھ جانے والے سگار کو انگلیوں میں گھمایا۔ "اسی لیے تو میں نے تمہیں منتخب کیا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ کیس تمہارے لیے یادگار ہو گا۔" انہوں نے اپنے الفاظ دہرائے اور ساتھ ہی کچھ یاد آنے پر چونکے۔

"اٹھو یار! بچوں کے سونے کا ٹائم ہونے والا ہے۔ وہ کچھ دیر اپنے نانا کی پیٹھ پر سواری کر لیں۔ مصنوعی گھوڑوں پر بیٹھ کر دونوں بھائی اکتا گئے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی کرسی چھوڑ دی۔

"کیا انہیں گدھے کی سواری پسند نہیں ہے؟" خالد رندھاوا نے ذو معنی انداز میں کہا۔

جج آفاق احمد اس کا مطلب جان کر ہنسنے لگے تھے۔

☆

خالد رندھاوا نے رات ہی کو اپنے قابل دچوکس ماتحت غلام رسول بھٹی کے ساتھ مل کر اگلے دن کے لیے سیکورٹی پلان ترتیب دے دیا تھا۔

ہیڈ کوارٹر سے اضافی نفری بھی مانگ لی گئی تھی۔ طے ہوا تھا کہ خلیل منگی کو بکتر بند گاڑی میں لایا اور لے جایا جائے۔

فلموں اور ڈراموں میں تو بری ہونے والے ملزمان کی ہتھکڑی کمرہ عدالت میں ہی کھول دی جاتی ہے۔ مگر حقیقت میں ضابطے کی ضروری کارروائی کے بعد ملزم کو جیل سے ہی رہا کیا جاتا ہے۔

آپس میں پلان ترتیب دینے کے دوران غلام رسول بھٹی نے کہا۔ "سر! ہمیں اپنی تمام تر توجہ کمرہ عدالت پر ہی مرکوز رکھنی چاہیے۔"

خالد رندھاوا بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے کمرہ عدالت میں خلیل منگی کو ہلاک کرنے والی بات ہمیں بھٹکانے کے لیے ہے۔ کیپٹن کہیں اور بھی وار کر سکتا ہے۔"

غلام رسول بھٹی کی بھوری آنکھوں میں تحسین کی چمک ابھری۔ خالد رندھاوا کے ساتھ رہ کر اسے بہت

کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہی رہتا تھا۔ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا پھر بکتر بند کو احاطہ عدالت کے بجائے کمرہ عدالت کے دروازے تک لے جائیں گے۔

☆

منظر کمرہ عدالت کا تھا۔ خلیل منگی کو بکتر بند میں بحفاظت لایا جا چکا تھا۔ وہ جج آفاق احمد کے ڈیسک کے دائیں طرف ملزموں کے کٹہرے میں بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔ اسے اپنے بری ہونے کا یقین تھا۔ اس نے تازہ شیو بنوائی تھی اور کاٹن کے سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔

خلیل منگی کا رنگ قدرے گہرا تھا۔ عمر پینتیس سال تھی۔ وہ اونچا لمبا اور ورزشی جسم کا مالک تھا بظاہر وہ ایک بلڈر مگر درحقیقت قبضہ مافیا کا مقامی سربراہ تھا۔

شام کے اوقات میں وہ ایک جدید ''ہیلتھ اینڈ فٹنس کلب'' میں ورزش کرتا تھا۔ اسی کلب کا ایک پورشن خواتین کے لیے مخصوص تھا۔

دعا علی بھی اسی کلب کی ممبر تھی۔ آتے جاتے وہ شاداب اور نوخیز لڑکی جو اپنے نوخیز جسم کی گھاتوں سے ناواقف تھی خلیل منگی کے جذبات میں ہلچل مچاتی تھی۔ منگی نے اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اسے ناکامی ہوئی۔ ایک دن پارکنگ میں اس کی نازیبا حرکت پر دعا نے اسے تھپڑ جڑ دیا۔ یہ تھپڑ خلیل منگی کو آپے سے باہر کر گیا۔ پہلے تو اس نے مشتعل ہو کر دعا پر تشدد کیا۔ اس کے بعد اسے زبردستی اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔

دعا چیختی' چلاتی رہ گئی۔ مگر اس کی مدد کو کوئی نہیں آیا۔ اگلے دن دعا کا زخموں سے چور بے روح جسم ایک معروف شاہراہ کے کنارے پڑا ملا۔

زندگی کی ڈور کاٹنے سے پہلے اسے بے آبرو کیا گیا تھا۔

دعا کو اغوا کرتے ہوئے خلیل منگی کو کئی افراد نے دیکھا تھا۔ اس لیے کسی شک وغیرہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

مقتولہ کا بھائی ایک حساس ادارے کا رکن تھا پولیس فوراً حرکت میں آئی اور خلیل منگی کو گرفتار کر لیا گیا اس کے بعد خلیل منگی نے ڈوریاں ہلائیں گواہان جان کے خوف سے منحرف ہو گئے۔ نوٹوں نے چند ایمان بھی خرید لیے۔ میڈیکل رپورٹ بھی بدل گئی تھی اور اب وہ رہا ہو کر کسی اور دعا کے لیے بددعا بننے والا تھا۔

جج آفاق احمد اپنی نشست سنبھال چکے تھے۔ ریڈر نے پہلے سے ٹائپ شدہ فیصلے کی فائل ان کے سامنے رکھی۔

عدالت میں دونوں طرف کے وکیلوں کے علاوہ بار کونسل کے صدر کامران پیرزادہ' میڈیا کے چند منتخب نمائندوں' دعا علی کے دو فیملی ممبروں' خلیل منگی کے بڑے بھائی اور سیکورٹی کے تین افراد کے سوا کسی کو داخلے کی بات نہیں دی گئی تھی۔

میڈیا کے نمائندوں کا سامان وغیرہ اچھی طرح چیک کیا گیا تھا۔ باقی سب افراد بھی اسکیننگ سے گزرے تھے۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ نے بھی کمرہ عدالت کو کلیئر کیا تھا۔

ڈی ایس پی خالد رندھاوا اور انسپکٹر غلام رسول بھٹی خود ہی ہر طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ تیسرا ایک چاق و چوبند سپاہی تھا۔ جس نے منگی کے ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی کا دوسرا سرا تھام رکھا تھا۔

کمرہ عدالت میں نصب دیوار گیر گھڑی نے دوپہر کے گیارہ بجنے کا اعلان کیا۔ جج آفاق احمد نے ڈیسک کے سامنے کھڑے وکیل صفائی کو بیٹھنے کے لیے کہا اور نگاہ کا چشمہ ناک پر درست کرتے ہوئے سپاٹ انداز میں فیصلہ سنانا شروع کیا۔

''حالات و واقعات اور گواہان کے بیانات کی روشنی میں عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملزم خلیل منگی ولد جمیل منگی بے گناہ ہے۔''

یہ الفاظ نہیں گویا توانائیاں چوس لینے والا مقناطیس تھا۔ دعا علی کے چاچا کے حلق سے ایک دلدوز آہ نکلی اور ان کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ دعا علی کا بہنوئی انہیں سنبھالنے میں لگ گیا۔

خلیل منگی کے بھائی کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ دونوں بھائیوں کی نظریں ملیں اور فتح مندی کا احساس ایک ہو گیا۔

خالد رندھاوا اور غلام رسول بھٹی کی نگاہ ہر جنبش پر تھی۔ وہ لمحہ آنے والا تھا جس کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ بظاہر ہر طرف سکون تھا۔ انہیں یقین تھا کہ کیپٹن عاکف نے انہیں بھٹکانے کے لیے یہ دعویٰ کیا ہے۔ وہ یقیناً واپسی پر منگی پر حملہ آور ہوگا۔

جج آفاق احمد نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے ایک نظر خلیل منگی پر ڈالی۔ ''اسی بنیاد پر عدالت خلیل منگی ولد جمیل منگی کو باعزت بری کرنے کا حکم دیتی ہے۔''

خلیل منگی نے خوشی سے بے قابو ہو کر دونوں ہاتھ بلند کیے۔ کیمرے اس پر چمکنے لگے تھے۔

اچانک ہی وہ لڑکھڑایا۔ اس کی ہتھکڑی سنبھالنے والے سپاہی نے اس کی تیز سسکاری سنی' اس کا ہاتھ اپنے سینے پر گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ کٹہرے کی ریلنگ سے ٹکرایا اور اسے توڑتے ہوئے جج کے ڈیسک کے عین سامنے جا گرا۔

چند لمحوں کے لیے تو جیسے سکوت طاری ہو گیا۔ خالد رندھاوا نے حیرت کے سبب پلکیں جھپکائیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو منظر اس نے دیکھا ہے وہ حقیقت ہے یا محض واہمہ۔

بہ یک وقت کئی دہانوں سے تحیر زدہ آوازیں بلند ہوئیں۔ خلیل منگی کا بھائی چیختے ہوئے اپنے بھائی کی طرف دوڑا۔ اسے راستے ہی میں غلام رسول بھٹی نے جکڑ لیا۔

''خود کو قابو رکھو۔'' اس کا انداز قطعی تھا۔

اگلے چند منٹ بعد جج آفاق احمد کمرہ عدالت سے ملحق اپنے چیمبر میں جا چکے تھے۔ کئی سیکورٹی اہلکار کمرہ عدالت میں تھے۔ ایمبولینس کے لیے کال کی جا چکی تھی۔

خلیل منگی کا بھائی بے قابو ہو رہا تھا۔ اسے زبردستی لے جایا گیا تھا۔ باقی سب افراد کو اسی جگہ بٹھا دیا گیا تھا اور ان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔

دعا علی کے نڈھال چاچا کے جسم میں توانائیاں پھوٹ پڑی تھیں۔ وہ ایک کونے میں سجدہ ریز تھے۔ یہ یقیناً سجدہ شکر تھا۔ دعا علی کے بہنوئی کا چہرہ بھی چمک اٹھا تھا۔

خلیل منگی کا جسم چند تشنجی جھٹکے لے کر ساکت ہو گیا تھا۔ اس کا سانولا چہرہ تاریک تر ہو گیا تھا اور ہونٹوں پر نیلے رنگ کی جھاگ تھی۔

دعا علی کا مجرم ختم ہو گیا تھا۔ کیپٹن عاکف علی اپنے دعوئی میں کامیاب رہا تھا۔

منگی کے سینے پر دائیں جانب ایک سوئی جتنا بڑا ایرو نصف سے زیادہ پیوست تھا۔ جو یقیناً انتہائی سریع اثر زہر سے آلودہ تھا۔

مگر اس ایرو کو کہاں سے کس نے اور کیسے فائر کیا؟ یہ دماغ چکرا دینے والے سوال تھے۔

ایمبولینس کو واپس کر دیا گیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر سے مرڈر انویسٹی گیشن کی اسپیشل ٹیم آنے والی تھی۔ ان کی آمد تک کمرہ عدالت کو بند کر دیا گیا۔

سب لوگوں کو مکمل تلاشی کے بعد فی الحال حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا تھا۔ انویسٹی گیشن کی کارروائی

مکمل ہوتے ہی خلیل منگی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردی گئی۔

کچھ دیر میں جج آفاق احمد بھی اپنا بریف کیس سنبھالے رخصت ہوئے۔ خالد رندھاوا کے قریب رک کرانہوں نے دھیرے سے کہا۔

''وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا نا! میں نے کہا تھا نا یہ تمہارے لیے یادگار کیس ہوگا۔''

خالد رندھاوا ہونٹ بھینچے خاموش رہا۔ اس کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ گاڑی آئی اور جج آفاق احمد رخصت ہوگئے۔



اگلے دن خالد رندھاوا اور غلام رسول بھٹی سر جوڑے بیٹھے تھے۔ خالد رندھاوا کی کوشش کے سبب خلیل منگی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آچکی تھی اور اسپیشل انویسٹی گیشن والوں نے بھی ابتدائی رپورٹ مرتب کردی تھی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق خلیل منگی کی موت ''ایل ایل 11'' نام کے ایک بے حد سریع اثر کیمیائی زہر سے ہوئی تھی۔

اسپیشل انوسٹی گیشن والوں کے مطابق منگی کے سینے میں زہریلا ایرو بالکل سامنے اور چھ فٹ کی بلندی سے اتارا گیا تھا۔

منگی کا قد چھ فٹ اور ایک انچ تھا۔ اس کے علاوہ ملزموں والا کٹہرہ بھی زمین سے آٹھ انچ اونچا تھا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ جس وقت منگی کے سینے میں زہریلا ایرو اترا اس کے سامنے گواہوں والا کٹہرہ تھا۔ اس کے پیچھے دیوار اور دیوار پر ٹنگی دیوار گیر گھڑی۔

کٹہرے دیوار اور دیوار گیر گھڑی کو واردات سے پہلے بھی چیک کیا گیا تھا اور بعد میں بھی ان میں کسی طرح کی کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔

تو کیا کیپٹن عاکف سلیمانی چادر اوڑھ کر کمرۂ عدالت میں آیا تھا اور منگی کو ہلاک کرکے بحفاظت نکل گیا؟

یہ وہ سوال تھا جس نے دونوں قابل پولیس افسران کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ خالد رندھاوا نے معلوم کرلیا تھا ایل ایل 11 نامی زہر اور ہتھیلی کے سائز کی جدید ترین ایرو گن وہی حساس ادارہ استعمال کرتا تھا۔ جس سے کیپٹن عاکف وابستہ رہا تھا۔ ایرو کے زاویے کا پتا چلنے کے بعد کمرۂ عدالت میں موجود سبھی افراد شک کے دائرے سے نکل گئے تھے۔ انہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس وقت سبھی نیوز چینل خلیل منگی کی ہلاکت اور آخری لمحات کی ویڈیو دکھا رہے تھے۔ ساتھ ہی پولیس کی کارکردگی پر بھی خاصی لے دے ہورہی تھی۔

قاتل اپنے دعویٰ کے مطابق منگی کی پولیس کو حراست میں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ دونوں افسران درجنوں دفعہ آخری لمحات کی ویڈیو دیکھ چکے تھے۔ مگر کوئی ذرا سا بھی کلیو نہیں مل رہا تھا۔ بظاہر اس واردات میں کسی پراسرار طاقت کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ میڈیا کے ذرائع پر بھی اس پراسراریت کے چرچے تھے۔

ویڈیو دستیاب ہونے کے سبب بی بی سی فاکس نیوز اور سی این این جیسے نشریاتی اداروں نے بھی اس پراسرار واردات کو کوریج دی تھی۔

غلام رسول بھٹی نے تھکے تھکے انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''سر! اگر اسکاٹ لینڈ یارڈ اور ایف بی آئی والوں کی مشترکہ ٹیم بھی بنادی جائے تو وہ بھی اس معاملے کی تھی نہیں سلجھا پائے گی۔ میری مانیں تو گھر جا کر آرام کریں۔ کیپٹن جس دن ہاتھ آ گیا اسی سے معلوم کرلیں گے کہ یہ واردات اس نے کس

طرح کی ہے۔''

خالد رندھاوا نے بھی جمائی لی گزشتہ اڑتیس گھنٹے سے اس نے بھی بھرپور نیند نہیں لی تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں افسران نے اپنے گھروں کی راہ لی۔

صبح ٹھیک سات بجے پہلے سے سیٹ کیے موبائل الارم کی مترنم آواز نے خالد رندھاوا کو جگا دیا۔ موبائل الارم کے ساتھ اس کے ذہن میں بھی ایک گھنٹی بجی تھی۔

اس نے بڑی تیزی سے بستر چھوڑا اور بغیر ناشتا کیے ہیڈ کوارٹر کی طرف دوڑا۔ نصف گھنٹے بعد منگی کے آخری لمحات کی ویڈیو وہ دوبارہ دیکھ رہا تھا۔

ویڈیو کو اس نے مزید پیچھے کیا اور پھر اس کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آفس میں ہی ناشتا کرکے وہ سیل کمرہ عدالت کی طرف روانہ ہوگیا۔

رات کو ٹھیک آٹھ بجے وہ جج آفاق احمد کے ساتھ ان کی اسٹڈی میں موجود تھا۔ خالد رندھاوا کافی اور جج آفاق احمد حسب سابق سگار سے محظوظ ہورہے تھے۔ منگی کے قتل کی پراسراریت پر وہ گفتگو کرچکے تھے۔

کافی کے آخری گھونٹ لیتے ہوئے خالد رندھاوا نے سامنے دیوار پر نظر ڈالتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

اس پیتل کے کلاک کے ساتھ مارک اینڈ بینسن والوں کا سوئزرلینڈ میڈ کلاک تھا۔ وہ نظر نہیں آرہا۔

''وہ خراب ہوگیا ہے۔'' جج آفاق احمد نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

دونوں دوستوں کی نظریں ملیں دونوں ہی ایک دوسرے کے مزاج کے سبھی رنگوں سے بخوبی واقف تھے۔

خالد رندھاوا نے خالی کپ رکھتے ہوئے بڑے آرام سے کہا۔ ''تمہاری ذہانت کا کوئی توڑ نہیں۔ میرا آخری کیس تم نے واقعی یادگار بنادیا ہے''

جج آفاق احمد بالکل نہیں چونکے دھواں اگلتے

ہوئے انہوں نے کہا۔ ”تو آخر تمہیں میرا خیال آ ہی گیا۔ مگر تمہارے پاس صرف مفروضات ہیں۔ کوئی ثبوت اور نہ ہی تم یہ جانتے ہو کہ یہ سب کیسے ہوا؟“

”خام خیالی ہے تمہاری۔“ خالد رندھاوا مسکرایا۔ ”بے شک کوئی ثبوت نہیں ہے مگر میں جان گیا ہوں کہ یہ کارنامہ تم نے کیسے انجام دیا۔“

”ذرا میں بھی سنوں۔“ جج آفاق احمد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر البتہ فتح اور کامیابی چمک بن کر نمودار ہو چکی تھی۔ ساتھ میں قدرے فخر کا بھی رنگ تھا۔

”تمہیں کیپٹن عاکف کی تکنیکی مدد حاصل تھی۔“ پہلی دفعہ جج آفاق احمد قدرے ڈسٹرب ہوئے۔ انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

خالد رندھاوا رواں تھا۔ ”میں نہیں جانتا تم دونوں کا گٹھ جوڑ کیسے ہوا؟“

جج آفاق احمد نے مداخلت کی۔ ”تمہاری مشکل میں آسان کر دیتا ہوں۔ اسے میرے پاس تمہارا بھتیجا مجاہد لایا تھا۔ آگے چلو!“

”شکریہ۔“ خالد رندھاوا نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اس ملاقات میں تم دونوں نے مل کر معصوم دعا کے گھناؤنے قاتل کو کمرہ عدالت میں قتل کرنے کا پروگرام بنایا۔ تمہیں اپنے منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا۔ اس دوران تمہارے اندر کا شرارتی خاکی جاگ گیا۔ تم نے مجھے درمیان میں گھسیٹ کر ایک طرح سے چیلنج کر دیا کہ دیکھو تمہارے سامنے منگی مارا جائے گا۔ کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔“

جج آفاق احمد کھل کر ہنسے۔ ”بالکل ٹھیک جا رہے ہو۔“

”منصوبہ یقیناً تمہارا تیار کردہ تھا۔ تمہارے کہنے کے مطابق کیپٹن عاکف نے تمہاری اسٹڈی والے مارک اینڈ بینسن والے کلاک میں ضروری تبدیلی کر کے اس میں ایر وگن نصب کر کے اس کا ٹریگر ریموٹ کنٹرول سے منسلک کر دیا۔“ جج آفاق احمد ساکت رہ گئے۔

ان کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خالد رندھاوا نے سلسلہ جاری رکھا۔ ”فیصلے والے دن تم اس خاص کلاک کو بریف کیس میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئے۔

تم اس وقت اپنے چیمبر میں تھے جب میری ٹیم کمرہ عدالت کو کلیئر کر رہی تھی۔ ہم نے وہاں پہلے سے نصب تمہارے خاص کلاک جیسے مارک اینڈ بینسن کے کلاک کو بھی چیک کیا تھا۔ مطمئن ہو کر ہم نے کمرا عدالت بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد تمہارے لیے بے حد آسان تھا کہ اپنے چیمبر سے کمرا عدالت میں کھلنے والے دروازے کے ذریعے تم اندر داخل ہو کر عام کلاک کو خاص کلاک سے بدل دو۔

ملزموں کے کٹہرے اور کلاک کا درمیانی فاصلہ کلاک کی بلندی اور منگی کا چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد سب کچھ تمہاری نظر میں تھا۔

منگی کو تم نے بری نہیں کیا تھا بلکہ اسے سزائے موت دی تھی۔ ریموٹ کا محض ایک بٹن دبا کر تم نے اسے ہلاک کر دیا۔ شاید ایسے ہی قتل کے بارے میں یہ شعر کہا گیا ہے۔

نہ ہاتھ میں خنجر نہ آستین پر لہو
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرد ہو

جج آفاق احمد نے بے آواز تالی بجائی۔ ”ایک پولیس آفیسر کا قاتل کو خراج تحسین مجھے گدگدا رہا ہے۔“

خالد رندھاوا نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”قتل کے بعد جب ہم نے دوبارہ کمرا عدالت کو بند کیا تو تم نے پہلے کی طرح کلاک تبدیل کر دیے اور ہمارے سامنے بڑے آرام سے رخصت ہو گئے اور ہم ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ گئے۔“

اس کے انداز پر جج آفاق احمد کھلکھلا کر ہنسے۔ ”تمہاری کہانی محض مفروضات پر مشتمل ہے تمہارے پاس تو میرے خلاف کوئی واقعاتی شہادت بھی نہیں ہے۔ محض مفروضات پر مشتمل کہانی سن کر کوئی کورٹ ایک معزز ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے گرفتاری وارنٹ بھی جاری نہیں کر سکتی۔ بلکہ عین ممکن ہے ایسی درخواست کرنے والے پولیس آفیسر کے اسٹار موقع پر ہی اتار لیے جائیں۔“

”جانتا ہوں۔“ خالد رندھاوا نے کہا۔ ”میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے اور یقیناً وہ خاص کلاک بھی ابھی تک تم نے ضائع کر دیا ہوگا۔“

”تم واقعی ایک قابل پولیس آفیسر ہو۔“ جج آفاق احمد نے حقیقی ستائش سے کہا۔ پھر نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر کے انہوں نے پوچھا۔ ”تمہیں میرا خیال کیسے آیا؟“

”منگی کے عین سامنے نصب پرانا کلاک میرے ذہن میں چبھ رہا تھا۔ ویسا کلاک میں یہاں بھی دیکھ چکا تھا۔“ خالد رندھاوا نے انگلی سے اسٹڈی کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ”صبح الارم کی گھنٹی نے یاد دلایا کہ پرانے کلاک جمع کرنا تمہارا بہت پرانا شوق ہے۔

تمہاری طرف ذہن گیا تو پردے ہٹتے چلے گئے۔ تم واحد فرد تھے جو اپنے چیمبر کے راستے بڑے آرام سے واردات سے پہلے اور بعد میں کمرہ عدالت میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر داخل ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ تم نے فیصلہ سنانے سے پہلے ایر وادر منگی کے درمیان موجود وکیل صفائی کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ اگر وکیل صفائی وہاں کھڑا رہتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر تم نے بطور خاص اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ان لمحات کی ویڈیو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کارنامہ تم نے انجام دیا ہے۔“

”تم خوامخواہ ریٹائرڈ ہو رہے ہو۔ تمہاری ذہنی صلاحیتیں ابھی قابل رشک ہیں چاہو تو دو تین سال کی توسیع کروا لو۔“

”نہیں۔“ خالد رندھاوا نے قطعی اور قدرے تھکے انداز میں کہا۔ ”میں اب تھک چکا ہوں۔“ جج آفاق احمد نے کندھے اچکائے۔

خالد رندھاوا نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ ”میرا آخری کیس یادگار رہے گا۔ اس نوٹس کے ساتھ کہ ہر الجھے کیس کی گتھیاں سلجھانے والا رندھاوا اپنے آخری کیس کو حل کرنے میں ناکام رہا۔ مگر تمہارا اصول اب بھی قائم و دائم ہے۔“

”کون سا؟“ جج آفاق احمد نے الجھ کر پوچھا۔

خالد رندھاوا نے اس پر نگاہیں جمائیں۔ ”تمہارے بارے میں مشہور ہے کہ تم کبھی مجرم کو چھوڑتے نہیں ہو تمہارا تسلسل جاری ہے۔“

جج آفاق احمد نے طمانیت کے احساس کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ ان کا ضمیر مطمئن تھا۔



آبرو والی

محترم عمران بھائی
السلام علیکم!
ہمارا معاشرہ تیزی سے مغربی رنگ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ آج ٹی وی کھولو تو اسّی فیصد سیاسی و غیر سیاسی ٹاک شو کی اینکر پرسن آپ کو خواتین نظر آئیں گی۔ جو دوپٹے کے بغیر بال پھیلائے اردو ملی انگریزی میں چلا چلا کر گفتگو کر رہی ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں یہی خواتین نوجوان لڑکیوں کے لیے آئیڈیل ثابت ہوتی ہیں۔ جب اس منزل کی تلاش میں یہ لڑکیاں آگے بڑھتی ہیں تو انہیں ایسے حالات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے علینہ کے ساتھ ہوا۔ یہ کہانی آپ کو پسند آئے یا نہ آئے لیکن میری درخواست ہے کہ اسے شائع ضرور کیجیے گا شاید یہ تحریر پڑھ کر اندھا دھند مغرب کی تقلید کرنے والی ہماری کوئی بہن گڑھے میں گرنے سے بچ جائے۔

زین نقوی
ساہیوال پنجاب

"ہمارے معاشرے میں وہ کون سا ظلم ہے جو کمزور پر نہیں ڈھایا جاتا؟" حمنہ نے ہال کے حاضرین پر نظر ڈال کر کہا۔

"اور حمنہ جی! ہمارے معاشرے میں اس ظلم کے خلاف آواز بھی کوئی نہیں اٹھاتا' سب اس ظلم کو معاشرے کی روایت سمجھتے ہیں۔" معاذ نے حمنہ کی بات کو مکمل کیا۔

وہ سب ایک معروف اخبار سے وابستہ تھے اور اس وقت اخبار کے ایڈیٹر کے ہاں ماہانہ دعوت پر آپس میں بحث کر رہے تھے۔

"دوستو! کچھ بھی ہو جائے' ہمیں اپنے اخبار کے لیے ہر روز ایک نیا اچھوتا اور مسالے دار موضوع چاہیے۔ آپ سب ہمارے لیے اہم ہو کیونکہ آپ معاشرے سے واقعی ایسے موضوعات ڈھونڈ نکالتے ہو۔" یہ اس اخبار کا سینئر ایڈیٹر تھا۔ جس کا کلام بلاشبہ اپنی رپورٹنگ ٹیم کے ساتھ تھا۔ سب سمجھ گئے کہ اب یہ مباحثہ جاری نہیں رہ پائے گا کیونکہ اخبار کے ایڈیٹر نے ایک لحاظ سے تقریباً ہر بات ختم کر دی تھی۔ سب اپنی نشستوں سے اٹھ کر طعام گاہ کی طرف بڑھ گئے۔

"رکیے معاذ صاحب! مجھے کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنا ہے' مجھے لگتا ہے آپ اپنی ذات میں ایک دلچسپ اور مسالے دار کہانی لیے بیٹھے ہیں۔" حمنہ نے اس کا راستہ روک لیا۔

"بالکل! اگر یہ کوئی مناسب وقت نہیں ہے کیونکہ پہلے کھانے سے انصاف کر لیا جائے۔" معاذ نے مسکرا کر کہا تو حمنہ بے اختیار ہنس دی۔

"آپ باتیں بہت دلچسپ کرتے ہیں اسی لیے تو ایک کامیاب رپورٹر ہیں۔" حمنہ نے خوب صورتی سے جواب دیا جسے سن کر وہ بھی مسکرا دیا۔

"معاشرے میں ظلم زیادہ اور انصاف کم ہے پھر بھی ظلم کے خلاف بہت کم آوازیں اٹھتی ہیں' آخر کیوں؟" حمنہ نے اپنے سیل فون سے معاذ کو پیغام بھیجا۔

"حمنہ جی! موضوع واقعی اچھوتا اور منفرد ہے۔ میں آپ کی مدد ضرور کروں گا' میں اپنے طور پر

ملاقاتے میں خاص چھان بین کروں گا۔ امید ہے میرے فیلڈ ورک اور نوٹس سے آپ کو مدد ملے گی۔" معاذ نے جوابی پیغام ارسال کیا۔ دونوں نے کھانا کھاتے ہوئے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور دوسرے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس محفل میں کھانا کم اور ایک دوسرے کے تجربات پر زیادہ بات کی جاتی تھی' اس طرح ہر بار نئے آنے والوں کو کچھ نہ کچھ سیکھنے کو مل جاتا تھا۔

☆......☆......☆

"معاذ! کیا حال ہیں؟ ابھی تک تم نے کوئی رپورٹ نہیں بھیجی۔ کیوں ہمارے معاشرے میں ظلم کے خلاف اٹھنے والی آوازیں کم ہیں؟" حمنہ نے چند دن بعد معاذ کو اس کے سیل فون پر مخاطب کیا۔

"بہت مصروف ہوں یار! آج کل انتخابات کی تیاریاں ہو رہی ہیں' سیاسی جوڑ توڑ کی کارروائیاں عوام کی دلچسپی کا مرکز ہیں' اس لیے تمہاری مدد نہیں کر پاؤں گا اور مجھے دکھ ہے کہ اتنا بڑا سوشل مسئلہ صرف تم کو اکیلے نمٹانا پڑے گا۔" معاذ نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں' میں آج سے خود کام شروع کرنے والی ہوں۔" حمنہ نے بتایا۔

"او کے! میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔" معاذ نے جواب دیا۔

"صرف نیک' کچھ عملی بھی وابستہ کر لو' آخر تمہیں پسند کرتی ہوں۔" حمنہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور رابطہ ختم کر دیا۔

"کیا......؟" معاذ سیل فون تھامے حیرت سے بولا مگر وہ اپنی بات پوری کر چکی تھی۔

ایک ماہ بعد وہ سب ایسی ہی ایک تقریب میں ملے تھے۔

"جی حمنہ جی! آپ نے کتنا کام کیا اپنے پروجیکٹ پر۔ ابھی تک کوئی خبر پڑھنے کو نہیں ملی۔" معاذ نے اس سے سوال کیا۔

"یار! سب سے کہہ تو دیا ہے کہ اکیلی یہ کام مکمل کر لوں گی لیکن یہ بہت مشکل ہے۔ ایک باقاعدہ فیلڈ ورک کرنا پڑے گا۔ سیکڑوں لوگوں سے مل کر یہ طے کرنا پڑے گا کہ اس کے در پردہ عوامل کیا ہیں؟" حمنہ نے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے اپنے سینئر ایڈیٹر سے بھی بات کی تھی' انہیں بھی تمہارا کام پسند ہے انہوں نے کہا تھا کہ وہ علینہ کو تمہاری مدد کے لیے کہہ دیں گے۔ میری ان سے ابھی چند دن پہلے ہی بات ہوئی تھی تم اپنے طور پر بھی بات کر لو۔" معاذ نے بتایا۔

"ٹھیک ہے یہ تو بہت خوشی کی بات ہے' پہلی بار ہمارے ایڈیٹر نے ہمارا خیال کیا۔" حمنہ مسکرائی۔

"بالکل اور یہ بھی صرف اس لیے کہ آج سے پہلے ایسا معاشرتی کام کسی اخبار نے نہیں کیا۔ یہ کافی مسالے دار ثابت ہو گا۔" معاذ نے جواب دیا اور دونوں ہنس پڑے۔ کھانا شروع ہو چکا تھا' حمنہ اپنے کھانے کی پلیٹ تھامے اخبار کے ایڈیٹر کی طرف بڑھی تاکہ اپنی مدد کے لیے علینہ کو بھی اپنے پروجیکٹ کا حصہ بنا سکے۔

"ابھی تک تم نے پیپر ورک یا فیلڈ سروے شروع نہیں کیا۔ اتنے کم وقت میں اتنا بڑا پروجیکٹ کیسے مکمل کرو گی؟" علینہ نے حمنہ کا آئیڈیا سن کر کہا۔ یہ ان کا پہلا دن تھا۔

"کچھ سمجھ میں بھی تو آئے' شروع کہاں سے کروں؟" حمنہ نے پریشانی سے جواب دیا۔

"ہاں واقعی شروع کہاں سے کیا جائے۔" علینہ بھی فکر مند ہو گئی۔

”ہم دونوں اپنے اپنے طور پر سوچتے ہیں‘ کل کوئی فیصلہ کریں گے۔“ حمنہ نے کافی سوچ بچار کے بعد جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ویسے بھی اتنی جلدی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ علینہ نے مسکرا کر جواب دیا اور حمنہ سے مصافحہ کرکے کمرے سے باہر نکل گئی۔ انہیں اگلے ماہ کھانے کی تقریب میں اپنا پروجیکٹ فائنل کرکے دینا تھا اور بظاہر یہ ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ معاشرے میں ہر شخص پر ہونے والے ظلم کی داستان مختلف تھی۔ جتنے لوگ ہوں گے شاید اتنی ہی کہانیاں ہوں گی‘ حمنہ سوچ رہی تھی۔

جلد ہی انہیں اپنا ٹارگٹ مل گیا‘ انتخابات قریب تھے اس علاقے کی ایک معروف سیاسی شخصیت نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کچھ وقت گزار کر اس کے آئندہ سیاسی عزائم کو عوام کے سامنے پیش کریں اور ان دونوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس سیاسی شخصیت سے مل کر یہ معلوم کریں گے کہ ان کے پاس لوگ سب سے زیادہ کون سے مسائل لے کر آتے ہیں۔ حمید احمد اس علاقے کا بہت بڑا سماجی کارکن بھی تھا دونوں مطلوبہ وقت پر حمید احمد کے گھر پہنچ گئیں۔ چائے کے مختصر سے دور میں دونوں نے بہت سی اہم باتیں معلوم کرلیں۔

”میں آپ کے لیے کھانا بھی بنواتا ہوں۔“ مختصر سے وقفے میں حمید احمد نے ان سے اجازت چاہی۔

”نہیں سر! اس کی ضرورت نہیں ہے اور یہ کھانے کا وقت بھی نہیں ہے۔“ علینہ بولی۔

”جی سر! مہمان نوازی کا شکریہ‘ ہمیں صرف آپ کے چند منٹ اور چاہئیں۔“ حمنہ نے بھی اصرار کیا۔

”آپ ہماری مہمان ہیں علینہ جی۔ حمنہ جی! تو پہلے بھی اکثر آتی رہی ہیں‘ آپ پہلی بار آئی ہیں آپ کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں چھوڑوں گا۔ بس تھوڑی دیر میں سب انتظام ہوجائے گا۔“ حمید احمد نے علینہ کو جواب دیا۔ علینہ گھبرا رہی تھی جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔

”حمنہ! تم نے دیکھا وہ مجھے کتنی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ حمنہ! پلیز واپس چلو۔“ حمید احمد کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے حمنہ کو مخاطب کیا۔ لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

”چلتے ہیں پہلے کھانا تو کھالیں‘ ہم ایسے واپس نہیں جاسکتے۔“ حمنہ نے تسلی دی۔

”ہاں پر میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ علینہ بولی۔

”یہ تمہارا وہم ہے‘ ہم بس تھوڑی دیر میں واپس جارہے ہیں۔“ حمنہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

کھانے کی میز پر بھی وہ بے چین سی تھی۔

”کیا بات ہے علینہ!“ حمنہ نے اس کی پریشانی محسوس کرکے سرگوشی میں پوچھا۔

”وہ ابھی تک مجھے گھور رہا ہے جیسے نظروں سے چبا رہا ہو۔“ علینہ کی گھبرائی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند تھی۔

”آہستہ بولو میں سب دیکھ رہی ہوں۔ کھانا کھا کر فوراً واپس چلتے ہیں۔“ حمنہ نے سرزنش کی۔ کھانا لگ چکا تھا۔

”یہ لیں‘ یہ میرا باورچی خاص طور پر تیار کرتا ہے‘ یہ ڈش بنانے میں اسے بہت مہارت ہے۔“ حمید احمد نے گوشت کا کوئی سالن ان کی طرف بڑھایا۔ دونوں نے الگ الگ پلیٹ میں اپنے لیے تھوڑا تھوڑا کھانا نکالا۔ پہلا نوالہ لیتے ہی اس کے کانوں میں علینہ کی آواز پڑی۔

”حمنہ! کھانے میں کوئی گڑبڑ ہے‘ ذائقہ عجیب سا ہے۔“ علینہ نے سرگوشی کی تھی۔

”کچھ نہیں علینہ! خاموشی سے کھاؤ۔“ حمنہ بولی۔ آواز میں غصہ تھا۔ چند نوالے کھانے کے بعد انہیں خود کو سنبھالنا مشکل ہوگیا اور وہ دونوں میز پر گرتی چلی گئیں۔ کھانے میں بے ہوشی کی کوئی زود اثر دوا ملائی گئی تھی۔ علینہ کی آنکھ کھلی تو اس کے وجود میں درد کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے یاد آیا کہ وہ اور حمنہ تو سیاسی کارکن حمید احمد کے انٹرویو کے لیے آئی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ چادر جسم سے ڈھلک گئی۔ خود کو دیکھ کر نہ صرف اس کی چیخ نکل گئی بلکہ جسم میں درد کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ اس کا لباس اس کے جسم پر نہیں تھا صرف وہی چادر ستر پوشی کا کام کررہی تھی پاس ہی حمنہ اپنے مکمل لباس میں بے خبر سو رہی تھی۔ اس پر قیامت گزر گئی تھی بھرے دن میں اس کی جوانی کو لوٹ لیا گیا تھا اور صرف لوٹا ہی نہیں گیا تھا نوچا کھسوٹا بھی گیا تھا۔ جسم پر جابجا کاٹنے کے نشانات تھے جیسے کچھ دیر پہلے اسے کتے نوچتے رہے ہوں۔ اس نے روتے ہوئے اپنے خوب صورت بدن کو دیکھا جو اس وقت شاہکار سے زیادہ کھنڈر نظر آرہا تھا۔ وہ جلدی سے لباس پہننے لگی‘ حمنہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بیدار ہورہی تھی اس سے پہلے علینہ اپنی زخمی جوانی کو چھپالینا چاہتی تھی۔

”ہم کہاں ہیں؟“ حمنہ کے منہ سے آواز نکلی۔ اسے گزرے تمام مناظر یاد آگئے اور تبھی علینہ کے آنسوؤں نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

”کیا ہوا علینہ! تم کیوں رو رہی......“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ علینہ کی بُری حالت بتا رہی تھی کہ اس پر قیامت گزر گئی تھی۔

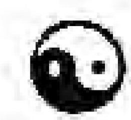
”اس نے مجھے لوٹ لیا حمنہ!“ وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

”حوصلہ کرو علینہ! ہم اس ظالم کے خلاف بھرپور قانونی کارروائی کریں گے۔“ حمنہ نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ علینہ تڑپ کر اس سے علیحدہ ہوگئی۔

”نہیں! مجھے کوئی قانونی کارروائی نہیں کرنی۔ یہاں سے چلو حمنہ!“ علینہ کا رنگ زرد پڑ گیا‘ وہ خوف زدہ نظر آرہی تھی۔

”کیوں علینہ! تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے‘ ہم خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ اس ظلم کے خلاف احتجاج کریں گے۔“ حمنہ نے اسے حوصلہ دیا۔

”خدا کے لیے حمنہ! اس کمرے کی روداد کو یہیں دفن کردو۔ ہم عزت آبرو والے لوگ ہیں اور اس کمینے نے پتا نہیں میری رسوائی کے کیا کیا انتظامات کیے ہوں گے۔ وہ مجھے بازاری ثابت کردے گا۔ میری غفلت میں مجھے کس نے لوٹا‘ مجھے نہیں پتا مگر مجھے پتا چل گیا تو میں شرم سے مرجاؤں گی۔“ علینہ نے ہاتھ باندھ کر کہا اور روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ حمنہ بھی اس کے تعاقب میں باہر آگئی‘ یہ وہ کوٹھی نہیں تھی جس میں وہ حمید احمد سے ملنے گئی تھیں۔ وہ کم از کم پانچ گھنٹے نیند میں رہی تھیں اور پتا نہیں اس دوران انہیں کہاں کہاں پہنچایا گیا تھا۔ حمنہ خوف سے جھرجھری لے کر رہ گئی۔ وہ علینہ کے ساتھ چلتی ہوئی سوچ رہی تھی کہ ہمارے معاشرے میں ظلم کے خلاف آواز اٹھے بھی کیسے۔ سارے مظلوم تو آبرو والے ہیں۔



قسط نمبر 10

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

جب ہم کراچی پہنچے تو دن نکل آیا تھا' میں رات بھر کا تھکا ہوا تھا آرام کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن مجھے فوری طور پر نواب صاحب سے ملنا تھا۔ میں نے معلوم کیا کہ وہ کوٹھی میں موجود ہیں یا نہیں تو بتایا گیا کہ وہ موجود ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں سیدھا ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"آؤ آؤ شمروز..... سناؤ کیا حال ہیں۔ تمہارے کام کا کیا بنا۔ ہوا یا نہیں۔" نواب نے مسکراتے ہوئے بڑی خوش دلی سے مجھ سے کہا اور میرا دل چاہا کہ ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر ماروں اور کہوں۔ "تو سب جانتا ہے بڈھے کہ میرا کام ہوا یا نہیں تو چاہتا ہی نہیں تھا کہ شیر افضل میرا مجرم میرے ہاتھوں اپنے انجام بد تک پہنچے اور تو نے اس کا پورا انتظام بھی کردیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو راکھی کا جس نے مجھے اس بات کی خبر دے دی اور میں نے مزید بے وقوف بننے کے بجائے اپنا آدھا کام کرلیا جس کی خبر میں نے کسی کو بھی نہیں ہونے دی حد یہ کہ راکھی بھی اس بات سے بے خبر تھی کہ میں نے شیر افضل کی بیٹی کی عزت خاک میں ملادی ہے۔

نواب کے سوال پر میں نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھا اور کہا۔ "کہاں نواب صاحب! شیر افضل اپنی حویلی میں آیا ہی نہیں۔ میرا وہاں جانا بے کار ہی رہا۔ میں خوامخواہ میں پیر بن کر اس کی بیٹی کا جھوٹ موٹ کا علاج کرتا رہا۔ شاید میں مزید انتظار کرلیتا شیر افضل کے آنے کا لیکن آپ کا بلاوا آ گیا تو میں واپس آ گیا خیر تو ہے کوئی ایمرجنسی ہے کیا؟"

"یار یہ جو ایک خوب صورت سی مسکراہٹ ، وقت تمہارے لبوں پر کھیلتی رہتی ہے' میں تو اس پر فدا ہوں اور تمہاری یہ جو آنکھیں ہیں نا اور اس میں چھپی عقل و فراست یہ مجھے بہت پسند ہے۔ حالات چاہے جو بھی ہوں تم مسکراتے رہتے ہو' اب دیکھ لو حالانکہ اپنا کام نہ ہونے پر تمہیں غصہ اور جھنجلاہٹ کا شکار ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس وقت بھی تم مسکرا رہے

ہو۔" نواب کے لہجے میں نہ جانے کیوں مجھے چاپلوسی کی بو محسوس ہوئی۔

"میرا ماننا تو یہ ہے نواب صاحب کہ غصہ اور جھنجلاہٹ انسان کی عقل کو ختم کردیتا ہے اور اس سے انسان کا بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے پھر بیمار آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس لیے چاہے کامیابی ہو یا ناکامی انسان کو مسکراتے رہنا چاہیے۔ ہر کام کا وقت مقرر ہے اور وہ کام اپنے مقررہ وقت پر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے سوچا کہ ابھی شیر افضل کا وقت بھی باقی ہے وقت آئے گا تو وہ کام بھی ہوجائے گا۔" میں نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"گڈ۔ مجھے تمہاری یہی باتیں تو پسند ہیں۔" نواب نے خوش ہوکر کہا پھر بولا۔ "اچھا تم رات بھر کے جاگے ہوئے لگ رہے ہو۔ لگ کیا رہے ہو' یقیناً جاگے ہوئے ہو' تم جاکر آرام کرو فریش ہوجاؤ پھر میرے پاس آنا تم سے ایک بہت اہم کام لینا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ ایک بہت خفیہ کام ہے اس کا میرے اور تمہارے علاوہ کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں نواب صاحب..... بس یہ سمجھیں کہ آپ نے مجھ سے کوئی کام لیا ہی نہیں۔ میں تو ہر کام کرکے اس طرح بھول جاتا ہوں جیسے میں نے کیا ہی نہیں۔ پھر کسی اور سے اس کا ذکر کرنے کا کیا سوال۔" میں نے کام سنے بنا ہی نواب کو مطمئن کردیا۔

"ویری گڈ! اب تم آرام کرو بعد میں بات ہوگی اور ہاں راکھی تو تمہارے ساتھ ٹھیک رہی؟" اس نے کہا۔

"ہاں راکھی میرے ساتھ میری خاص مریدنی بن کر گئی تھی اس نے اپنا پارٹ بہت خوبی سے پلے کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سے تمہاری بات چیت تو رہتی ہوگی' خوب گپ شپ ہوگی تمہاری اور اس کی۔" نواب نے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نواب صاحب وہ عجیب بور عورت ہے میری اس سے قطعی نہیں بنی۔ ہاں البتہ اگر کوئی جوان لڑکی ہوتی تو پھر۔" میں نے برا سا منہ بنا کر راکھی کے بارے میں اظہار خیال کیا اور آخری فقرہ ایک ہوس زدہ شخص کے لہجے میں ادا کیا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بولا۔ "یار اگر دل پشوری کے لیے ساتھی چاہیے تو کہو۔ کیا تمہارے لیے ہم اتنا بھی نہیں کرسکتے۔"

"بہتر نواب صاحب۔" میں نے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ زیادہ سمجھتے ہیں کہ جوانی کی راتیں تنہا بڑی مشکل سے گزرتی ہیں۔"

"خوب..... خوب بڑے رنگین مزاج ہوگئے ہو۔" اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ اس گفتگو سے جو اس وقت میرے اور اس کے درمیان ہوئی میں نے اس کے اندر کے کمینے اور بدکردار شخص کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا اور لمبی تان کر سوگیا۔ نہ جانے کتنے گھنٹے سوتا رہا آنکھ کھلی تو رات ہوچکی تھی کمرے میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا میں دیر تک اسی طرح لیٹا رہا آہستہ آہستہ ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ تب میں نے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ جسم پر کسلمندی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے نیم گرم پانی سے غسل کیا تو طبیعت فریش ہوئی۔ نہا کر باہر آیا اور سیدھا کچن میں گیا۔ اور کھانے کے لیے مانگا۔ کچن سے باہر آیا تو ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن مجھے راکھی کہیں دکھائی نہیں دی۔ یہ اتنی بڑی کوٹھی تھی کہ میرے علم میں نہیں تھا کہ راکھی یہاں کس حصے میں رہتی ہے۔ اس سے ملاقات سے پہلے بھی میں نے اسے اس کوٹھی میں نہیں دیکھا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ جو سوال مجھ سے نواب نے کیا تھا راکھی کے بارے میں ہوسکتا ہے وہ راکھی سے

میرے بارے میں پوچھ کر اس بیان کی تصدیق کرے کیونکہ نواب یہ سوچ رہا ہوگا کہ راکھی نے مجھے تو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتادیا۔ اس لیے ملازم سے یہ کہہ کر کہ کھانا میرے کمرے میں پہنچادے میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور راکھی کے موبائل فون کا نمبر ملایا اور پہلی ہی بیل پر راکھی نے فون ریسیو کرلیا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ''ایک منٹ ہولڈ کرو۔'' پھر اس کے قدموں کی آہٹ آتی رہی اور دروازہ بند ہونے کی پھر اس کی آواز سنائی دی وہ سرگوشی میں بات کررہی تھی۔

''ہاں شمروز بولو میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں ہی کال کرنے والی تھی۔'' اس نے کہا۔

''کیوں سب خیریت ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی اس نواب کے بچے نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا اور تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ایک بور شخص ہے اس نے میری جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اگر وہ تم سے پوچھے تو......!''

''وہ مجھ سے پوچھ چکا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تم نے بالکل ٹھیک جواب دیا میں نے بھی کچھ اسی قسم کا جواب اسے دیا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے فی الحال میں فون رکھتی ہوں پھر کبھی موقع دیکھ کر ملاقات کروں گی ہوسکتا ہے آج رات ہی تمہارے کمرے میں آؤں۔'' یہ کہہ کر اس نے چٹ سے ریسیور پر ایک بوسہ دیا اور فون بند کردیا میں نے بھی حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے سیل فون سے اس کا نمبر ڈیلیٹ کردیا۔

ملازم کھانا لے آیا تو میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہوکر میں چائے اور سگریٹ سے دل بہلا رہا تھا ساتھ ہی ٹی وی پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا انڈین فلم آرہی تھی اور کوئی رقاصہ ہوش ربا رقص کر رہی تھی تب ہی ایک ملازمہ اندر آئی اور اس نے مجھے نواب کا پیغام دیا کہ نواب صاحب نے مجھے اپنے خاص کمرے میں بلایا ہے۔ میں نے ٹی وی آف کیا سگریٹ بجھائی اور نواب کے اس خاص خلوت کدے کی جانب روانہ ہوگیا۔ جہاں ایک بار اور میری اس سے ملاقات ہوچکی تھی۔

میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو نواب کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ ''چلے آؤ شمروز۔'' تو میں اندر داخل ہوگیا۔ حیرت انگیز طور پر اس وقت نواب اس کمرے میں تنہا تھا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

میں نے اندر آکر کمرے کا دروازہ بند کردیا اور خاموشی سے کھڑا ہوگیا۔ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا لیکن وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے گہری سوچ میں ڈوبا ٹہلے جارہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ گمبھیر ہے نواب کی پیشانی کی شکنیں اس کی پریشانی کو ظاہر کررہی تھیں۔

دو چار چکر مزید کاٹنے کے بعد وہ رکا اور رک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ مجھے لگا جیسے وہ یہ سوچ رہا ہے کہ وہ مجھ سے بات کرے یا نہ کرے یا مجھ سے اپنی بات شیئر کرنے کے فائدے اور نقصانات پر غور کررہا ہے بالآخر مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں بول اٹھا۔

''آپ بلا جھجک مجھ سے ہر بات شیئر کرسکتے ہیں نواب صاحب! آپ ہر معاملے میں مجھے اپنا وفادار پائیں گے۔'' میں نے کہا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''آؤ بیٹھو۔''

وہ کمرے میں موجود بڑے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے نزدیک بٹھالیا اور بولا۔

''میں اپنی ذاتی زندگی کی باتیں کسی سے شیئر نہیں کرتا لیکن آج ایک مشکل آن پڑی ہے میں بھی

مجبور ہوکر تمہیں یہ بات بتارہا ہوں۔ تمہیں ایک عورت کا کام کرنا ہے۔'' اس نے بغور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون ہے وہ؟'' میں نے بے پروا لہجے میں پوچھا۔

''اس کا نام غزالہ ہے اور وہ میری بیوی ہے۔'' نواب نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ کی بیوی......!'' میں نے حیرت سے کہا پھر سنبھل کر پوچھا۔ ''یہ کہاں ہوتی ہیں؟''

''یہ کراچی کی ایک مضافاتی بستی ملیر کھوکھراپار میں رہتی ہے کافی عرصہ ہوا یہ غائب ہوگئی تھی میں سمجھا کہ یہ مر کھپ گئی لیکن مجھے اب اس کے بارے میں پتا چلا ہے کہ یہ زندہ ہے اور کچھ میرے مخالف لوگ اسے میرے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسے میڈیا کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ اگر یہ لوگوں کے سامنے آگئی اور اس نے اپنی زبان کھول دی تو یہ میرے لیے بہت برا ہوگا۔ میری برسوں کی کمائی ہوئی نیک نامی اور عزت خاک میں مل جائے گی میرے لاکھوں مرید ہیں جو مجھ سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں مجھ سے بدظن ہوجائیں گے۔'' بات کرتے کرتے نواب کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں اور اسے پسینا آنے لگا۔

''ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اگر آپ برا نہ مانیں نواب صاحب!'' میں نے کہا تو وہ سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''آپ کی جانب سے ایسی کیا بات ہوئی جو آپ کو اپنی بیوی سے اس طرح کا خطرہ ہے۔''

میرا سوال سن کر وہ پریشان ہوگیا۔ اپنی پیشانی اپنے ہاتھوں سے رگڑنے لگا۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھائیں اور میری جانب گھورتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا واقعی میں تم پر اعتماد کرلوں۔''

تو میں نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ آہستہ سے ہاں میں سر کو جنبش دی تو وہ پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور ایک بار پھر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ہوئے وہ مجھے اپنی کہانی سنانے لگا۔ میں بناٹو کے اس کی کہانی سنتا رہا اور دل میں سوچا کہ تمہارے جیسے نام نہاد عزت کے دعوے داروں کی یہ کہانیاں تو عام ہیں۔ تم لوگ جن کا اندر اور باہر مختلف روپ لیے ہوتا ہے دوسروں کو حقیر چیونٹیوں کی مانند سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر یہ حقیر چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے اور اسے کاٹ لے تو اسے موت کی نیند سلاسکتی ہے۔

''آپ بے فکر ہوجائیں نواب صاحب آپ کا کام ہوجائے گا۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''ایک بات یاد رکھنا شمروز اگر یہاں ہونے والی ایک بھی بات کسی اور کان نے بھی سنی تو میں بھول جاؤں گا کہ تم میری گڈ بک میں تھے اگر میں تم سے کسی کو مرواسکتا ہوں تو تمہیں بھی کسی دوسرے سے مرواسکتا ہوں۔'' مجھے اپنے پیچھے نواب کی مکروہ آواز سنائی دی۔

''آپ نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا نواب صاحب میرے کانوں نے کچھ بھی نہیں سنا۔'' میں نے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''گڈ۔'' اس نے اپنی عقابی نگاہوں کی برچھیاں میرے اندر اتارتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''تم اپنی مہم پر کب روانہ ہورہے ہو۔''

''جب آپ کا حکم ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جتنی جلدی ہو مجھے یہ خوش خبری سنادینا کل یا

برسوں تک۔ بس اس سے آگے نہیں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوکے اینڈ گڈ نائٹ۔" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں بستر پر لیٹ کر نواب کی سنائی ہوئی کہانی پر غور کرنے لگا اور میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا میں سوچ رہا تھا کہ آج رات ہی اس مہم پر نکل جاتا ہوں۔

رات کے ایک بجے تک میں ٹی وی پر مختلف چینل گھما گھما کر دیکھتا رہا۔ جہاں میرا مطلوبہ سین نظر آتا تو تھوڑی دیر کے لیے رک جاتا پھر آگے بڑھ جاتا۔

پھر میں نے اپنی مکمل تیاری کی اور بلیر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں طویل راہ داری طے کر کے کار پورچ کی جانب جا رہا تھا تب میں نے نواب کو ایک اجنبی شخص کے ہمراہ تیزی سے باہر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا میں تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا اور خود کو ایک پلر کی آڑ میں چھپا لیا۔

نواب اور وہ شخص جس کے کندھے پر کلاشنکوف لٹکی ہوئی تھی بہت تیزی سے جا رہے تھے میں انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو میں پلر کی آڑ سے نکل آیا اور تیزی سے ان کے پیچھے لپکا پھر مجھے گاڑی اسٹارٹ ہونے اور بھاری خودکار گیٹ کھلنے کی آواز آئی میں سمجھ گیا کہ اس وقت نواب کہیں باہر گیا ہے لیکن کہاں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا اور میں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا پھر مجھے راکھی کا خیال آیا میں تیزی سے چلتا ہوا اپنے روم میں واپس آ گیا۔ ساری کوٹھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے باہر جاتے اور آتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اپنے روم میں آ کر میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور راکھی کا نمبر ملایا لیکن گھنٹیاں بج بج کر رابطہ منقطع ہو گیا لیکن راکھی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ میں نے دوبارہ فون ملایا دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں جھنجلا کر رہ گیا۔ پانچ منٹ کے وقفے کے بعد میں فون ملانے ہی والا تھا کہ راکھی کی کال میرے فون پر آ گئی میں نے فون فوراً ہی ریسیو کر لیا اور چھوٹتے ہی کہا۔

"فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں؟"

"کیا بات ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"تم اس وقت میرے پاس آ سکتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کس لیے؟" اس نے توقف کے بعد پوچھا۔

"آ جاؤ گی تو بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"مشکل ہے لیکن کوشش کروں گی۔ تمہیں انتظار کرنا ہو گا۔ لیکن کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیوں بلا رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"تمہاری یاد آ رہی ہے جانم! یہ رات تنہا کس طرح گزاروں۔" میں نے ندیدے عاشقوں کی طرح کہا۔

"سچ کہہ رہے ہو۔" اس نے چہک کر کہا۔

"تمہاری قسم جان شمروز۔" میں نے بہکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پھر تو میں جان ہتھیلی پر رکھ کر بھی آ سکتی ہوں دراصل ایک گڑبڑ ہو گئی ہے یہاں سب لوگ جاگ رہے ہیں۔ میں نے اپنا موبائل سائلنٹ پر کیا ہوا تھا۔ اب واش روم میں آ کر تم سے بات کر رہی ہوں۔" راکھی نے کہا۔

"کیسی گڑبڑ۔" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آؤں گی تو بتاؤں گی۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوچنے لگا کہ ایسی کون سی گڑبڑ ہو گئی ہے کہ

نواب کو ایمرجنسی میں اس طرح تنہا کہیں جانا پڑا ہے۔ اب مجھے بے صبری سے راکھی کا انتظار تھا۔ اسے یقیناً معلوم ہو گا۔ میں نے تو اسے بے وقوف بنانے کے لیے اتنی لفاظی کی تھی ورنہ اس کے ڈھلکتے ہوئے شباب میں میرے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔

تقریباً پینتالیس منٹ کے طویل صبر آزما انتظار کے بعد راکھی دبے پاؤں میرے کمرے میں داخل ہوئی اور آتے ہی کسی بھوتنی کی طرح مجھ سے چمٹ گئی۔ اس نے جب تک اپنی پیاس اور بھوک نہیں مٹالی کوئی اور بات نہیں کی لازماً مجھے بھی جھوٹی وارفتگی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

مجھ سے الگ ہوئی تو وہ بہت خوش تھی اس کا انگ انگ چہک رہا تھا۔ وہ مسرور انداز میں آنکھیں بند کیے بستر پر چت لیٹی تھی میں نے چادر اٹھا کر اس کے اوپر ڈالی اور سگریٹ سلگالی۔

"تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے شمروز کہ تم کیا چیز ہو۔" اس نے ایک پرکیف سانس اپنے اندر کھینچتے ہوئے کہا۔

"اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ تم نے تو مجھے زندگی کے ان لطیف رازوں سے آشنا کیا ہے جن سے اب تک میں ناواقف تھا۔" میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر سارا دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"یو آر مائی سوئٹ ہارٹ۔" اس نے اچک کر اپنے دونوں ہاتھ میری گردن میں ڈالے اور میرا ایک طویل بوسہ لے ڈالا۔

مجھے اب راکھی کی ان حرکتوں سے بے زاری سی ہونے لگی تھی لیکن اپنی یہ بے زاری میں اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے جواباً میں نے بھی بھرپور جواب دیا۔ پھر کہنی کے بل تکیے پر ٹیک لگا کر اس سے پوچھا۔

"ہاں اب بتاؤ کہ کیا گڑبڑ ہو گئی ہے۔ نواب اس وقت کہاں گیا ہے۔"

"اس کی حویلی سے فون آیا ہے کہ اس کی جوان بیٹی کا قتل ہو گیا ہے یا پھر اس نے خودکشی کر لی ہے۔ میرے خیال میں قتل تو کون حویلی میں گھس کر کر سکتا ہے۔ اس نے خودکشی ہی کی ہو گی۔" راکھی نے کہا۔

"تو کیا اس نے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کی تھی؟" میں چونک کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔

"یہ لوگ بڑے کمینے ہوتے ہیں خود تو نہ جانے کتنی شادیاں کرتے ہیں۔ ان حویلیوں میں ان کے حرم خانے بنے ہوتے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کی دو بیٹیاں ہیں لیکن ایسے لوگ اپنی بیٹیوں کی شادیاں نہیں کرتے۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ یہ لوگ تمہاری مقدس کتاب قرآن کے ساتھ اپنی بیٹیوں کی شادیاں کر دیتے ہیں۔ پھر وہ زندگی بھر ان حویلیوں میں سڑتی رہتی ہیں یا پھر خودکشی کر لیتی ہیں۔" راکھی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

راکھی کی بات سے مجھے شہزادی کا خیال آ گیا وہ بھی تو اپنے باپ کے ایسے ہی ظلم کا شکار ہوئی تھی اور کتنی آسانی کے ساتھ اس نے ایک غیر مرد کے ساتھ اپنی ناآسودہ خواہشات کو پورا کر لیا۔ انجام چاہے جو بھی ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھانڈا پھوٹ جانے پر وہ مار دی جائے یا پھر وہ اپنی جان خود ہی لے لے بہر حال مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ نواب نے مجھے اپنے خاص کمرے میں کس لیے بلایا تھا میں نے کہا۔

"اگر وہ بات میں نے تمہیں بتا دی تو نواب مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس نے صاف صاف مجھے دھمکی دی ہے۔"

"نواب کی بہت سی ایسی باتیں مجھے معلوم ہیں کہ جن کے بارے میں اس نے مجھے بھی دھمکی دی ہے کہ خاص طور پر تمہیں وہ باتیں نہیں بتانی۔" راکھی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور بیٹھتے ہی چادر اس کے اوپر سے گر گئی اور میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر ہوش ربا منظر تھا لیکن اس وقت مجھے اس منظر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی میرا ذہن راکھی کی بات میں اٹک کر رہ گیا تھا کہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جو نواب نے بطور خاص مجھے بتانے سے منع کیا ہے اور بتا دینے کی صورت میں اسے موت کی دھمکی دی ہے۔

راکھی نے چادر کو نیچے گرا رہنے دیا وہ میری جانب سے کسی پیش قدمی کی منتظر تھی لیکن میرا ذہن اور نگاہیں کہیں اور تھیں۔

"ایسی کون سی بات ہے راکھی جو مجھے بتانے سے منع کیا ہے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے تو مجھے بھی اپنی جان پیاری ہے۔" راکھی نے اک ادا سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی جان پیاری نہیں ہے بلکہ یہ تو تم پر نثار ہونے کے لیے ہے جانم تم نے ایسی بات کر دی ہے تو سنو۔" پھر میں نے راکھی کے سامنے اصل بات گول کر کے کوئی اور ہی کہانی سنا دی کہ راشد نامی ایک نوجوان ہے جو جرنلسٹ ہے اس کے ہاتھ نواب کا کوئی راز لگ گیا ہے اور نواب یہ چاہتا ہے کہ میں اسے مار دوں۔ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں اس لیے کہ بات جب تک اپنے تک رہتی ہے راز رہتی ہے جب کسی کے آگے بیان کر دی جائے تو راز نہیں رہتی۔ لیکن میں تمہیں خود سے جدا نہیں سمجھتا۔ سرتاپا تمہارے عشق میں ڈوب چکا ہوں۔ اس لیے میں نے تمہیں بتا دی۔ اب اگر تمہیں میری جان پیاری ہے تو تم اس بات کو اپنے تک رکھو گی۔" میں نے معصوم سی صورت بنا کے کہا۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو شمروز کہ تم مجھے دل سے چاہنے لگے ہو۔" اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔

"اب تم ہی بتاؤ کہ میں تمہیں اپنی دفا کا یقین کس طرح سے دلاؤں۔" میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ چند لمحوں تک میری شکل تکتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بے تحاشا میرے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

"کیا ہوا جانو میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ کیا تمہیں میرا اظہار عشق کرنا برا لگا ہے اگر ایسی بات ہے......"

"نہیں۔" اس نے بے تابی سے مجھ سے الگ ہو کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا شمروز کہ کوئی مجھے چاہ بھی سکتا ہے مجھے اپنی محبت کے قابل بھی سمجھ سکتا ہے میں بھی نوعمری میں ایسے سپنے دیکھا کرتی تھی کسی کو چاہنے کے کسی کے خود کو چاہے جانے کے۔ لیکن اس کمینے نواب کی نظریں کیا مجھ پر پڑیں میری زندگی ہی تباہ ہو گئی گھر بار چھوٹا اپنا دیس اپنے لوگ چھوٹے اور میں اس کی رکھیل بن کر رہ گئی اور اس کوٹھی میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دی گئی جب تک اس کا دل میری جوانی سے نہیں بھرا یہ مجھ سے دل بھر کر کھیلتا رہا اس نے میری اپنی نگاہوں میں مجھے بے وقعت کر کے رکھ دیا۔ اس نے میرے ساتھ وہ شرمناک کھیل کھیلے ہیں مجھے نہ جانے کون کون سے انجکشن لگواتا تھا کہ میں ایک ہوس زدہ بلی بن کر رہ گئی اور جب اس نے مجھے چھوڑا تو میں اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے تڑپتی رہی پھر مجھے تم مل گئے۔

لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگو گے میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتی ہوں میں مر جاؤں گی لیکن تمہاری وفادار رہوں گی۔"

راکھی کی جذباتی تقریر ختم ہوئی تو میں مسکرانے لگا ہولے ہولے اسے اپنی بانہوں میں لے کر اس کا ماتھا چوم لیا اور اٹھ کر اس کا لباس اس کے حوالے کر دیا۔ اب میں چاہ رہا تھا کہ اس سے ہر بات پوچھنی نہ پڑے میری محبت کے جھانسے میں آ کر ہر بات وہ مجھے خود ہی بتا دے۔

لباس پہن کر راکھی میرے پاس صوفے پر آن بیٹھی اور میرے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

"شمروز میں تمہیں ایک بہت اہم بات بتانے والی ہوں۔ مگر ڈرتی ہوں کہ کہیں اس بات کو سن کر تم آپے سے باہر نہ ہو جاؤ مجھ سے پہلے وعدہ کرو کہ جو بات میں تمہیں بتانے والی ہوں اسے سن کر تم اپنے آپ کو قابو میں رکھو گے اور کوئی جذباتی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔"

راکھی کی بات سن کر نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا میں سوچ رہا تھا کہ ایسی کون سی بات ہے جس کو سن کر میں آپے سے باہر ہو جاؤں گا۔

"تم بتاؤ تو سہی میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھوں گا۔" میں نے اپنے دھڑ دھڑ کرتے ہوئے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

اور اس نے جو بات مجھے بتائی اسے سن کر میں نے ایک جھٹکے سے راکھی کو خود سے جدا کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مارے طیش اور غصے کے میرے جسم کا سارا خون میری کنپٹیوں میں آ کر جمع ہو گیا۔ میرا جبڑا اور مٹھیاں بھینچ گئیں اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں۔

"پلیز ریلیکس شمروز میں نے تم سے وعدہ لیا ہے تم اپنے آپ کو قابو میں رکھو گے۔" راکھی نے میرا ہاتھ تھام کر سہلاتے ہوئے کہا۔

وہ دیر تک مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ میں نے اٹھ کر اپنے اندر اٹھنے والے غیظ و غضب کے طوفان کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کا پورا جگ اپنے اندر انڈیل لیا۔

ساری رات گزر گئی فجر کی اذانوں کی آوازیں آنے لگیں تو راکھی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"شمروز میں چلتی ہوں صبح ہونے والی ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھو گے۔"

میں نے آہستہ سے سر ہلایا اور راکھی کے جانے کے بعد کمرے کا دروازہ لاک کر لیا۔ میں کسی کٹی ہوئی شاخ کی مانند بستر پر گر پڑا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا مجھے رہ رہ کر اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔ اپنی بے وقوفی پر اپنی حماقت پر میں اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا گالیاں دے رہا تھا کوس رہا تھا۔

میں نے باآواز بلند اپنے آپ کو مخاطب کیا اور کہا۔

"تو بہت بڑا الو کا پٹھا ہے ڈاکٹر شاہ زمان۔" اور اپنے آپ کو گالی دے کر مجھے ایک سکون کا احساس ہوا۔

پھر میں پرسکون ہو کر بہت کچھ سوچنے لگا۔ اور میں نے سوچ لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔



طلال انکل نے اپنے سارے ذرائع استعمال کر لیے لیکن اس عورت کے بارے میں مزید کوئی خبر نہیں ملی۔ میرا دل بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے شمسو بابا کے حوالے کرنے والی عورت وہی تھی اس نے پولیس کو اپنے بارے میں یہی بتایا تھا کہ میں کسی کی ملازمہ ہوں اور بیماری کے باعث بے ہوش ہو گئی تھی۔ ایسا ہی ہوا ہوگا میری ماں نے کسی وجہ سے مجھے اپنی ملازمہ کے حوالے کر کے کہا ہوگا کہ اس کو کسی شریف آدمی کے حوالے کر دے یا کسی اور کے پاس بھیجا ہوگا۔ اگر میری ماں ہوتی تو وہ کم از کم یہی دیکھتی کہ وہ اپنی بیٹی کو کن ہاتھوں میں دے رہی ہے وہ تو میری امی

کے دل میں اللہ نے نیکی ڈال دی ورنہ طوائف کے کوٹھے پر پہنچنے والی لڑکی طوائف ہی بنتی ہے اور میں زندگی بھر خود کو ایک طوائف زادی ہی تصور کرتی رہتی۔

میں نے اپنے دل سے اس خیال ہی کو ختم کردیا کہ میں کبھی اپنے والدین کو تلاش کرسکوں گی۔ یہی بات میں نے شمسو بابا اور اماں حمیدہ کو بھی بتائی اور یہی بات حشام اور اس کے والدین کو بھی بتادی۔

آنٹی نے مجھے پیار سے اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا کہ انہوں نے تو پہلے دن سے ہی مجھے اپنی بیٹی مان لیا ہے اور میں نے مطمئن ہوکر ان کی بانہوں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو میں نے اپنی امی کی جگہ دے دی ہے۔“

”سوچ لو۔ اپنے الفاظ کی لاج نبھانا ہوگی۔“ آنٹی نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”پکا وعدہ میں آپ کی پکی پکی بیٹی ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”خوش رہو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے میری پیشانی چوم لی اور حشام شرارت سے یہ منظر دیکھتے ہوئے مسکراتا رہا۔

نیوز چینل پر جاب کرتے ہوئے مجھے دو ماہ بیت گئے مجھے اور حشام کو ایک ٹاک شو کا پروگرام دیا گیا۔ جس میں ہم ملکی اور غیر ملکی حالات اور سیاسی حالات پر گفتگو کرنے کے لیے مختلف جماعتوں کے سیاسی لیڈروں اور سماجی رہنماؤں کو دعوت دیا کرتے تھے میرے علم میں پہلے سے ہی ہوتا تھا کہ میرے آئندہ پروگراموں میں کون کون سی شخصیات آنے والی ہیں۔ تو میں ان سے کرنے کے لیے سوالات پہلے سے ہی تیار کرلیا کرتی تھی۔ میرے سوالات بہت چبھتے ہوئے ہوتے تھے بعض اوقات تو بہت سے سیاسی لیڈر مجھے پہلے ہی خبردار کردیا کرتے تھے کہ محترمہ ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھیے گا اور میرا جواب انہیں یہ ہوتا تھا کہ ہاتھ ہلکا اور بھاری رکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ آپ لوگ وہ لوگ ہیں جنہیں ہمارے عوام نے اپنے ووٹوں کے ذریعے اسمبلیوں میں پہنچایا ہے تاکہ الیکشن سے پہلے اپنے جلسوں میں آپ لوگوں نے جو بڑی بڑی تقریریں کی ہیں اور ان تقریروں میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اور ان کے بے تحاشا مسائل کو حل کرنے کے جو دعوے کیے ہیں وہ کہاں ہیں۔ آپ کے ہاتھ کس چیز نے باندھے ہیں آپ کو عوام کے سامنے ان کی جواب دہی تو کرنا پڑے گی۔

میرے شو کا نام ”عدالت“ تھا میرا اور حشام کا یہ شو دن بدن مقبولیت کے گراف پر اونچا خوب اونچا جارہا تھا۔

ایک دن مجھے پتا چلا کہ ایک بہت محترم سماجی رہنما ہیں نواب سطوت الاسلام جو گدی نشین بھی ہیں اور ان کے بہت سے مرید بھی ہیں جمعہ کی شب وہ ہمارے پروگرام میں تشریف لائیں گے۔ میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی اس لیے انکل طلال سے گفتگو کے لیے اس کے گھر پہنچ گئی۔

انکل نے مجھے ان کے بارے میں کافی کچھ بتایا یہ بھی کہ شاداب پور میں ان کی آبائی حویلی ہے اور ان کے بارے میں یہ بھی سنا ہے کہ ان کی کئی بیویاں ہیں اولادوں میں صرف دو بیٹیاں ہیں۔ شاداب پور کی ساری زمینیں ان کی ملکیت ہیں۔ ان کی نگرانی میں بہت سے خیراتی ادارے چل رہے ہیں۔ خواتین کا ایک انڈسٹریل ہوم ہے جہاں بے سہارا خواتین کام بھی کرتی ہیں اور وہیں رہتی بھی ہیں ایک اسکول بھی ہے جہاں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ سیاست میں بھی تھوڑی بہت دلچسپی دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ ان کے لیے تو بہت سی سیاسی جماعتیں چاہتی ہیں کہ وہ ان کی جماعت میں شمولیت اختیار کرلیں لیکن وہ ایسا نہیں کرتے۔

ذاتی طور پر میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی بہرحال سوالات تو مجھے ان سے بھی کرنے تھے وہ میں نے تیار کرلیے اور حشام کے ساتھ ان پر ڈسکس بھی کرلی۔

جمعہ کے دن آنٹی نے مجھ سے کہا کہ بیٹا شو ختم کرنے کے بعد حشام کے ساتھ گھر آجانا اور ڈنر ہمارے ساتھ کرنا میں نے تمہاری پسندیدہ کچے گوشت کی بریانی اور کباب بنائے ہیں۔ میں نے وعدہ کرلیا کہ میں ضرور آؤں گی۔

جمعے کے دن میں ٹی وی اسٹیشن جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگی تو شمسو بابا مجھے کہیں دکھائی نہیں دیے۔ میں نے اماں سے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں گزشتہ رات سے بخار آرہا ہے۔

”اماں آپ نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ بابا کی طبیعت خراب ہے انہوں نے دوا بھی نہیں لی ہوگی۔ میرے پاس تو ٹائم بھی نہیں ہے۔ مجھے ٹی وی اسٹیشن پہنچنا ہے۔“

پھر میں بابا کے کمرے میں انہیں دیکھنے گئی تو وہ آنکھیں موندے لیٹے تھے۔ اس لمحے مجھے وہ بہت کمزور دکھائی دیے جب سے میں اس شو میں مصروف ہوئی تھی مجھے ٹائم ہی نہیں ملتا تھا کہ شمسو بابا اور اماں حمیدہ کے ساتھ وقت گزاروں۔ دن رات کی مصروفیت تھی۔

مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگا کہ میں نے ان لوگوں کے ساتھ اتنی بے پروائی کیوں دکھائی۔ میں نے فوری طور پر ڈاکٹر عزیز کو فون کرکے کہا کہ وہ اپنے کلینک سے فارغ ہوجائیں تو گھر آکر بابا کو دیکھ لیں۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ ورنہ میں انہیں خود آپ کے کلینک لے آتی ڈاکٹر عزیز مریض کی بات

چھوڑ کر میرے پروگرام کی تعریف کرنے لگے۔ کیونکہ اب میں کوئی عام لڑکی نہیں رہی تھی۔ ٹی وی پر آتی تھی اور لوگ مجھے میرے پروگرام کی وجہ سے پہنچاننے لگے تھے۔

”سوری ڈاکٹر عزیز آپ سے پھر کبھی بات کروں گی فی الحال اگر آپ گھر آکر بابا کو دیکھ لیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ضرور ضرور۔ آپ بے فکر رہیں مس سرمئی میں حاضر ہوجاؤں گا۔“ ڈاکٹر عزیز نے کہا پھر فون بند کرکے میں نے اماں سے کہا۔

”اماں بابا کا اچھی طرح سے چیک اپ کروالیجیے گا۔ اور ڈاکٹر جو دوائیں تجویز کریں وہ آپ فوراً منگوا لیجیے گا۔ بعد میں میں ڈاکٹر صاحب سے خود بات کرلوں گی۔“

”کیوں پریشان ہورہی ہو بیٹی۔ میرا تو بڑھاپا ہے اللہ کے پاس جانے کا وقت قریب ہے۔ ڈاکٹر آکر کیا کرلے گا۔“ بابا نے آنکھیں کھول کر نحیف سی آواز میں کہا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے خفگی بھرے لہجے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ نے اگر آئندہ ایسی بات کی تو میں آپ سے ناراض ہوجاؤں گی بات بھی نہیں کروں گی۔ پھر آپ چاہے مجھے کتنا ہی منائیں میں نہیں بولوں گی۔“

”نہ میرا بچہ ایسے مت کہو جو سچ ہے میں نے تو وہی کہا ہے۔“ بابا نے اپنا کمزور سا ہاتھ اٹھا کر میرے سر پر رکھنے کی کوشش کی تو میں ان کے آگے جھک گئی اور اپنا سر ان کے قریب کردیا۔

”اچھا بابا میں جلدی آجاؤں گی حالانکہ آج حشام کی امی نے مجھے ڈنر پر بلایا ہے لیکن میں معذرت کرلوں گی پھر کبھی چلی جاؤں گی۔“ میں نے رخصت

کی اجازت کے بعد کہا۔

"ارے نہیں بیٹا تم وہاں ضرور جانا۔ میرا کیا ہے ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم نے خوامخواہ ڈاکٹر کو بھی گھر پر بلا لیا۔" بابا نے کہا۔

"نہیں میں سیدھی گھر واپس آ ؤں گی۔ اچھا اللہ حافظ۔ اماں آپ بابا کا خیال رکھیے گا۔" یہ کہتی ہوئی میں تیزی سے باہر کی جانب بھاگی۔ مجھے خاصی دیر ہو گئی تھی مجھے لگ رہا تھا کہ میں وقت پر نہیں پہنچ پاؤں گی ایک تو ہمارے شہر کا ٹریفک بھی اللہ توبہ ہے۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا راستے میں شدید ٹریفک جام تھا تمام گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور دور دور تک حد نگاہ گاڑیاں ہی گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ آج تو مشکل ہی لگ رہا ہے کہ میں ٹائم پر ٹی وی اسٹیشن پہنچ جاؤں۔ پروگرام شروع ہونے میں تھوڑا ہی وقت باقی تھا اور جن حالات میں میں گھری ہوئی تھی اس سے نکلنے میں مجھے کم از کم ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ چاہیے۔ میں نے گاڑی بند کی اور اطمینان سے بیٹھ گئی ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی سیاسی جماعت کی جانب سے ریلی نکل رہی ہے۔ میں نے یہ سوچ کر فون اٹھایا کہ میں حشام کو فون کر کے اس ساری سچویشن کے بارے میں بتا دیتی ہوں اور کہہ دیتی ہوں کہ آج کا پروگرام وہ تنہا ہی کر لے میں نہیں پہنچ پاؤں گی حالانکہ میں بھی گھر سے اس شو کے لیے نکلتی تھی تو یہ ساری سچویشن میرے ذہن میں ہوتی تھی اور میں وقت کا مارجن رکھ کر گھر سے نکلتی تھی۔ لیکن آج بابا کی وجہ سے گھر پر ہی دیر ہو گئی۔ دوسرے ٹریفک جام میں پھنس گئی۔ میں نے فون ملانے کے لیے بیگ سے نکالا تھا کہ فون بجنے لگا میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا تو حشام کا نام آ رہا تھا۔ میں نے آنسر کا بٹن پش کیا ہی تھا کہ وہ بول اٹھا۔

"کہاں رہ گئی سرمئی؟ سب خیریت تو ہے نا۔"

"کہاں خیریت ہے۔" پھر میں نے ساری سچویشن اسے بتا دی تو وہ بولا۔

"شکر کرو کہ آج کا لائیو شو کینسل کر دیا گیا ہے پرانا پروگرام ہی ریپیٹ کیا جائے گا۔"

"کیوں۔" میرے نہ آنے کی وجہ سے۔" میں نے خوش فہمی میں مبتلا ہو کر کہا۔

"کیا کہنے ہیں محترمہ کی خوش گمانی کے۔" اس نے حسب عادت ایک اونچا قہقہہ لگایا۔

"بکواس مت کرو اور صحیح بات بتاؤ۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"ہمارے آج کے مہمان نواب سطوت الاسلام پروگرام میں نہیں آ رہے اس لیے۔" وہ بولا تو میں مزید چڑ گئی۔

"یار ان جیسے لوگوں کو دوسرے کے وقت کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ وہ ایک اچھے انسان ہیں اور وقت کے پابند بھی۔ دراصل ان کی فیملی میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے شاید ان کی بیٹی کی ڈیتھ ہو گئی ہے اس لیے وہ فوری طور پر اپنی آبائی حویلی شاداب پور چلے گئے ہیں۔" حشام نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوہ سو سیڈ۔" میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ "چلو پھر ٹھیک ہے جیسے ہی ٹریفک کھلتا ہے میں گھر واپس چلی جاؤں گی۔"

"کیوں بھائی تم گھر نہیں آ رہی۔ امی تمہارا ڈنر پر انتظار کر رہی ہیں۔" حشام نے تیز لہجے میں کہا۔

"نہیں حشام بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر مجھے لائیو شو نہ کرنا ہوتا تو میں کبھی بھی آج باہر نہیں نکلتی۔ میں نے ڈاکٹر عزیز کو فون تو کر دیا تھا وہ آ کر دیکھ گئے ہوں گے لیکن پھر بھی مجھے ان کے پاس رہنا چاہیے۔

میں نے آج غور سے انہیں دیکھا ہے وہ خاصے کمزور ہو گئے ہیں اور میں بھی اس جاب کے بعد اتنی بزی رہنے لگی ہوں کہ ان دونوں کے پاس بیٹھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو میں تمہیں زبردستی آنے کے لیے نہیں کہوں گا۔ چلو پھر کبھی سہی۔" حشام نے کہا۔

"اچھا حشام تم ریحان صاحب کو میرے بارے میں بتا دینا۔" میں نے اپنے شو کے ڈائریکٹر کا نام لیا۔

"میرے خیال میں تم انہیں خود ہی فون کر کے معذرت کر لو میرا کہنا مناسب نہیں ہوگا۔"

حشام نے مشورہ دیا تو مجھے اس کا مشورہ بہتر لگا اور میں نے اسے اللہ حافظ کہہ کر ریحان صاحب کو فون کر کے آج نہ آنے کی معذرت کر لی۔ انہوں نے بھی زیادہ کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ آج تو شو ہو ہی نہیں رہا تھا۔

ایک جانب سے اطمینان ہوا تو میں نے گھر فون کیا۔ فون اماں نے اٹھایا تو میں نے ان سے بابا کی خیریت پوچھی تو انہوں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عزیز آئے تھے۔ انہوں نے پورا چیک اپ کیا ہے انجکشن دیا ہے دوائیں بھی دی ہیں۔ اب وہ سو رہے ہیں۔ اور بخار بھی اتر رہا ہے۔ ویسے ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ بخار ہے۔ دو تین دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" ساری تفصیل بتانے کے بعد اماں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ میں حشام کے گھر ڈنر پر چلی جاؤں۔ کیونکہ ابھی ابھی حشام کی امی کا فون آیا تھا اور وہ شمسو کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ انہیں حشام نے فون کر کے بتایا تھا۔

"ٹھیک ہے اماں میں چلی جاؤں گی واپسی میں اگر دیر ہو گئی تو حشام مجھے ڈراپ کرنے آ جائے گا۔" میں نے کہا۔

میں نے ایک بار پھر حشام کو فون کیا اور اسے بتا دیا کہ میں گھر پر آ رہی ہوں۔ یہ سن کر حشام نے مسرت کا اظہار کیا اور بولا میں بھی یہاں سے نکل رہا ہوں۔ تم بھی پہنچو۔

خدا خدا کر کے ٹریفک کھلا اور آگے کی گاڑیوں نے رینگنا شروع کیا۔ وہ سفر جو عام حالات میں بیس سے پچیس منٹ کا تھا پورے دو گھنٹوں میں طے ہوا۔ اس دوران حشام کے مسلسل فون آتے رہے۔

رات کے دس بج چکے تھے آنٹی اور انکل حشام کے ساتھ میرے منتظر تھے ان لوگوں کا پیار اور خلوص دیکھ کر میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی کو اس کے پیاروں سے محروم کر دیتا ہے تو غیروں میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے جو اپنوں سے بڑھ کر اسے پیار دیتے ہیں۔

جتنی دیر آنٹی نے ڈنر ٹیبل پر لگوایا اتنی دیر میں انکل اور حشام کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی رہی۔ ذکر جب نواب سطوت الاسلام کا نکلا تو انکل نے کہا۔

"ارے ہاں ان موصوف نواب صاحب کے بارے میں ایک بہت ہی اہم بات معلوم ہوئی ہے لیکن میرا تم دونوں کو ایک مشورہ ہے کہ جب تم ان کو اپنے شو میں بلاؤ تو اس بات کا قطعی تذکرہ مت کرنا۔ یہ خالص ان کی ذات سے متعلق بات ہے۔"

"اچھا ایسی کون سی خاص بات ہے۔" میرے اور حشام کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ تو انکل ہمارا تجسس دیکھ کر مسکرانے لگے اور خاموش رہے تو میں نے بے چینی سے کہا۔

"بھئی انکل اب بتا بھی دیں ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ جو بات ہمیں بتائیں ہم اس کا ذکر ان کے آگے بلکہ کسی کے بھی آگے نہیں کریں گے۔"

"یہی بہتر ہوگا بیٹا کیونکہ کوئی بھی شخص جس نے

معاشرے میں اتنی عزت بنائی ہو یوں میڈیا میں اپنی ذات پر کیچڑ کبھی بھی برداشت نہیں کرے گا۔ ویسے بھی اس شخص کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔" انکل نے سنجیدگی سے کہا۔

"انکل۔" میں نے پھر احتجاج کیا۔ "اب بتا بھی دیں۔"

"سنا ہے جوانی کے دور میں موصوف کو "شاہی محلوں" میں آنے جانے کا بھی بہت شوق تھا۔ اور ایک بہت نامی گرامی طوائف جس کے حسن کا چرچا بہت دور دور تھا سرمئی! آئی ایم سوری ٹو سے۔" انکل رک کر میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ "وہ تمہاری ہم نام تھی۔ اس کے بہت شیدائی تھے لیکن اس کا ناچ دیکھنے کے لیے وہ کبھی بھی اس کے کوٹھے پر نہیں گئے بلکہ اسے اپنے ہاں بلوایا کرتے تھے۔ اپنے شوق پورے کرنے کے لیے انہوں نے ایک علیحدہ بنگلہ لے رکھا تھا۔

انکل بول رہے تھے اور میں آنکھیں پھاڑے سن رہی تھی۔ نواب سطوت الاسلام کا نام میرے دماغ میں ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ امی نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ ایک زمیندار نے ان کے نام بہت سی زمینیں اور باغات کیے تھے لیکن شادی سے انکار کردیا تھا۔ وہ شادی کے بغیر امی کو زندگی بھر اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے لیکن امی نے انکار کردیا یقیناً یہ وہی شخص ہے۔

میری اس وقت کیفیت یہ تھی کہ آنکھیں اور منہ کھلا ہوا تھا اور میں ایک ٹک انکل کی جانب دیکھتے ہوئے امی کی ڈائری میں لکھے ہوئے الفاظ میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ تو بہت اچھا ہوا جو میں نے حشام کو امی کی اصلیت نہیں بتائی۔

"تمہیں کیا ہوا۔" حشام نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو میں جیسے ہوش میں آگئی۔ میرا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا اور حلق بالکل خشک ہوگیا تھا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ امی نے مجھے ان کا نام کیوں نہیں بتایا۔ نام چھپانے کی خاص وجہ کیا ہوسکتی ہے۔

"کچھ نہیں" میں نے ایک پھیکی اور مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم مجھے کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو آخر بات کیا ہے۔ یہ نواب صاحب کی عیاشیوں کی داستان سن کر تمہیں کیوں پریشانی ہورہی ہے۔" ہمیشہ سے بحث کرنے والا حشام بھر بحث کے انداز میں بولا۔

"ارے واہ میں کیوں پریشان ہونے لگی۔ وہ تو میرے ذہن میں ان کا امیج بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ انکل سے ایسی باتیں سنیں تو شاک سا لگا۔" میں نے اپنے سابقہ لہجے میں کہا۔

"نہیں میرے خیال میں کوئی اور وجہ ہے تم بتانا نہیں چاہ رہیں۔" حشام نے مجھے تنگ کرنے کا پورا پروگرام بنالیا تھا۔ تب ہی میری نجات بن کر آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں اور انہوں نے حشام کا کان پکڑ کر ایک ہلکی سی چپت سزا کے طور پر لگائی کہ وہ مجھے کیوں پریشان کررہا ہے اور ہمیں ڈنر کی ٹیبل پر انوائٹ کیا۔

میری ذہنی حالت بہت خراب ہورہی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو حتی الامکان نارمل حالت میں رکھا اور جلدی جلدی کھانا کھا کر گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ بہانہ یہ بنایا کہ بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ حشام نے مجھے گھر تک چھوڑنے کی آفر کی لیکن میں نے کہا کہ ابھی تو سوا گیارہ ہی بجے ہیں۔ زیادہ رات نہیں ہوئی ہے۔

انکل ڈنر کے بعد اپنی اسٹڈی میں چلے گئے اور

میں آنٹی کا بہت سارا پیار سمیٹے گھر کی جانب جارہی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بابا کی طبیعت ٹھیک ہوجائے گی تو ان سے اس بارے میں بات ضرور کروں گی۔

میں ابھی تک شاہ فیصل کالونی کے اسی مکان میں رہ رہی تھی جو امی نے خریدا تھا حالانکہ حشام نے مجھ سے کہا بھی کہ تم شہر کے درمیان مکان یا فلیٹ لے لو تمہیں ٹی وی اسٹیشن آنے کے لیے کافی لمبا سفر کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ اس کا بنگلہ ہل پارک پر تھا لیکن مجھے اس گھر سے بہت پیار تھا۔ یہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ اس کے در و دیوار سے امی کی خوشبو اور ان کے پیار کا لمس محسوس ہوتا تھا۔

میں اپنی سوچوں میں گم بہت تیز ڈرائیونگ کرتی ہوئی جارہی تھی کہ اچانک شاہ فیصل کالونی کے پل پر میں نے پیچھے دیکھے بغیر ہی موڑ کاٹنے کی کوشش کی کہ اچانک پیچھے سے آنے والی تیز رفتار کار نے مجھے ہٹ کیا۔ وہ تو فوراً ہی اس ڈرائیور نے بریک لگا دیا ادھر میں نے بھی بریک لگایا لیکن اتنی دیر میں میرا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرا گیا اور میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔

پیچھے والی گاڑی سے کوئی شخص اتر کر تیزی سے میری گاڑی کے قریب آیا اور شیشہ بجاتے ہوئے بولا۔

"محترمہ آپ ٹھیک تو ہیں۔" میں ہوش میں تھی چوٹ پتا نہیں کتنی آئی تھی بس سر میں زبردست درد محسوس ہورہا تھا۔ مجھے اس شخص پر بے انتہا غصہ آیا۔ میں نے تیزی سے شیشہ نیچے کیا اور بھناتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اندھے ہیں جو اتنی بڑی کار دکھائی نہیں دی یا کہیں جانے کی بہت جلدی ہے جو راستے میں آنے والی ہر گاڑی کو ٹکریں مارتے ہوئے اپنے راستے سے اس طرح ہٹاتے ہوئے آگے چلے جائیں گے۔"

"آئی ایم رئیلی سوری۔ غلطی میری بھی اور آپ کی بھی تھی ہم دونوں ہی جلدی میں تھے اس لیے نہ آپ نے پیچھے سے آنے والی گاڑی کا خیال کیا اور نہ ہی میں نے سائڈ سے آنے والی گاڑی کا خیال کیا۔ آپ کے سر میں چوٹ لگی ہے دیکھیں خون بہہ رہا ہے۔" اس نے بہت مہذب لہجے میں معذرت کرنے کے بعد میرے سر کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"رہنے دیں۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کیا ہوا بیٹا کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟" مجھے ایک خاتون کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ تو میں نے آواز کی جانب نگاہ دوڑائی۔ ہلکی روشنی میں ایک عمر رسیدہ عورت کی ہلکی سی شبیہہ دکھائی دی۔

وہ تیزی سے آگے بڑھیں اور کھڑکی کے اندر منہ کر کے بولیں۔ "بیٹی تمہیں بہت چوٹ آئی ہے تمہاری پیشانی سے تو خون بہہ رہا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے بے ساختہ اپنا دوپٹا میری پیشانی سے لگادیا۔

"ارے ماں جی آپ کیوں اتر کر آ گئیں۔ آپ کا باہر آنا خطرے سے خالی نہیں ہے اگر کسی نے آپ کو دیکھ لیا تو" اس لڑکے نے اس عورت سے تیز سرگوشی میں کہا۔

"دیکھ لے تو دیکھ لے زندگی موت تو اللہ کے اختیار میں ہے نا! جب تک میری زندگی ہے کوئی مجھے نہیں مار سکتا۔" خاتون نے بے پروا لہجے میں کہا اور اپنے دوپٹے سے میری پیشانی سے بہنے والا لہو صاف کرنے لگیں حالانکہ میں انہیں روک بھی رہی تھی مگر وہ رکی نہیں۔

"ایک دفعہ میں پھر آپ سے معذرت چاہتا ہوں

محترمہ میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ ورنہ آپ کو اسپتال لے جاتا آپ کی ڈریسنگ کرواتا۔" اس نے کہا پھر خاتون کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔
"پلیز اماں چلیے ہمارا یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔"
میں ان دونوں کی بات سن کر چونک پڑی تھی۔ ایک جرنلسٹ ہونے کی حیثیت سے میرے کان ہر وقت کھڑے رہتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ کہیں گڑبڑ ہے شاید کوئی ان خاتون کی جان کے پیچھے پڑا ہے۔ اس لیے انہیں آواز دی۔
"ایک منٹ مسٹر......!"
"جی فرمائیے۔" اس نے مڑ کر جواب دیا۔ خاتون کا ہاتھ اب بھی اس نے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔
"بات کیا ہے' کیا کوئی مسئلہ ہے' آپ کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ آپ یا شاید ان خاتون کے دشمن انہیں جان سے مارنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتادیں ہوسکتا ہے میں آپ کے کچھ کام آسکوں۔ میں ایک جرنلسٹ ہوں اور نیوز چینل پر ٹاک شو کرتی ہوں۔ شاید آپ نے کبھی میرا شو دیکھا ہو۔" میں نے ایکسیڈنٹ سے ہونے والی ساری تلخی کو بھلا کر کہا۔
"اوئیس۔ میں نے آپ کو ٹی وی پر دیکھا ہے۔ آپ اس شو کی ہوسٹ ہیں۔' اس نے مجھے پہچان کر کہا۔ "میں نے کبھی بھی آپ کا شو پورا نہیں دیکھا۔ بس کبھی کبھی تھوڑا بہت دیکھا ہے۔"
"ہاں اب بتائیے مسئلہ کیا ہے۔ یہ خاتون آپ کی کون ہیں اور کون ان کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔" میں گاڑی سے اتر کر باہر نکل کر کھڑی ہوگئی۔ پیشانی سے خون بہنا بند ہوگیا تھا۔
"کیا آپ واقعی ہماری مدد کرنا چاہتی ہیں۔"
اچانک اس کی آنکھوں میں ایک انجانی سی چمک آگئی اور اس نے پر جوش لہجے میں پوچھا۔
"یس آف کورس۔" میں نے اعتماد سے کہا۔
"فی الحال آپ ہماری اتنی مدد کریں کہ ان خاتون کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں۔ ویسے بائی دا وے آپ کہاں رہتی ہیں۔" اس نے کہا۔
"ان کو میں اپنے گھر لے جاؤں۔" میرے لہجے میں حیرت تھی۔ "غالباً یہ آپ ان خاتون کی جان بچانے کی خاطر کہہ رہے ہیں۔" میں نے اپنے خیال کی وضاحت چاہی۔
"بالکل یہی بات ہے آپ انہیں رات بھر کے لیے اپنے گھر رکھ لیں۔ صبح میں آکر آپ کو ساری بات بتادوں گا۔ آپ کے گھر بہ نسبت میرے گھر کے ان کی جان محفوظ رہے گی۔" اس نے کہا۔
"ٹھیک ہے۔" میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا اور انہیں اپنے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ خاتون تھوڑی جھجک رہی تھیں۔ تب اس نے خاتون سے کہا۔
"اماں جی سمجھیں کہ اللہ نے غیب سے آپ کے لیے مدد بھیجی ہے۔ ہمارا یہ ایکسیڈنٹ ہونا مبارک ثابت ہوا ہے۔ آپ ان کے ساتھ فی الحال ان کے گھر چلی جائیں۔ صبح میں خود آجاؤں گا۔ اگر نہ آیا تو آپ پریشان مت ہونا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان کے گھر بالکل محفوظ رہیں گی۔" اس نے خاتون کو سمجھا کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر ہدایت کی کہ سیٹ پر پہلے کی طرح لیٹ جائیں۔
خاتون کو سیٹ پر لٹانے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور مجھ سے بولا۔ "اب آپ مجھے اپنا ایڈریس سمجھادیں۔ تاکہ میں اماں جی کو لینے کے لیے آسکوں۔"

"آئی ایم سوری مسٹر' میں یوں ایک انجان شخص کو اپنے گھر کا ایڈریس نہیں دے سکتی آپ ایسا کریں کہ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں میں خود آپ سے رابطہ کرلوں گی۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے۔ خاصی ذہین معلوم ہوتی ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ایسے موقعوں پر ذہانت کا استعمال بہت ضروری ہوتا ہے مسٹر۔ ابھی تو مجھے آپ کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے کہ آپ کون ہیں۔ ان خاتون سے آپ کا کیا رشتہ ہے اور کون لوگ ہیں جو ان کی موت کے خواہاں ہیں۔ میں تو محض انسانی ہمدردی کی بناء پر کر رہی ہوں۔" میں نے کہا۔
"اگلی ملاقات پر اگر زندگی رہی تو میں آپ کو ان خاتون کی کہانی سناؤں گا ان کی کہانی آپ کے نیوز چینل کے لیے بہت زبردست ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس میں بہت سے پردہ نشینوں کے چہرے سے حسین نقاب اتر جائیں گے اور اندر سے ان کے مکروہ اور غلیظ چہرے سب کے سامنے آجائیں گے۔ یہ خاتون بھی ایسے ہی حسین نقاب کے پیچھے چھپے گھناؤنے چہرے والے ایک نام نہاد عزت کے ٹھیکیدار کے ظلم کا شکار ہیں۔ اگر یہ آپ کو اپنے بارے میں بتادیں تو ان ہی کی زبانی سن لیجیے گا۔"
پھر اس نے اپنا سیل فون نمبر مجھے بتایا جو میں نے اپنے موبائل میں سیو کرلیا اور پھر میں تیزی کے ساتھ گاڑی کی جانب روانہ ہوگئی۔ یہ تو شکر ہوا کہ گاڑی کی ٹکر ہونے کے باوجود گاڑی میں کوئی خرابی نہیں ہوئی وہ ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔
پل سے میرے گھر کا فاصلہ پانچ سات منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ راستے میں خاتون نے سیٹ پر لیٹے لیٹے مجھ سے کہا کہ میں تمہارا ٹی وی پر آنے والا شو دیکھتی ہوں اور پسند کرتی ہوں۔
ان لوگوں کی باتوں میں' میں اپنے چوٹ کے درد کو بھول گئی تھی مگر اب درد ہونے لگا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اماں حمیدہ کے ڈھیر سارے سوالات کے کیا جواب دوں گی۔ پھر میں نے سوچ لیا کہ میں کہہ دوں گی کہ یہ خاتون میری گاڑی سے ٹکرا گئی تھیں۔ اس لیے کہ پیچھے ایک آنے والی گاڑی نے میری گاڑی کو ہٹ کردیا تھا۔
خاتون بے ہوش ہوگئی تھیں اس لیے میں انہیں اٹھا کر اپنے گھر لے آئی ہوں۔ کل صبح ان کے گھر والوں کو فون کردوں گی وہ انہیں آکر لے جائیں گے۔
میں اپنے گھر کے گیٹ پر پہنچی تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے میرے ملازم خالد نے فوراً ہی گیٹ کھول دیا۔ اماں بھی جھٹ گاڑی کا ہارن سن کر باہر آگئیں لیکن مجھے تنہا گاڑی میں دیکھا تو بولیں۔
"اکیلی آئی ہو اتنی رات ہوگئی۔ حسام چھوڑنے نہیں آیا۔ پھر ان کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی تو گھبرا کر مزید آگے بڑھیں اور دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔
"خیر ہو میرے مالک' تمہارے سر پر چوٹ کیسے آگئی۔"
"اماں یہ دیکھیں باجی کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے پیچھے کی لائٹیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔" خالد نے اماں سے کہا۔
"اللہ کرم' اللہ کرم...... ارے میری بچی کیسے ہوگیا ایکسیڈنٹ۔"
"کچھ نہیں ہوا اماں معمولی سی ٹکر تھی۔ دیکھیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل بھلی چنگی آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اماں کی بوکھلاہٹ کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے

گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اماں کو آواز دی۔

"اماں جی اتر آئیں میرا گھر آ گیا ہے۔" تو وہ سیٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"اے ہے کون ہے۔" اماں نے آگے بڑھ کر گاڑی میں جھانکا۔

"ابھی بتاتی ہوں۔ کہہ کر میں نے خاتون کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اتارا اور خالد کو گاڑی کی چابی دے کر کہا کہ گاڑی اچھی طرح لاک کر کے اندر آ جاؤ اور گیٹ بند کر لو۔ میرے گھر میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ ایک چھوٹی سی گاڑی بھی اندر کھڑی ہو سکے۔ اس لیے میں گاڑی باہر گلی میں ہی کھڑی رکھتی تھی۔

اماں حمیدہ شدید حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی اور مسلسل دیکھے جا رہی تھیں۔ میں نے انہیں اندر لا کر بٹھایا اور اماں سے کہا کہ اماں جی ان کے کھانے اور پینے کے لیے کچھ لے آیئے۔

"نہیں، نہیں بیٹا کھانے کی ضرورت نہیں بس ذرا سا پانی پلا دو اور ہاں تم اپنے زخم پر کوئی دوا تو لگا لو۔" انہوں نے کہا۔

"میں نے دیکھا کہ اندر تیز روشنی میں اماں حمیدہ غور سے ان کی جانب دیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے جب اماں حمیدہ کو دیکھا تو وہ بھی ایک ٹک اماں حمیدہ کو تکنے لگیں۔ دونوں پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔

میں ان دونوں کی یہ حالت دیکھ کر حیران ہو رہی تھی اس لیے اماں حمیدہ کو ٹوکا اور کہا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں اماں کیا اس سے پہلے کسی عورت کو نہیں دیکھا آپ نے سنا نہیں یہ پانی مانگ رہی ہیں پانی لایئے ان کے لیے۔"

"یہ تمہیں کہاں سے مل گئی؟" اماں حمیدہ نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔



اگلی صبح ساری کوٹھی میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ نواب صاحب کی حویلی میں موت ہو گئی ہے۔ ان کی جوان بیٹی مر گئی ہے۔ ایک عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ٹی وی کھولا تو اس میں بھی یہ خبر آ رہی تھی کہ نواب سطوت الاسلام کی بڑی صاحب زادی جو کافی عرصہ سے بیمار تھیں رضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔ نواب سطوت الاسلام کو بار بار ٹی وی پر غمزدہ حالت میں دکھا رہے تھے۔ حویلی کے باہر لوگوں کا جم غفیر امڈ آیا تھا۔ تقریباً ہر نیوز چینل اس خبر کو نشر کر رہا تھا۔ نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کے لیے بہت سے سیاسی لیڈر شاداب پور جا رہے تھے۔

میرے دل کو بار بار تسکین ملتی جب نواب کی روتی اور غمگین صورت ٹی وی پر دکھائی دیتی۔ میرا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ میں ابھی بھاگتا ہوا جاؤں اور ان ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں نواب کا گریبان پکڑ کر کہوں۔

"آج کیوں رو رہا ہے اس لیے کہ تیری جوان بیٹی مر گئی ہے لیکن تو جھوٹا ہے مکار ہے فریبی ہے۔ تجھے کوئی غم کوئی دکھ نہیں ہے اپنی بیٹی کے مرجانے کا اس لیے کہ تو خود اپنی اولاد کی خوشیوں کا قاتل ہے۔ تجھے صرف اپنی دولت اپنی زمینوں سے محبت ہے۔ ان زمینوں سے جنہیں تو مر کے یہیں چھوڑ جائے گا۔ تیرے حصے میں تو صرف دو گز زمین کا ٹکڑا ہی آئے گا۔ اور ایسا شخص جس کو اپنی اولاد اور وہ بھی بیٹی جیسی رحمت، بیٹی جسے اللہ نے رحمت کہا ہے۔ تو نے سے محبت نہیں کی تو تو کسی دوسرے کی بیٹی کو کیسے لائق عزت و تکریم سمجھ سکتا ہے۔

وہ تو ہی تھا نیچ اور کمینہ انسان جس نے، جس نے میری فائزہ کی عزت داغ دار کی مجھے بتا نیچ آدمی تجھے

زہ کی معصوم صورت میں اپنی بیٹی کی صورت کیوں دکھائی نہ دی۔ میں ٹی وی بند کر کے تکیے میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیتا۔ میں تو صرف شیر افضل کو ہی اس جرم کا مجرم سمجھ رہا تھا لیکن شیر افضل تو میری فائزہ کو تجھ تک پہنچانے کا گناہ گار تھا اور میں نے اس کے گناہ کی سزا اس کی بیٹی کو بے آبرو کر کے دے دی ہے۔ لیکن تو میرا بڑا مجرم ہے زندہ ہے۔ میں تجھے اتنی عبرت ناک موت دوں گا نواب کہ دنیا یاد رکھے گی۔ مجھے اپنے انجام کی قطعی پروا نہیں ہے۔

کل رات راکھی نے بہت ہی اہم باتیں بتائیں اور ان میں سب سے اہم بات یہی تھی اس نے مجھے بتایا تھا۔

"ایک مرتبہ نواب، شیر افضل کی حویلی پر گیا تھا حویلی جاتے ہوئے اس نے فائزہ کو کہیں راستے میں دیکھا اور اس کا دل اس پر آ گیا اور اس نے شیر افضل سے اس کی فرمائش کر دی۔

یہ بات ارمان کے علم میں آ گئی اور اس نے بابا کو بھی یہ بات بتا دی تھی اس لیے شیر افضل نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ الٹا ارمان کو ہی کسی چکر میں پھنسا دیا۔ پھر اس کے ہاتھوں ارمان کا خون بھی ہو گیا۔ ان دنوں میں پنڈی میں تھا، بابا نے اس بات کی خبر مجھے نہیں دی۔

شیر افضل بابا سے ملا اور ان سے صاف صاف کہا کہ اپنی بیٹی کو ایک رات کے لیے حویلی میں بھیج دو اگر نواب صاحب کو تمہاری بیٹی کی قربت بھا گئی تو وہ اسے اپنی حویلی لے جائیں گے اور اس کے بدلے تمہیں بہت سی دولت اور زمینیں ملیں گی لیکن بابا نہیں مانے۔

پھر انہوں نے جھوٹا جرگہ بٹھایا اور جرگے میں ہمارے خلاف فیصلہ کیا گیا۔ ارمان کی موت کے بعد بابا بہت زیادہ ڈر گئے تھے کیونکہ ان لوگوں نے مجھے بھی جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔

آج میری سمجھ میں بابا کا سارا ڈر و خوف آ رہا تھا وہ باپ تھے۔ ایک جوان بیٹے کا لاشہ اٹھانے کے بعد ان کے اندر دوسرے بیٹے کی جوان موت دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

اصل بات سب نے مجھ سے چھپائی اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ میرے گھر کا ایک ایک فرد ختم ہو گیا۔ میری معصوم سی فائزہ لٹ گئی۔ مار دی گئی اور یہ سب اس بڈھے کمینے اور ذلیل انسان کی ہوس پرستی کا نتیجہ تھا۔ اس نے اپنی شیطانی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میرا پورا خاندان ختم کر دیا۔

نواب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں بدنصیب اس بدنصیب فائزہ کا بھائی ہوں۔ اس نے مجھ سے ہی اپنے کام لینے شروع کر دیے۔ میرا ہمدرد بن گیا۔ حد یہ کہ مجھے نتھیا گلی میرے اپنے علاقے میں بھی بھیج دیا شیر افضل اس کا قریبی یار ہے۔ اس کی اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے دونوں ایک ہی فطرت کے ہیں۔

فائزہ کی عزت ختم کرنے کے بعد انہوں نے فائزہ کو زندہ سلامت چھوڑ دیا۔ مجھے پھر بھی فائزہ نے نہیں بتایا۔ اماں تو اس صدمے سے آدھی مر چکی تھیں۔ پھر ارمان کی موت پر ان کی بچی کچھی سانسیں بھی ختم ہو گئیں۔ اور پھر شیر افضل کے کتوں نے ایک بار پھر میری بہن کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور اس کی جان لے لی اور میں کچھ نہیں کر سکا۔

راکھی کو یہ بات شروع سے ہی معلوم تھی۔ نواب نے راکھی کو میرے ساتھ بھیجا ہی اس لیے تھا کہ ہوشیار اور خبردار رہے کہ میرا اپنے گاؤں والوں سے کوئی رابطہ نہ ہو سکے۔ واقعے کی اصل بات کوئی بھی مجھے نہ بتا سکے۔

لیکن میری جھوٹی محبت کے اظہار نے راکھی کو سب کچھ اگلنے پر مجبور کردیا۔ نواب نے مجھے اپنا قریبی اور قابل اعتماد ساتھی بنالیا۔ وہ میرا سب سے بڑا دشمن تھا اور اس نے دوستی کا جال بچھا کر مجھے قابو کرلیا۔ مجھے انسان سے درندہ بناڈالا۔ میں نے ہر وہ کام کیا جس کے بارے میں میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ میں کیا تھا اور کیا ہوگیا تھا۔

راکھی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ غضنفر نام کا کوئی اور شخص نہیں نواب کا ہی جرائم کی دنیا میں دوسرا نام ہے۔ غضنفر کے نام سے اس کی شکل کی تبدیلی کے فرائض وہی میک اپ مین انجام دیتا ہے جس نے میرا میک اپ کیا تھا۔ ورنہ ساری دنیا اسے ایک گدی نشین پیر اور ایک سماجی رہنما کے نام سے جانتی ہے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں بھی غضنفر کا نام اور ان کے کارنامے موجود ہیں۔ اس کی تصویر بھی ہے۔ لیکن وہ کون سا چھلاوا ہے جو پلک جھپکتے میں غائب ہوجاتا ہے۔

اس روز کوٹھی میں قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن اس دن میں اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلا اور نہ ہی میں نے کچھ کھایا پیا۔

شام کو پانچ بجے میں نواب کے بتائے ہوئے ایڈریس کی جانب چل دیا۔ ملیر کھوکھرا پار میں موجود ایک چھوٹے سے مکان میں وہ عورت موجود تھی جس کو نواب نے اپنی بیوی کہا تھا۔ اور جس کے منظر عام پر آنے سے نواب کی عزت و ناموس کو خطرہ تھا۔ نواب اس کو بہت عرصے سے تلاش کررہا تھا لیکن اس کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ تھک ہار کر وہ یہ سوچ کر اور صبر کرکے بیٹھ گیا کہ وہ کہیں مر کھپ گئی ہوگی لیکن نواب کو اب اس کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہ ملیر کی ایک نواحی بستی کھوکھرا پار میں موجود ہے بتانے والے نے اس گھر کا ایڈریس بھی نواب کو دیا تھا اور اس کو ٹھکانے لگانے کا کام نواب نے میرے ذمہ لگایا تھا۔

میں وہاں جا تو رہا تھا لیکن میرا ارادہ اس عورت کو مارنے کا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ اس سے ملاقات کا تھا۔ اس کا اور میرا دشمن ایک ہی تھا میں اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا کر اس کا محافظ بننا چاہتا تھا اور نواب کے خلاف جتنے بھی ثبوت اس کے پاس تھے وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نواب جس چیز سے ڈر رہا تھا وہ ڈر اس کے سامنے لانا چاہتا تھا۔

نواب نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا نام روشن آراء بیگم ہے۔ اس کا گھر چھوٹا سا ہے اور گھر کے باہر نیم کا درخت ہے۔ وہ تنہا رہتی ہے اور مائی رحمت کے نام سے مشہور ہے۔

میرے پاس مکان کا نمبر موجود تھا اور مکان کی نشانیاں بھی۔ کلفٹن سے ملیر کھوکھرا پار تک کا مجھے طویل سفر کرنا پڑا۔ میں اس علاقے میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اس لیے شاہراہ فیصل سے ملیر ہالٹ پھر سیدھا ملیر کالا بورڈ تک آیا اور اسپتال کے سامنے بہت سے کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص سے پوچھا۔ ”کیا آپ مجھے بتاسکتے ہیں کہ کھوکھرا پار کہاں ہے؟“

اس نے مجھے راستا سمجھایا کہ ”آپ کالا بورڈ سے سیدھے اندر چلے جائیں۔ یہ سڑک جہاں جہاں مڑ رہی ہے آپ اس کے ساتھ چلتے رہیے سعود آباد پندرہ نمبر سے دائیں جانب مڑ جائیں روڈ کے دائیں جانب کھوکھرا پار اور بائیں جانب دوسری آبادیاں ہیں۔“

میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور کالا بورڈ سے اندر جانے والی روڈ پر گاڑی ڈال دی۔ تقریباً دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد سعود آباد پندرہ نمبر آگیا۔ یہاں سے بہت سی منی بسیں بھی کھوکھرا پار کھوکھرا پار کی آوازیں بھی لگا رہی تھیں۔ میں ان بسوں کے پیچھے لگ گیا۔

مجھے کھوکھرا پار چھ نمبر جانا تھا۔ میں بس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور چھ نمبر پہنچ گیا۔ روڈ سے ہٹ کر اندر جانے والی روڈ پر میں اتر گیا اور مکانوں پر لکھے نمبر دیکھنے لگا یہاں ہر مکان پر نمبر نہیں لکھا تھا کسی کسی مکان پر نمبر لکھا تھا۔ میں نے ان ہی نمبروں کی مدد سے اپنا مطلوبہ مکان تلاش کرلیا۔ وہ گھر ایک پتلی اور تنگ سی گلی کے درمیان میں بنا ہوا تھا۔ بہت پرانا اور بوسیدہ سا مکان تھا۔ اس کے آگے نیم کا ایک گھنا درخت بھی موجود تھا۔

میں نے اپنی کار گلی کے باہر کھڑی کی اور مکان تک پیدل چل کر گیا۔ لوہے کے پرانے اور زنگ آلود دروازے پر تالا موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر کے اندر کوئی موجود ہے۔ میرے پاس اسلحہ موجود تھا۔ جو میں حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت پیش آجائے۔ احتیاط کے طور پر میں نے گلی میں گلی ڈنڈا کھیلنے والوں بچوں میں سے ایک بچے کو اپنے قریب بلایا۔ جس کے جسم پر صرف ایک عدد میلی اور پھٹی ہوئی شلوار موجود تھی۔ بچوں اور گھروں کو دیکھ کر اس علاقے اور یہاں کے رہنے والوں کی زبوں حالی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”بیٹا ادھر آؤ“ میں نے اسے پیار سے آواز دی تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

”بیٹا مائی رحمت اسی گھر میں رہتی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”کیوں کیا وہ آپ کے گھر کام کرتی ہے یا آپ کے گھر سے کوئی چیز چرا کے بھاگی ہے؟“ بچے نے تیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ یہاں ساری ماسیاں ہی رہتی ہیں اور جب کوئی عورت کسی کے گھر سے چوری کرکے آتی ہے تو لوگ اس طرح اس کا گھر ڈھونڈتے ہوئے آتے ہیں۔“ بچے نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اس کے دوست نے جو اس کے ساتھ کھیل رہا تھا اسے آواز دے کر بلایا تو بچے نے ایک فحش سی گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”ابے آرہا ہوں۔“

”نہیں، نہیں ایسی بات نہیں ہے، دراصل میرے گھر شادی ہے اور مائی کئی دنوں سے کام پر نہیں آرہی اس لیے میں اسے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔“ میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ عورت بھی گھروں میں ماسی کا کام کرتی ہے اس لیے بات بنائی۔

”پھر وہ بیمار ہوگئی ہوگی۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ”ہاں یہی گھر ہے اس کا۔“ میں نے بچے کا شکریہ ادا کرنے کے طور پر جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچاس کا نوٹ اس کی جانب بڑھا کر کہا۔

”جاؤ اس کی چیز کھالینا۔“ بچے نے پہلے تو حیرت سے مجھے دیکھا پھر للچائی ہوئی نگاہوں سے نوٹ کو دیکھا اور جھپٹنے کے انداز سے میرے ہاتھ سے نوٹ لیا اور ایک جانب بھاگ لیا۔

میں نے آگے بڑھ کر ٹین کا دروازہ بجادیا مگر اندر سے نہ تو کوئی آواز آئی اور نہ ہی کوئی ہلچل مچی، میں نے دوبارہ بجایا۔ اس مرتبہ قدموں کی آواز کے ساتھ ایک لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ارے آرہی ہوں دروازہ زور سے مت پیٹو گر پڑے گا۔“

اور پھر دروازہ کھل گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بہت ہی کمزور سی خاتون کھڑی تھیں۔ سر کے بال کھچڑی کی طرح کالے سفید تھے میری صورت پر نگاہ پڑی تو جھٹ انہوں نے دروازہ بند کردیا اور بولیں۔

”تم لوگ پھر آگئے۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی جاؤ چلے جاؤ، خدا جانے کس نے انہیں میرا پتا

بتا دیا ہے۔"

میں نے دوبارہ دروازہ بجایا اور کہا۔ "اماں جی پلیز دروازہ کھولیں آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں وہ نہیں ہوں۔ میں تو پہلی بار آیا ہوں۔"

"میں نے کہا نا مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ چین سے مرنے بھی نہیں دو گے۔" تھکی تھکی سی آواز آئی۔

"اماں مجھے نواب صاحب نے بھیجا ہے پلیز دروازہ کھول کر صرف ایک بات سن لیں۔" میں نے دروازے کے قریب منہ کر کے دھیمی آواز میں کہا۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"اماں دروازہ کھول کر میری صرف ایک بات سن لیں بھلے مجھے اندر نہ آنے دیں۔" میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا تو وہ دروازے کے قریب آ کر بولیں۔ آواز بہت دھیمی تھی۔

"کون نواب صاحب۔"

"نواب سطوت الاسلام نے۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا کہنا ہے؟" تھوڑے توقف کے بعد پوچھا گیا۔

"اگر مناسب سمجھیں تو مجھے اندر بلا لیں۔ میں باہر سے اتنی لمبی بات کیسے کر سکتا ہوں۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا تو تھوڑے پس و پیش کے بعد دروازہ کھل گیا۔

میں نے دیکھا کہ ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ستواں ناک اور پتلے پتلے ہونٹ تھے۔ رنگ البتہ سانولا تھا اپنی جوانی میں یہ خاتون یقیناً حسین رہی ہوں گی۔ میں نے تیزی سے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا اور کہا۔

"اماں جی! کیا ہم اطمینان سے کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

"آؤ اندر آ جاؤ۔" انہوں نے کہا اور مڑ کر چل دیں۔ اس چھوٹی سی چار دیواری میں ایک کمرا بنا ہوا تھا باقی سارا صحن تھا جس کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔

شام ختم ہو کر اندھیرا اترنے لگا تھا پاس کی مسجدوں سے مغرب کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔ انہوں نے صحن کا بلب جلایا اور مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئیں۔ یہاں ایک جھلنگا سی چارپائی پر میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔

"تمہارے بیٹھنے کے لائق میرے پاس کچھ اور تو نہیں بس یہی ایک چارپائی ہے اس پر بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے کہا اور خود زمین پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

میں چارپائی پر ٹک گیا اور کہا۔ "اماں آپ نیچے کیوں بیٹھ گئیں۔ اِدھر آ کر بیٹھیں میرے ساتھ۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں میں جانتی ہوں تمہیں نواب نے مجھے جان سے مارنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس لیے آرام سے اپنا کام کرو اور نواب سے جا کر انعام وصول کرو۔ میں بھی اب بہت تھک گئی ہوں، اکتا گئی ہوں اس جینے سے۔" انہوں نے یہ بات اتنے اطمینان اور سکون سے کہی جیسے کہہ رہی ہوں یہ کھانا رکھا ہے کھاؤ اور جاؤ......!"

"آپ کو کیسے پتا کہ مجھے نواب نے آپ کو مارنے کے لیے بھیجا ہے۔" میں نے شدید حیرت سے کہا۔

"تو اور کیا اتنے سالوں کے بعد نواب کو میرا پتا ملے گا تو وہ مجھے ملاقات کے لیے بلائے گا۔ اسے سوائے میری موت کے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک فرما رہی ہیں۔ مجھے نواب نے آپ کو ختم کرنے کے لیے بھیجا ہے لیکن میرا ارادہ آپ کو مارنے کا ہرگز نہیں ہے۔ میں تو صرف آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں اور شاید کچھ اور لوگ بھی ہیں جو نواب کے دشمن ہیں اور آپ کو اپنے ساتھ ملا کر آپ کو نواب کے خلاف استعمال کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ جب ہی آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تم پھر آ گئے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ایسا ہی ہے لیکن مجھے کسی سے بھی بدلہ نہیں لینا۔ میں نے اپنا ایک بدلہ تو لے لیا تھا۔ چوبیس سال پہلے اور باقی فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے وہ اسی کا مجرم ہے۔ وہ چاہے تو اسے معاف کر دے چاہے تو اسے سزا دے دے۔"

اور میں اس صابر عورت کو تکتا ہی رہ گیا۔ پھر مجھ سے چارپائی پر نہ بیٹھا گیا اور میں چارپائی سے اتر کر اس کے نزدیک جا کر بیٹھ گیا اور کہا۔

"لیکن اماں جی میرے اندر آپ جتنا ظرف نہیں ہے۔ میں اس ذلیل انسان کو قطعی معاف نہیں کر سکتا میں اسے اس کے جرم کی انتہائی عبرت ناک سزا دوں گا۔" یہ بات کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

"تمہارے ساتھ اس نے کیا ظلم کر دیا۔" انہوں نے اطمینان سے پوچھا۔

"اس نے میری معصوم بہن کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور میرے پورے خاندان کو مار ڈالا اور میری بدنصیبی دیکھیے کہ میں اس بات سے بے خبر رہا کہ وہی میرا مجرم ہے اپنے مجرموں کو سزا دینے کے لیے اسی کے دامن میں پناہ لینے پہنچ گیا حالاں کہ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا لیکن وہ میرا خیر خواہ بنا رہا اس نے مجھ سے دنیا کے سارے جرائم کروائے اور میں اس کو اپنا محسن جان کر سارے جرم خوشی خوشی کرتا رہا......!"

"تم اکیلے اس کے ایسے جرم کا شکار نہیں ہوئے ہو، اس کے کھاتے میں ایسے بے شمار جرم ہیں۔ نہ جانے کتنے تمہارے جیسے بدنصیب خاندانوں کے خون اس کی گردن پر ہیں لیکن آخر کب تک اللہ اپنی رسّی دراز کرے گا، فرعون کے گھر میں موسیٰ پرورش پاتا ہے تم نے یہ کہاوت تو سنی ہو گی۔" انہوں نے ایک زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آپ کے ساتھ کیا ظلم کیا تھا اس نے......وہ تو کہہ رہا تھا کہ آپ اس کی بیوی ہیں پھر آپ کا دشمن وہ کیوں ہو گیا؟" میں نے لجاجت بھرے لہجے میں پوچھا۔

نہ جانے کیوں میرا دل ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا، بات پوچھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو انہوں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"رو نہیں، اپنا انصاف اللہ پر چھوڑ دو، جیسے میں نے چھوڑا ہے۔"

"نہیں اماں! اللہ تعالیٰ انسان کے گناہوں اور بداعمالیوں کی سزا دنیا میں بھی تو دیتا ہے اور پھر فرعون کا بیڑہ غرق بھی تو موسیٰ نے دنیا ہی میں کیا تھا پھر میں کیوں اسے بخش دوں، میں اس فرعون کے لیے موسیٰ بنوں گا۔" میں نے آنسوؤں کے درمیان کہا تو ان کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ آ گئی اور وہ بولیں۔

"چائے پیو گے......؟"

"نہیں اماں جی! مجھے چائے نہیں پینی آپ مجھے کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔" میں نے کہا۔

"نہیں، پہلے میں چائے بنا لاؤں پھر بات کریں گے۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا صحن میں کمرے

کے ساتھ ہی چھپر ڈال کر کھانے پکانے کی جگہ بنائی ہوئی تھی۔

مجھے اس مظلوم عورت کی حالت زار دیکھ کر بے حد افسوس اور دکھ ہو رہا تھا' یہ ایسے شخص کی بیوی رہ چکی ہے جس کے پاس بے اندازہ دولت ہے' آخر اس نے اس کے ساتھ ایسا کیا کیا کہ وہ اپنی زندگی کے دن ایسے ٹوٹے پھوٹے مکان میں کسمپرسی کے عالم میں گزار رہی ہے جو عورت کبھی بیگم نواب سطوت الاسلام تھی آج مائی رحمت بن کر رہ گئی ہے' لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا پیٹ بھر رہی ہے۔

میں یہ سب باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دو سادہ سے مگوں میں چائے بنا کے لے آئی' ایک کپ اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا اور دوسرا کپ خود لے لیا اور اپنی سابقہ حالت میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی' پھر اسے کچھ خیال آیا تو بولی۔

''ارے تم نیچے کیوں بیٹھے ہو' آؤ اوپر بیٹھو چارپائی پر۔ بیٹا یہ چادر میلی ضرور ہے لیکن پاک ہے' دراصل جب گھروں کا کام کر کے آتی ہوں تو ہمت نہیں ہوتی کہ گھر کے کام کروں اور پھر کئی روز سے جب سے ان لوگوں کا آنا جانا ہوا ہے' میری طبیعت خراب ہو رہی ہے' میں کام پر بھی نہیں گئی۔''

وہ یہ کہتے ہوئے خود بھی چارپائی پر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی تو میں بھی اٹھ کر اوپر بیٹھ گیا اور چائے کا سپ لیتے ہوئے چائے کی تعریف کی تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''کم بخت یہ منہ کو ایسی لگی ہے کہ اس کی عادت چھوٹتی ہی نہیں' چاہے میں کھانا نہ کھاؤں' لیکن چائے ضرور پیتی ہوں۔''

''اماں جی! مجھے آپ کو اس حال میں دیکھ کر بہت افسوس اور دکھ ہو رہا ہے' آپ مجھے بتائیں ناں کہ آپ ان حالات تک کس طرح پہنچیں اور ہاں کیا نواب نے آپ کو طلاق دے دی تھی یا آپ اب بھی اس کی بیوی ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''بیٹا! یہ ایک لمبی کہانی ہے اور اسے سنانے کے لیے کافی وقت درکار ہے اور تمہارے پاس اتنا فالتو اور بے کار وقت کہاں ہوگا کہ تم میری داستان سنو...... اب تو بس تنہائیاں ہیں اور میری زندگی کی یادیں ہیں۔ یہ یادیں ایسی ہیں کہ جنہیں اگر میں بھولنا بھی چاہوں تو نہیں بھلا سکتی۔ اسے میں نے سچے دل سے چاہا تھا' لیکن اس نے میرا دل میرا مان سب توڑ دیا' میں آج بھی اس کے نکاح میں ہوں یا کم از کم میں ایسا سمجھتی ہوں کیوں کہ جب میں اسے چپ چاپ چھوڑ کر اس کی زندگی سے نکل آئی تھی تب تک اس نے مجھے طلاق نہیں دی تھی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

''اماں جی میرے پاس بہت سارا وقت ہے' بلکہ میں تو ساری رات یہیں بیٹھ کر گزار سکتا ہوں' آپ بتائیں۔'' میں نے کہا۔

''تم کیا کرو گے میری کہانی سن کر......؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں کروں گا' میں نے بھی تو اپنا غم آپ کے ساتھ شیئر کیا ہے' آپ بھی اپنی یادیں میرے ساتھ شیئر کر سکتی ہیں۔ کہتے ہیں خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں اور دکھ بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا لیکن وہ خاموش رہیں۔ تب میں نے پوچھا۔

''اماں جی! آپ پڑھی لکھی ہیں......؟''

میری بات سن کر وہ ہنس پڑیں اور پھر اس طرح ہنسیں کہ میں حیرانی سے ان کی شکل دیکھنے لگا کہ کیا میں نے انہیں کوئی لطیفہ سنایا ہے یا کوئی مضحکہ خیز بات سنائی ہے۔

''میں نے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا ہے......'' انہوں نے اپنی ہنسی روک کر کہا۔

''تو پھر اپنی زندگی گزارنے کے لیے آپ نے یہ طرز زندگی کیوں اپنایا' آپ کوئی باعزت جاب بھی کر سکتی تھیں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''بالکل کر سکتی تھی لیکن پھر میں نواب کی دسترس سے کیسے محفوظ رہتی۔ یہ گم نام زندگی میں نے اپنے لیے خود ہی چنی ہے' میں نے تو مر جانا ہی چاہا تھا لیکن مجھ جیسی بدنصیبوں کو بعض اوقات مانگنے سے موت بھی نہیں ملتی' سونچ گئی' یا بچا لی گئی۔ روڈ کراس کرتے ہوئے میری ٹکر ایک کار سے ہو گئی' کار مجھے مار کر تیزی سے بھاگ گئی اور میں زخمی حالت میں سڑک پر پڑی رہی' وہ برسات کی رات تھی' تب وہاں سے گزرنے والا ایک خدا ترس انسان مجھے وہاں سے اٹھا کر اسپتال لے گیا' میری ڈریسنگ کروائی اور جب اس نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے وہ مجھے میرے گھر چھوڑ کر آئے گا' تو میں خاموش رہی اور اس کی شکل دیکھتی رہی' سب کے لاکھ پوچھنے پر بھی میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی' تب وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا کہ شاید صبح تک میں ٹھیک ہو جاؤں۔

وہ خدا بخش گدھا گاڑی والا تھا اور صفورا اس کی بیوی تھی' یہ گھر ان دونوں ہی کا تھا وہ بوڑھے تھے اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی' خدا بخش گدھا گاڑی چلاتا تھا اور صفورا ایک دو گھروں میں کام کرتی تھی۔ میں ان ہی لوگوں کے ساتھ رہنے لگی پھر ان کے محبت بھرے رویے کو دیکھتے ہوئے ایک دن میں بول پڑی اور انہیں ایک جھوٹی کہانی سنا دی کہ میرے شوہر نے مجھے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے' میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنا لیا' وہ میرے آنے سے بہت خوش تھے میں نے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ میرا شوہر میری جان کا دشمن ہے' اس لیے محلے میں میرے بارے میں کسی سے اور کچھ مت کہنا' سوائے اس کے کہ میں تمہاری بھانجی ہوں۔ انہوں نے میری بات مان لی' وہ چاہتے تھے کہ میں شادی کر لوں لیکن میں نے انہیں بتایا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق نہیں دی ہے۔ جب تک وہ دونوں زندہ رہے میں گھر میں رہتی تھی بعد میں میں نے ان ہی گھروں میں کام شروع کر دیا جہاں مائی صفورا کام کرتی تھی۔ میں نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ میں تعلیم یافتہ ہوں' وہ لوگ مجھے بھی اپنی طرح ان پڑھ اور جاہل تصور کرتے تھے۔

''آپ کی ملاقات اور شادی پر علیحدگی کے اسباب کیا تھے' میں آپ سے وہ سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ بولیں۔

''تمہیں پتا ہے سطوت کی ایک بیوی میری طرح تعلیم یافتہ ہے۔ میں اور وہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ ہی پڑھتے تھے' اس کا تعلق سطوت کے خاندان سے تھا' قریبی نہیں دور پرے کا رشتہ تھا' سطوت ان دنوں بہت گڈ لکنگ تھا' اسے اچھا لباس پہننے کا شوق تھا' انداز گفتگو بہت نفیس تھا' اس سے گفتگو کرتے ہوئے ایک لمحہ کو بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس بظاہرہ ڈیسنٹ دکھائی دینے والے شخص کے اندر ایک درندہ چھپا بیٹھا ہے' اس کی آنکھوں میں دکھائی دینے والی چمک جو دیکھنے والوں کو اس کا گرویدہ بنا دیتی تھی ایک حیوان کی چمک تھی۔ وہ اپنے شکار کو بہت دور سے تاڑ لیتا تھا' میں کبھی کبھی اپنی دوست سے ملنے کے لیے اس کی کوٹھی میں جاتی تھی تو وہ مجھے خوش دکھائی نہیں دیتی' ہمیشہ سطوت کے برے رویے کی شکایت کرتی اور یہ بھی کہا کرتی کہ سطوت بہت تشدد پسند ہے' وہ

اس پر ہاتھ بھی اٹھاتا ہے' مجھے نفیسہ (سطوت کی بیوی) کی باتوں کو سن کر شدید حیرانی ہوتی' کبھی یقین بھی نہیں آتا تھا۔ سطوت پر تشدد پر اتر آنے کے دورے پڑنے کی جو وجوہات وہ بیان کرتی تھی وہ میرے دل کو نہیں لگتی تھیں۔ میں یہ محسوس کرتی کہ نفیسہ مجھ سے ساری حقیقت بیان نہیں کرتی ہے' میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو وجوہ نفیسہ میرے سامنے پیش کرتی ہے وہ کسی مرد کو تشدد پر کیسے اکسا سکتی ہے' بھلا اتنی سی بات پر کوئی بھی شوہر اپنی بیوی کے جسم پر اس طرح نیل کے نشان ڈال سکتا ہے۔

میں نے تو سطوت کو ہمیشہ ایک مہذب انسان کے روپ میں دیکھا تھا' اس لیے میں یہی سمجھتی رہی کہ نفیسہ کی اپنے شوہر سے بنتی نہیں ہے' اس لیے وہ میرے سامنے اس کی برائی کرتی رہتی ہے۔

ایک دن جب میں نفیسہ کی حویلی اس سے ملنے کے لیے گئی تو میں نے محسوس کیا کہ نفیسہ کا موڈ بہت آف ہے۔ وہ مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کر رہی تھی' خاصی اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جیسے وہ یہ چاہ رہی تھی کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلی جاؤں اور آئندہ اس کے ہاں نہیں آؤں' اس نے یہ کہہ کر مجھے یہ بات ظاہر کی کہ سطوت کو میرے ساتھ اس کا میل جول پسند نہیں ہے اور مجھے لے کر ان میں کئی مرتبہ جھگڑا ہو چکا ہے۔

''کیا واقعی ایسی بات ہے؟'' میں نے طنزاً کہا۔

''ہاں!'' اس نے بے رخی سے کہا۔ ''تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔'' اس نے تیکھے لہجے میں کہا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی' سطوت وہاں آ گیا' سطوت کو دیکھ کر نفیسہ بری طرح گھبرا گئی' سطوت نے مجھے دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا۔

سطوت کے اس طرح خوشی کے اظہار پر میں نے نفیسہ کو حیرت سے دیکھا تو وہ مجھ سے نگاہیں چرا گئی۔ تب سطوت نے نفیسہ کو یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ ''تم جا کر بہت اچھے سے کھانے کا اہتمام کرواؤ' آج روشن آراء ہمارے ساتھ ہی لنچ کریں گی۔'' نفیسہ یہ سن کر مجھے اور سطوت کو جلتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی چلی گئی۔

میری سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے' نفیسہ اپنے شوہر سطوت کے بارے میں مجھ سے مسلسل جھوٹ بول رہی ہے مگر سطوت کی باتوں سے ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ نفیسہ کے کمرے سے جانے کے بعد سطوت نے مجھ سے کہا۔

''روشن آراء مجھے آپ سے ایک ضروری ملاقات کرنی ہے' کیا آپ میرے لیے تھوڑا سا ٹائم نکال سکتی ہیں۔''

''ضروری ملاقات...... وہ کیوں......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''آپ ملیں تو' ملاقات ہو گی تو آپ کو پتا بھی چل جائے گا' لیکن ہاں ہماری اس ملاقات کے بارے میں نفیسہ کو علم نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اسے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ میں اس کے مقابلے میں آپ کی تعریف کرتا ہوں......''

''کیا واقعی......؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ اتنی ہی نادان ہیں کہ کسی مرد کی آنکھوں میں اپنے لیے پیدا ہونے والے جذبات نہیں پہچان سکتیں......؟'' اس نے ابرو اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''تو کیا نفیسہ کی مجھ سے ناراضگی کی یہی وجہ ہے...... وہ میری دوست ہے اور میں اپنی دوست کا گھر......!''

''جب دوست ہی کو اپنا گھر بچانے میں کوئی

دلچسپی نہیں ہے تو آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔'' سطوت نے میری بات کاٹ کر تیزی سے کہا تو میں خاموش ہو گئی۔

''کل رات آٹھ بجے شیرٹن میں سوئیٹ نمبر پانچ سو آٹھ میں' میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔ میں بھی کھانے کے لیے نہیں رکی اور نفیسہ سے کام کا بہانہ کر کے گھر لوٹ آئی۔

میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا' صرف ایک بڑی بہن تھی' جس کو دن رات میری شادی کی فکر تھی اور وہ میرے لیے کوئی پڑھا لکھا لڑکا تلاش کر رہی تھی۔

میں ساری رات سو نہیں سکی' سطوت کی باتیں اس کی آنکھیں' اس کی آواز اس کا لہجہ سب رات بھر مجھے گدگداتا رہا' پتا نہیں کیا بات تھی یا شاید میرے اندر خود بخود ہی سطوت کی چاہت کا بیج پھوٹ نکلا تھا۔

اس رات جب میں سطوت سے ملنے گئی تو اس نے مجھ سے اپنی بے تابیوں کا اظہار کرتے ہوئے اپنی مظلومیت کا رونا بھی رو دیا اور یہ بھی بتایا کہ اس کے اور نفیسہ کے درمیان جھگڑے کی اصل وجہ میری ذات ہے۔ وہ میرے عشق میں سرتا پیر ڈوب چکا ہے' اس نے نہایت بے چارگی سے اپنا سر میز پر پٹختے ہوئے کہا کہ ''کاش وہ نفیسہ سے شادی سے پہلے ہی مجھ سے مل لیتا تو اس کی زندگی دن رات یوں کانٹوں پر نہ بسر ہوتی۔''

''کیا تم اس حال میں کہ میں نفیسہ کو طلاق نہیں دے سکتا' تم مجھ سے شادی کر سکتی ہو......؟'' اس نے میرا ہاتھ تھام کر گلوگیر لہجے میں پوچھا۔

''آپ نفیسہ کو طلاق کیوں نہیں دے سکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ میری خاندانی بیوی ہے اور صرف تم سے شادی کا بہانہ بنا کر میں اسے چھوڑ نہیں سکتا' تم اگر تھوڑا سا صبر کر لو اور میرا ساتھ دو تو بعد میں میں ایسا کر سکتا ہوں۔'' اس نے اپنی آنکھوں میں ...... چمک لا کے کہا۔

''نفیسہ تو ہر لمحے مجھ سے آپ کی شکایتیں کرتی رہتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ مار پیٹ کرتے ہیں' اس کے والدین سے اسے ملنے نہیں دیتے اس کے کہیں تنہا آنے جانے پر پابندی لگاتے ہیں' کیا یہ سب صحیح ہے......؟'' میں نے اس کی چمک دار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو اس نے صرف اتنا کہا۔

''اگر تمہارا دل ان سب فضولیات پر یقین کرنا چاہتا ہے تو تم یقین کر سکتی ہو۔ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔'' اور میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

''لیکن......؟'' میں تھوڑا جھجکی۔

''لیکن کیا......؟'' وہ تیزی سے بولا۔

''میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ اپنے والدین سے حقیقت میں نہیں ملتی اگر آپ نے پابندی نہیں لگائی تو......''

''ہاں یہ تم کہہ سکتی ہو' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے گھر والے اور رشتہ دار اپنے بہت سے ناجائز کام مجھ سے نکلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور تم جانتی ہو کہ معاشرے میں' میں نے یہ عزت اور مقام یوں ہی تو نہیں بنایا ہے' جب میری عزت پر بنتی ہے تو میں کہتا ہوں' ایسے لوگوں سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔'' اس نے توجیہہ پیش کی جو میرے دل کو لگی۔

پھر ہماری ایسی خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہیں' ہر ملاقات میں وہ ایک نفیس انسان بن کر ملتا رہا' ہمارے درمیان زیادہ تر ان ہی معاملات پر ڈسکس ہوتی تھی۔ وہ اس طرح بات کرتا تھا کہ میرے سامنے وہ تعقل پسند اور ہمدرد انسان کے روپ میں سامنے آیا۔

میں اس سے باآسانی کہہ دیتی تھی کہ یہ کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ وہ میری رائے سننے کے لیے آمادہ نظر آتا اور اکثر میرے مشوروں پر عمل کرتا' وہ کسی کمپلیکس کا مارا انسان نہیں تھا۔ اس کے اختیار میں بہت کچھ تھا' میں اس کی بے قراری کو محسوس کررہی تھی اور نفیسہ کے بارے میں' میں نے سوچا کہ جب اس نے یہ محسوس کرلیا کہ اس کا شوہر اس سے بے زار ہوکر کسی اور ساتھی کی تلاش میں ہے تو اسے اس کی ناز برداریاں کرنی چاہیے تھیں لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ خود دل بُرا کرکے الگ الگ رہنے لگی اور میں اس کی نااہلی کی قائل ہوگئی۔

میرا ذہن دن رات ان دونوں کے تجزیوں کی زد میں رہنے لگا' میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں سطوت کا خیال رہنے لگا ہے' میں نے ناقدانہ انداز میں اپنے ذہن اور دل کو ٹٹولا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید مجھے سطوت جیسے انسان ہی کی تلاش تھی' میں اپنے لیے ایسا ہی جیون ساتھی چننا چاہتی تھی اور پھر مجھے یقین ہو چلا کہ میں ہی وہ عورت ہوں جو سطوت کے دل و دماغ پر حکمرانی کرنے کے لائق ہے۔

ہمارے درمیان اقرار اور قول و قرار ہوگئے' اب میں ان چوری چوری کی ملاقاتوں سے گھبرانے لگی اور چاہتی تھی کہ سطوت مجھ سے شادی کا ارادہ ظاہر کرے اور لوگوں کو بھی بتادے۔

اب میرا بننا سنورنا صرف سطوت کے لیے تھا' میں اس سے ملنے جاتی تو بہترین لباس زیب تن کرتی اور جب وہ نظر بھر کر میری جانب دیکھتا تو میں آپ ہی آپ اترا جاتی۔ اس کی آنکھوں سے میرے لیے ہر وقت تحسین جھلکتی رہتی۔

اس کے ساتھ میرا تعلق پروان چڑھ رہا تھا۔ میں اب بھی اس کی ذات کی ان پرتوں کو کھولنا چاہتی تھی' دیکھنا چاہتی تھی جنہیں ابھی اس نے عیاں نہیں تھا۔ مجھے نے محسوس کیا کہ میں اس کی ہر خواہش احترام کرنے لگی ہوں' وہ جیسا بھی ہے میرے دل نے اسے قبول کرلیا تھا۔ کوئی چیز بھی جو مجھ سے وقت کہتی رہتی تھی کہ ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں۔

ایک دن اس نے اپنے ایک دوست کے گھر پارٹی میں مجھے مدعو کیا' جو کلفٹن میں ایک بہت وسیع و عریض کوٹھی میں تھی' سطوت نے مجھے رات گیارہ بجے وہاں بلایا تھا' میری بہن اور بہنوئی نے مجھے وہاں جانے سے روکا بلکہ وہ تو سطوت سے میرے خفیہ تعلقات پر بھی برہم تھے لیکن میں تو صرف اپنے دل کی سنتی تھی' ایسا بھلا! کیسے ممکن تھا کہ میں سطوت کی بات ٹال دیتی۔

میں نے رائل بلو کلر کی مہین شیفون کی ساڑھی زیب تن کی' ساڑھی سطوت کا پسندیدہ لباس تھی' آج میں نے اس کے لیے خود کو خوب سجایا اور سنوارا' میں مقررہ وقت پر اس کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئی۔

وہاں کا ماحول رومان آفرینی کے لیے بے حد سازگار تھا۔ وہاں ایک چکیلے فرش والی ایک عجوبہ رقص گاہ بنی ہوئی تھی۔

میں وہاں پہنچی تو مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک عود آئی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آیا۔ مصمم ارادے کے ساتھ...... مجھ سے کہنے لگا۔

"آؤ میرے ساتھ رقص کرو......"

"رقص......" میں نے شرم اور جھجک کے ساتھ کہا۔ "مجھے رقص نہیں آتا۔"

"جب میں تمہارے ساتھ ہوں پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے...... تم صرف میری بانہوں کا سہارا لے لو' باقی سب میں سنبھال لوں گا......" اس کی آنکھوں میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ میں خود بخود اس

بانہوں میں سما گئی۔

سطوت نے ایک آہستہ خرام دھن کا انتخاب کیا تھا اس کی خواہش تھی کہ میں جان لوں کہ وہ مجھ پر تصرف حاصل کرچکا ہے۔ تصرف اور ملکیت ہم معنی لفظ ہیں۔ اس نے بڑے اعتماد سے ایک ایسے کوچے میں قدم رکھ دیا تھا جہاں کسی اور کو آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بھی مزاحمت نہیں کی' وہ کتنے رومان پرور اور کیف آگیں لمحے تھے۔ وہ مجھے اپنی بانہوں میں تھامے مجھے اپنے سینے سے لگائے پیار بھری سرگوشیاں کررہا تھا' اچانک ہی اس نے سرگوشی میں میرے کان میں کہا۔

"مجھ سے شادی کروگی؟"

یہ سن کر مجھ پر تو جیسے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ ہمیں اس بات کا قطعی احساس نہیں رہا کہ اس رقص گاہ میں اور بھی جوڑے ہیں جو رقص میں مصروف ہیں لیکن ہماری جیسی کیفیت کسی اور کی نہیں تھی۔ وہ سب کے سامنے نہایت والہانہ انداز میں میرے چہرے کو چوم رہا تھا' نرمی سے پیار سے محبت سے اور میں شرم سے پانی پانی ہوتی جارہی تھی۔

وہ مجھے سہارا دے کر گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ وہ خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ پورے آٹھ ماہ سے شاید وہ جس کام پر لگا تھا اس کی تکمیل ہوگئی تھی۔ ہمارے درمیان کسی قیامت کا جذب باہم تھا۔

وہاں موجود سارے لوگوں کو ہمارے تعلقات کی خبر ہوگئی۔ ہمارے خفیہ معاہدے پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی تھی۔ ہم ایسی دیوانہ وار محبت میں مبتلا ہوگئے تھے کہ تمام احتیاط' اخلاقیات اور تمیز داری کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔

پھر ہم نے شادی کرلی' مجھ سے شادی کے بعد سطوت نے مجھے ایک علیحدہ بنگلے میں رکھا' میری بہن اور بہنوئی نے مجھے بہت سمجھایا کہ مجھے سطوت سے شادی نہیں کرنی چاہیے لیکن میرے سر پر تو اس کے عشق کا بھوت سوار تھا' بعد میں' میں نے سنا کہ سطوت نے نفیسہ کو طلاق دے دی ہے اور وہ بنگلہ خالی ہے تب سطوت مجھے اس بنگلے میں لے گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"تم جانتی ہو کہ میں عزت کے کس مقام پر ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ تم عام لوگوں سے قطعی میل جول نہ بڑھاؤ' حد یہ کہ اپنی بہن اور بہنوئی کو بھی چھوڑ دو...... میری خاطر...... میں جانتا ہوں کہ وہ میری اور تمہاری شادی کے خلاف تھے اور میں اپنے اور تمہارے درمیان کسی ایسے شخص کا تعلق رکھنا نہیں چاہتا جو کسی بھی طرح تمہیں میرے خلاف بھڑکائے۔"

اور میں نے اس کی اس خواہش پر سر تسلیم خم کردیا' میں نہیں چاہتی تھی کہ جس طرح نفیسہ نے اپنا گھر برباد کرلیا ہے' میں بھی کرلوں

میں آج بھی اس بات پر حیران ہوتی ہوں کہ مجھے سطوت کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور مجھے دعویٰ تھا کہ میں اسے اچھی طرح جانتی اور پہچانتی ہوں...... آہستہ آہستہ اس کی ذات کے پتے میرے آگے کھلتے چلے گئے اور میں ہر پتا پڑھنے کے بعد حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوجاتی۔

مجھے اب نفیسہ کی باتوں پر یقین آنے لگا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا' وحشی' جنگلی' درندہ...... خلوت کے لمحات میں وہ مجسم حیوان بن جاتا' میرے ساتھ انتہائی شرمناک سلوک کرتا' میں سسکیاں لیتی تو اسے لذت اور تسکین حاصل ہوتی اور صبح ہوتے ہی وہ پھر سے انسان بن جاتا' اپنے سابقہ رویئے کی معافیاں مانگنے لگتا۔ میرے آگے ہاتھ تک جوڑ دیتا' آنسو بہاتا اور میری خوشامد کرتا کہ تم مجھے چھوڑ کر کبھی مت جانا' میں تم

سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اگر تم نے مجھے چھوڑا تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا' مر جاؤں گا۔

اور اپنی شادی اپنے گھر کو بچانے کے لیے میں سب کچھ سہتی رہی' اس کا ہر کہا مانتی رہی۔ وہ کئی کئی دن کے لیے غائب ہو جاتا اور میں تنہا راتوں کو بلکتی اور سسکتی رہتی۔

اس نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ نفیسہ کے علاوہ اور کتنی شادیاں کر چکا ہے' میرے علم میں تو صرف یہ تھا کہ اس نے نفیسہ سے شادی کی تھی اور پھر میری خاطر اسے طلاق بھی دے دی۔

ان دنوں میری طبیعت گری گری سی رہنے لگی' سطوت کو گئے ہوئے پورے پندرہ دن ہو گئے تھے' مجھے اس کی کوئی خیر خبر نہیں تھی' میں نے اس گارڈ سے پوچھا جو بنگلے کے گیٹ پر ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔

"سطوت کہاں ہیں......؟" تو اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

"ہمیں ان کے شیڈول کا کوئی علم نہیں ہوتا' ہمیں تو آنکھیں کھول کر اپنی ڈیوٹی نبھانے کی ذمہ داری دی گئی ہے اور اگر اس ذمہ داری میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو میری گردن بھی اڑ سکتی ہے۔"

"ذمہ داری......؟" میں بُری طرح چونک گئی۔

"تمہاری کیا کیا ذمہ داریاں ہیں؟"

"یہی کہ نہ تو اس گیٹ سے کوئی باہر قدم نکالے اور نہ ہی کوئی اندر آئے......" اس نے کہا اور دوسری جانب منہ پھیر لیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا...... کیا میں یہاں قید ہوں۔" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"پلیز آپ اندر جائیں' زیادہ سوالات مت کریں۔ کیوں مجھ غریب کی نوکری اور جان کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا تو میں اندر آ گئی۔

میرے پاس فون بھی نہیں تھا اور نہ ہی اور کوئی ذریعہ کہ میں سطوت کے بارے میں معلوم کرتی۔

مجھے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی' میں نے محسوس کیا کہ میرے وجود میں کوئی اور چیز پل رہی ہے۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی میرا دل خوشی سے ناچ اٹھا اور میں شدت سے سطوت کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ گھر میں کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں تھا' اس لیے مجھے کسی بھی بات کی پریشانی نہیں تھی' ہفتے بعد ایک آدمی آتا اور کھانے پینے کا ڈھیروں سامان دے کر چلا جاتا' گھر میں ایک ملازمہ بھی تھی جو دن رات میرے ساتھ رہا کرتی تھی۔

اس روز جب وہ آدمی راشن لے کر آیا تو میں نے عشرت جو ملازمہ تھی اس سے کہا کہ اس آدمی سے جا کر نواب صاحب کے بارے میں پوچھے' تو اس نے جب اس آدمی سے نواب صاحب کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہیں تو اس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا کہ اسے کچھ نہیں معلوم' اسے تو بس یہ آرڈر دیا گیا ہے کہ فلاں فلاں سامان جا کر دے آؤ' اس کے علاوہ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بولو میں وہ بھی دے جاؤں گا' عشرت نے مجھے اس شخص کی بات بتائی اور پوچھا کہ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

عشرت بھی بہت ڈری اور سہمی ہوئی رہتی تھی' اس نے کبھی مجھ سے زیادہ بات کرنے کی کوشش نہیں کی بس چپ چاپ کام میں لگی رہتی اور کام ختم ہو جاتا تو خاموشی سے آ کر بیٹھ جایا کرتی' کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس نے مجھے روتے ہوئے دیکھا اس نے کئی بار مجھ سے رونے کا سبب معلوم کرنے کے لیے اپنے لب کھولے پھر خاموش ہو گئی۔

پورا ڈیڑھ ماہ بیت گیا' تب اچانک ہی سطوت آ گئے' ان کی آمد کی اطلاع سن کر مارے خوشی کے میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے' میں بہت کمزور ہو گئی تھی حالاں کہ گھر میں کھانے پینے کی ہر شے وافر مقدار میں تھی لیکن میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا' میرے وجود میں پلنے والی ننھی سی جان کو پورے تین ماہ ہو چکے تھے۔

سطوت کو دیکھ کر میری آنکھوں سے تیزی سے آنسو بہنے لگے تو سطوت نے اپنے سابقہ مخصوص انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے جانِ سطوت! تم رو کیوں رہی ہو؟"

"آپ کہاں غائب ہو گئے تھے سطوت! نا میری کوئی خبر لی نہ اپنی دی۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی تھی۔" میں نے ان کے پیار بھرے لہجے سے بہل کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ارے بابا! میں تو تمہاری ساری خبر رکھتا تھا' رہی میرے نہ آنے کی بات تو مرد کو ہزاروں کام ہوتے ہیں۔ زمینداری کے بہت کھڑاک ہوتے ہیں۔ انسان کو بعض اوقات بہت سے معاملات خود دیکھنے پڑتے ہیں۔"

"پھر بھی......!" میں نے شکوہ کناں نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"پھر بھی کیا...... بولو......!" سطوت نے تیز لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گئی۔

عشرت نے میری ہدایت پر جلدی جلدی لنچ تیار کیا' سطوت نے میرے ساتھ ہی لنچ کیا اور کہا کہ "اب میں چلتا ہوں۔"

"ارے...... ابھی تو آئے تھے' ابھی جانے کی بات بھی کرنے لگے۔" میں نے اضطراری کیفیت میں کہا' ابھی تو میں نے سطوت کو باپ بننے کی خوش خبری بھی نہیں سنائی تھی' میں چاہتی تھی کہ رات کو ہم جب اپنے بیڈ روم میں جائیں گے تب میں بڑے رومانوی انداز میں سطوت کو یہ خبر سناؤں گی' کیوں کہ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتی تھی کہ نفیسہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی تو لازمی بات ہے جب مجھ سے انہیں یہ خوشی ملے گی تو وہ خوشی سے نہال ہو جائیں گے۔ "آپ سے ایک بات کہنی تھی سطوت......!" میں نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں بولو!" سطوت نے میری جانب دیکھے بغیر کہا' وہ اپنے موبائل فون پر کچھ تلاش کر رہے تھے یا پھر کوئی میسج ٹائپ کر رہے تھے۔

"پہلے آپ یہ فون رکھیں میں پھر بتاؤں گی۔" میں نے ان کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"واٹ نانسینس!" وہ آنکھیں نکال کر دہاڑے۔

"ادھر دو فون!"

"آپ میری بات تو سنیں۔" میں نے ان کے غصے کی پروا بھی نہیں کی' کیوں کہ میں جانتی تھی کہ میری بات سن کر وہ سارا غصہ بھول جائیں گے اور شاید پھر میرے پاس سے جائیں ہی نہیں۔

"جلد کہو کیا بات ہے' میرے پاس بالکل ٹائم نہیں ہے۔" انہوں نے ناگواری اور بے زاری سے کہا۔

"آپ ڈیڈی جی بننے والے ہیں۔" میں نے پیار سے ان کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر کہا۔

"واٹ......!" انہوں نے ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ تیزی سے جھٹک دیئے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے' جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

"یہ کیسے ہو گیا......!" انہوں نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"ویسے ہی جیسے ہوتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں......!" انہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔
"نہیں نہیں..... ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"
"کیوں نہیں ہونا چاہیے تھا سطوت! یہ ہمارے پیار کی نشانی ہے' ہماری ہونے والی اولاد ہے' آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں کتنی خوش ہوں۔" میں نے حیرت اور مایوسی سے کہا۔
"لیکن میں خوش نہیں ہوں اور مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے' بہتر یہی ہے کہ تم اسے ختم کردو۔" سطوت نے نہایت سفاک لہجے میں کہا۔
"نہیں سطوت......!" میں نے خوف زدہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ لیے۔ "میں ہرگز ایسا نہیں کروں گی۔"
"تمہیں ایسا کرنا پڑے گا احمق عورت..... تم سمجھتی کیوں نہیں ہو مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے۔" سطوت نے غصے میں میرے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر شدید غضب کے عالم میں کہا۔
"آخر کیوں......؟ آپ کی تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے پھر آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ اولاد ہو جاتی ہے تو انسان کا شادی کرنے کا مقصد حل ہو جاتا ہے۔" میں نے تکلیف کی شدت سے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔
"میری اولاد ہے......" یہ الفاظ نہیں تھے ایٹم بم کا دھماکا تھا جو سطوت نے میرے سامنے کر دیا اور اس کی دھمک سے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا' کتنی دیر تو میں گم سم سطوت کی شکل دیکھتی رہی' میرے دماغ میں ایک ہی بات آرہی تھی کہ سطوت کی میری اور نفیسہ کے علاوہ کوئی اور بیوی موجود ہے۔
سطوت نے مجھے زور سے دھکا دے کر میرے بال چھوڑ دیئے اور میں نیچے گر گئی' میں کتنی دیر زمین پر پڑی کراہتی رہی' میرے پہلو میں بہت زور کا درد اٹھا تھا اور اس لمحے بھی مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ سطوت آگے بڑھ کر مجھے اٹھائیں گے اور اپنے رویئے کی مجھ سے معافی مانگیں گے لیکن میری یہ خوش فہمی سطوت نے جلد ہی رفع کر دی اور چیخ کر کہا۔
"اب اٹھ بھی جاؤ' کب تک یوں ہی پڑی رہوگی۔"
"سطوت! مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔
"اچھا ہے' گھر میں ہی "معاملہ صاف" ہو جائے گا۔" سطوت نے کہا تو میں خود ہی اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور پوچھا۔
"آپ کی میرے علاوہ بھی کوئی اور بیوی ہے؟"
"ہاں ہے تو......؟" سطوت نے کہا۔
"کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ آپ کے کتنے بچے ہیں اور یہ بات آپ نے پہلے تو مجھے نہیں بتائی تھی۔" میں نے اپنے ذہن میں اُڈ آنے والے سارے سوالات ایک ساتھ کر ڈالے۔
"ضروری نہیں ہے کہ جس کو بیوی بنایا جائے اس کو اپنی ہر بات بتادی جائے اور پھر میں تو مرد ہوں۔ مرد تو ایک وقت میں چار چار شادیاں کر سکتا ہے' میں نے کر لی تو کیا بُرا کام کیا۔ کیا شرع میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت نہیں ہے۔"
"جی ہاں ہے اور آپ جیسے مردوں کو اپنے مطلب آوری کے لیے ہی شرع یاد رہتی ہے اور دوسرے کام بھی شرع کو سامنے رکھتے ہوئے بھی کیا کریں تو جانوں......" میں نے تلخی سے کہا۔
"شٹ اپ...... بڑی زبان چلنے لگی ہے' آئندہ اگر میرے سامنے زبان چلائی تو کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دوں گا' سمجھیں......!" سطوت نے اٹھ کر ایک الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر جڑتے ہوئے کہا اور سطوت

کے زوردار تھپڑ سے میں صوفے پر پیچھے پلٹ گئی' لیکن میں تیزی سے اٹھی اور بولی۔
"آپ کی یہ بیوی کون ہے اور کہاں ہے؟"
"وہ حویلی میں ہے اور میرے چچا کی بیٹی ہے' میری دو بیٹیاں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میری اولاد کسی اور خاندان سے ہو' وہ ہمارا خون ہے' ہم سجادہ نشین ہیں' سید ہیں اور ہمارے خون میں دوسرے خون کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ میرے بابا جان کا حکم تھا کہ شادیاں چاہے کتنی ہی کر لو لیکن اولاد کسی اور خون سے پیدا کر کے اپنا خون خراب مت کرو' اس لیے روشن آراء بیگم تمہیں یہ بچہ تو ضائع کرنا پڑے گا۔" سطوت نے نہایت ڈھٹائی سے اعتراف کرتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔
"آپ کا خون آپ کی نسل خراب ہو جائے گی' اس بات کا خیال آپ کو عیاشیاں کرنے سے پہلے آنا چاہیے تھا' اب چاہے کچھ بھی ہو جائے میں یہ بچہ ضائع نہیں کروں گی' آپ مرد ہیں آپ کا دل اپنی اولاد کے لیے پتھر ہو سکتا ہے لیکن میں ایک ماں ہوں اور ماں کبھی اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کا خون نہیں کر سکتی۔" میں نے سطوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تن کر جواب دیا۔
میرا جواب سن کر سطوت کا دماغ پھر گیا اور اس نے مجھے بے تحاشہ مارنا شروع کر دیا' حد یہ کہ اس ظالم انسان نے میرے پیٹ پر لاتیں بھی ماریں اور خوب مار چکنے کے بعد وہ غصے میں بھناتا ہوا گھر سے چلا گیا۔
سطوت کے جاتے ہی عشرت بھاگ کر میرے پاس آئی اور اس نے مجھے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا اور میرا خیال رکھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ عورت تھی اس سے جو کچھ بھی ہو سکا وہ اس نے میرے لیے کیا اور میرا خیال رکھا اور اللہ کا شکر ہوا کہ سطوت کے اتنے تشدد کے باوجود میرا بچہ محفوظ رہا۔
ایک ہفتے کے بعد وہ دوبارہ میرے پاس آیا اور بڑے پیار سے میرا حال پوچھا۔ اس کا رویہ ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ میرے سامنے وہی مہذب اور پیار کرنے والا شوہر دکھائی دے رہا تھا۔ میری طبیعت ابھی تک بالکل ٹھیک نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے میں بیڈ پر ہی لیٹی تھی۔ اس نے خود بخود ہی سمجھ لیا

ادھر نہ دیکھو

ادھر نہ دیکھو
کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمت کے مدعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں
صدق و ایمان کی آزمودہ پرانی تلوار مڑ گئی ہے
ادھر نہ دیکھو
جو کج کلاہ صاحب چشم تھے
جو اہل دستار محترم تھے
ہوس کے پر پیچ راستوں میں
کلاہ کسی نے گروی رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی ہے
ادھر نہ دیکھو
جو اپنے درخشاں لہو کے دینار
مفت بازار میں لٹا کر
لحد میں اس وقت تک غنی ہے
ادھر نہ دیکھو
جو حرف حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے اوجھل ہوگئے
اور اہل جہاں میں اس وقت تک نبی ہیں
فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال

کہ اس کے اتنے زیادہ تشدد کرنے کے بعد میں اپنے بچے سے محروم ہوگئی ہوں گی۔

"اس دن میں نے تمہیں جو کچھ بتایا اس سے تم ناراض تو نہیں ہو۔ اب تم ہی دیکھ لو کہ میں تمہارے ساتھ کتنا فیئر ہوں اور تم سے کتنی محبت کرتا ہوں کہ تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا مجھے بھی افسوس ہے اور یہ افسوس اس بچے کے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے ہے کہ تمہیں اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ اگر تم میرے ساتھ اسی طرح چلتی رہو جس طرح سے میں کہتا ہوں تو سب ٹھیک رہے گا تم میرے دل کی یوں ہی رانی بنی رہو گی۔ اگر ہمارے درمیان بچہ آئے گا تو تمہاری توجہ اور محبت اس کی جانب ہوجائے گی اور میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرسکتا۔"

"اگر وہ بیٹا ہوتب بھی۔" میں نے خاموشی سے اس کی ساری بات سننے کے بعد سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بیٹا......" وہ چونک کر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

"ہاں بیٹا۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"ہمارے ہاں بیٹا ہونے والا تھا۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلانے کی کوشش کی۔

"اگر بیٹا ہوتا تو میں تمہیں سونے میں تول دیتا۔ تمہیں مہارانی بنا کر اپنی حویلی لے جاتا۔" اس کی آنکھوں کی مخصوص چمک بڑھ گئی۔ پھر افسردگی سے بولا۔ "لیکن اب کیا ہوسکتا ہے اب تو سب کچھ ہی ختم ہوگیا۔ تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں یاد دلائی۔"

"ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے سطوت' عشرت نے سب کچھ سنبھال لیا تھا وہ بہت سمجھدار عورت ہے۔" میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا؟" اس نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ بات کس طرح کنفرم ہوگی کہ بیٹا ہی ہے۔" اس نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"میرا دل کہتا ہے اور عشرت بھی کہہ رہی تھی کہ اگر بیٹی ہوتی تو حمل ضائع ہوجاتا بیٹی کا حمل نازک ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ لڑکے کا حمل ہے۔ اس لیے بچ گیا مرد کو اللہ تعالیٰ نے مضبوط اور طاقت ور جو بنایا ہے۔"

میں نے اس سے جھوٹ بولا کیونکہ عشرت نے مجھے اس کے برعکس بات بتائی تھی کہ لڑکے کا حمل نازک ہوتا ہے عورت ذات بہت ڈھیٹ اور سخت جان ہوتی ہے۔ اس لیے سب کچھ برداشت کر جاتی ہے۔ بی بی آپ کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوگی۔ لیکن اگر آپ اپنی اور اس بچے کی زندگی چاہتی ہیں تو نواب صاحب سے جھوٹ بول دیں اور انہیں بیٹے کا آسرا دیں میں چونکہ حویلی میں ملازم تھی اس لیے جانتی ہوں کہ بڑی بی بی اور نواب صاحب کو بیٹے کی بڑی آرزو ہے بیٹا ہی تو ان کے بعد ان کا وارث ہوگا۔

میں نے عشرت کا پڑھایا ہوا سبق دہرا دیا اور سطوت موم ہوگیا۔ چند لمحوں تک وہ بیٹے کے تصور کو لے کر مسکراتا رہا پھر تیور بدل کر بولا۔

"ایک بات یاد رکھنا روشن آراء کہ مجھے صرف بیٹا چاہیے۔ صرف بیٹا' لیکن اگر غلطی سے بھی بیٹی پیدا ہوگئی تو تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنا ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے سطوت۔" میں نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا اور مجھے اس طرح یقین کی حالت میں دیکھ کر وہ بھی شاید مطمئن ہوگیا اور وہ ان مردوں میں سے تھا جنہیں اپنے مرد ہونے پر بڑا فخر اور ناز ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے عشرت کی بات کا اس نے یقین کرلیا کہ مرد پیدائشی طور پر طاقتور ہوتا ہے۔ اب مجھے یہ تو حتمی طور پر معلوم نہیں تھا کہ میرے

وجود میں کیا پل رہا ہے۔ لڑکا ہے یا لڑکی لیکن میں اس بات سے خوش تھی کہ سطوت کو فی الحال میں نے قابو میں کرلیا ہے۔

"تم ایسا کرنا کہ عشرت کے ساتھ اسپتال ہوآنا اور اپنا چیک اپ کروالینا یا پھر چھوڑو۔ تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں لیڈی ڈاکٹر کو تمہارے چیک اپ کے لیے گھر بھیج دوں گا۔ وہ تمہیں دوائیں اور ٹانک وغیرہ لکھ دے گی وہ تم پابندی سے لیتی رہنا تم کافی کمزور لگ رہی ہو۔" سطوت نے کہا اور میں نے مسرور ہوکر اپنا سر اس کے کندھے سے لگا لیا۔

دوسرے دن شام کو لیڈی ڈاکٹر آئی اس نے بتایا کہ میرے اندر خون کی بہت کمی ہے۔ اس نے مجھے پھل اور دودھ استعمال کرنے کی ہدایت کی اور کچھ دوائیں بھی دیں۔

میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق پورا عمل کر رہی تھی۔ میں صحت مند رہنا چاہتی تھی اور صحت مند بچے کو جنم دینا چاہتی تھی اگر بیٹا ہوا تو مجھے کوئی فکر نہیں تھی لیکن بیٹی ہونے کی صورت میں مجھے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بچے کی ولادت میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ سطوت وقتاً فوقتاً میری خیریت معلوم کرنے کے لیے میرے پاس آتا رہتا تھا۔ اس روز جب وہ آیا تو اس نے بتایا کہ وہ غیر ملکی دورے پر جارہا ہے اور اسی روز اس نے مجھے کچھ ایسی چیزیں دیں جنہیں دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ اس کے پاس ایک سفید رنگ کے پتھر کا چوکور ٹکڑا تھا جس کے درمیان میں سیاہی سے کچھ لکھا تھا یا کوئی نشان تھا۔ اس نے بتایا کہ ان کا خاندانی تعویذ ہے۔ جو پیدا ہوتے ہی بچے کے گلے میں پہنا دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سونے کی چھوٹی سی اسٹک تھی بالکل ایسی جیسے بوڑھے لوگ سہارے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس اسٹک پر ہینڈل کی جانب دو شیر بنے ہوئے تھے۔ تیسری چیز قیمتی پتھروں سے جڑاؤ ایک سونے کا تاج تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ تاج اس کی ماں نے پیدائش کے بعد اسے پہنایا تھا۔ اب یہ بیٹے کے سر پر سجے گا میرے لیے بھی وہ قیمتی پتھروں کا جڑاؤ نیکلس لایا وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا میں نے خوش ہونے کی وجہ پوچھی تو وہ بولا کہ میری ماں نے رات ایک خواب دیکھا تھا اس نے اس خواب کی تعبیر ایک مولانا سے پوچھی تو اس نے بتایا کہ سطوت کے ہاں بیٹے کی ولادت ہونے والی ہے۔ میری ماں یہ سن کر بہت خوش ہوئی ہیں اور میری بیوی بھی۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تمہارے ذریعے مجھے بیٹے کی خوش خبری ملنے والی ہے۔"

میں نے وہ چیزیں سنبھال کر رکھ تو لیں لیکن میں اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی کہ اگر بیٹی ہوئی تو......!" اور اس تو کے آگے میں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی مجھے جھرجھری آجاتی اور میرا جسم کانپنے لگتا تھا۔

سطوت کو گئے دو دن ہی ہوئے تھے کہ اچانک گیٹ پر کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں یہ سن کر بری طرح چونک اٹھی کہ کون آ گیا۔ سطوت کے علاوہ صرف لیڈی ڈاکٹر آتی تھی اور یہ ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ سطوت غیر ملکی دورے پر گئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر بھی ایک دن پہلے ہی ہوکر گئی تھی۔

پھر مجھے گارڈ کی کسی کے ساتھ بحث کرنے کی آواز آئی پھر ایک عورت کے زور زور سے بولنے کی وہ گاڑی سے اتر کر گارڈ کو دھکا دے کر اندر آ گئی۔

عشرت نے دروازہ کھولا تو نفیسہ کو کھڑا پایا۔ مجھے نفیسہ کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ کس طرح آ گئی۔

سطوت نے اسے آنے کی اجازت کیونکر دے دی۔

”میں تمہیں مبارک باد دینے کے لیے آئی ہوں سنا ہے تم سطوت کو وارث دے رہی ہو۔ ایسا کیسے ہوگیا اور سطوت نے اپنے سید خون میں کمتر خون کی آمیزش کو کیسے برداشت کرلیا۔ مجھے تو تین بار وہ یہ دکھ دے چکا ہے کیا یہ بات کنفرم ہے کہ تم بیٹا جنو گی اور اگر کنفرم ہے تو کیسے کنفرم ہوا؟“ اس نے آتے ہی میرے جسم پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی اور کہا۔

”میں تمہیں کچھ بھی بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“ میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

”ناراض تو مجھے تم سے ہونا چاہیے کہ تم نے میرا گھر اجاڑ دیا اور میرے شوہر کو ہتھیا لیا الٹا تم مجھ سے بے رخی سے بات کررہی ہو۔“ نفیسہ نے کہا۔

”میں نے کسی کا شوہر نہیں ہتھیایا ہے اور نہ ہی میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہیں طلاق دے دے۔ سطوت خود میرے نزدیک آئے وہ تم سے مطمئن نہیں تھے اس لیے محبت کا پیاسا محبت کے پانی سے لبریز کنویں کی جانب بھاگتا ہے اور میں نے بھی کوئی جلدی ان سے شادی نہیں کرلی تھی بہت سوچ بچار کے بعد ان کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔“ میں نے سابقہ لہجے میں کہا۔

”سب سے پہلے تو میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کردوں کہ سطوت نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ اس نے مجھے طلاق نہیں دی ہے بلکہ وہ مجھے اپنی حویلی میں واپس لے گیا ہے۔ میں اس کے خاندان کی ہوں لیکن ہمارا ددھیالی نہیں ننھیالی رشتا ہے ذرا اس کی حویلی میں جاکر اس کا حرم خانہ دیکھو جہاں بہت سی جوان اور حسین لڑکیاں موجود ہیں۔ سطوت کو جو پسند آجاتی ہے وہ اس سے نکاح کرلیتا ہے اور جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو اسے حویلی لے جاکر اپنے حرم میں ڈال دیتا ہے۔ طلاق دے دیتا ہے اور طلاق ہوجانے کے باوجود وہ عورت آزاد نہیں ہوتی۔ بلکہ حویلی کی اونچی فصیلوں میں قید کردی جاتی ہے۔ مسٹر سطوت شرع کے بہت پابند ہیں۔“ اس نے گہرے طنزیہ لہجے میں کہا وہ ایک وقت میں چار بیویاں ہی اپنے نکاح میں رکھتے ہیں میرے اور تمہارے علاوہ انہوں نے ایک نامی گرامی طوائف سرمئی بائی سے بھی نکاح کررکھا ہے اور آج کل اس پر دل جان سے مہربان ہیں۔ اس پر دن رات نوازشات کی مہربانیاں ہیں۔ سنا ہے وہ بھی اسے بہت چاہتی ہے۔ اس نے کوٹھا چھوڑ دیا ہے اور لاہور میں سطوت نے اسے ایک علیحدہ بنگلہ لے کردے رکھا ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ نفیسہ کی باتیں سن کر مجھے شدید چکر آگیا اور میں بیٹھتی چلی گئی۔

”ارے تم نے تو ابھی سے ہمت ہار دی میری ایک بات اچھی طرح اپنے دماغ میں بٹھالو کہ اگر تمہاری بیٹی پیدا ہوئی تو وہ تمہیں دھوکہ دینے کے جرم میں اور تمہاری بیٹی کو بیٹی ہونے کے جرم میں جان سے مروادے گا۔“ نفیسہ نے کہا۔

”تم مجھ سے انتقام لے رہی ہو نفیسہ‘ اس لیے اس قسم کی باتیں کررہی ہو سطوت ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔“ میں نے مردہ لہجے میں کہا۔

”ہاتھ کنگن کو آرسی کیا اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا تو سرمئی کے بارے میں کسی سے بھی پتا کروالو۔ وہ یہیں سمن آباد میں بنگلہ نمبر 118 میں مقیم ہے۔“ نفیسہ بولی۔

”لیکن میں کس طرح سے یہ بات معلوم کرسکتی ہوں کیونکہ میرے تو گھر سے باہر جانے پر بھی پابندی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں بڑی مشکلوں سے تم تک پہنچی ہوں تاکہ تمہیں خبردار کرسکوں ویسے میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں

بیٹے کی ماں بنائے۔ لیکن اس صورت میں بھی صرف تمہارے بچے کی جان بخشی ہوگی۔ سطوت تم سے تمہارا بیٹا چھین کر تمہیں ہمیشہ کی نیند سلادے گا۔ وہ تمہیں وہ عزت کبھی نہیں دے گا جو ایک بیوی کا حق ہوتی ہے اور اگر خدانخواستہ تمہارے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی تو جتنی جلدی ہوسکے اپنی اور اپنی بیٹی کی جان بچاکے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنا۔“ نفیسہ نے کہا۔

”ایک بات تو بتاؤ نفیسہ۔“ میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”پوچھو۔“ اس نے کہا۔

”آخر تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کس لیے ہورہی ہے۔ بقول تمہارے کہ میں نے تو تم سے تمہارا شوہر چھین لیا ہے۔ تو پھر مرنے دو مجھے تمہارے حق میں تو اچھا ہی ہے۔“

”انسانیت کے ناتے اور ایک عورت ہونے کے ناتے جس ظالم اور سفاک شوہر کی درندگی میں نے برداشت کی ہے تم اس سے زیادہ درندگی کا شکار ہونے والی ہو اور تم نے کہا مجھ سے میرا شوہر چھینا ہے وہ تو کبھی میرا تھا ہی نہیں وہ تمہارا بھی نہیں ہے وہ سرمئی بائی کا بھی نہیں ہے وہ کسی کا نہیں ہے۔ صرف اپنے نفس کا غلام ہے۔“ نفیسہ نے کہا اور اٹھ کر میرے نزدیک آکر بیٹھ گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی جو آنسو بہہ کر میرے گالوں تک آگئے تھے انہیں صاف کرنے لگی اور بولی۔

”روشن آراء اگر تمہیں میری باتوں کی سچائی میں کوئی شک ہے تو عشرت سے پوچھ لو۔ یہ تو حویلی کی پرانی خادمہ ہے۔ جدی پشتی یہ لوگ حویلی کے ملازم چلے آرہے ہیں۔ یہ حویلی کی ہر بات سے واقف ہے۔ لیکن آنکھیں‘ کان اور زبان رکھنے کے باوجود یہ اندھی ہے گونگی ہے اور بہری ہے۔“ نفیسہ نے سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑی عشرت کی جانب اشارہ کرکے کہا۔

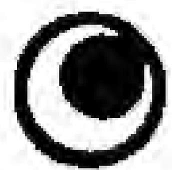
میں نے عشرت کی جانب نگاہ اٹھائی تو وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے تھر تھر کانپنے لگی۔

”بتا اس کو کہ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں یا سچ۔“ نفیسہ نے کہا۔

”مم...... مجھے معاف کردیں میں کچھ نہیں بول سکتی۔“ عشرت نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا تجھے اپنی معصوم لڑکی کا انجام یاد نہیں کہ ان حویلی والوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ صرف اس کی خاطر کہ تیرے بس میں ہوتا تو تو اسے بچالیتی۔ آج سارا سچ بول کر اس کو اور اس کے بچے کو بچالے عشرت اور اگر تُو نے ایسا نہیں کیا تو تُو بھی ان ہی گناہ گاروں کے ساتھ سمجھی جائے گی اور تیرا انجام بھی یوم حشر ان ہی کے ساتھ ہوگا۔“ نفیسہ نے کہا تو عشرت اس کے قدموں میں گر کر بری طرح رو پڑی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



انسانی اسمگلر

برادرم عمران احمد
انسانی اسمگلر کے ساتھ حاضر ہوں۔ گوکہ کہانی سچی ہے لیکن کہیں کہیں آپ کو اس میں افسانے یا فکشن کا ٹچ نظر آئے گا۔ جہاں بھی ایسا لگے تو سمجھ لیں کہ یہ میری مجبوری ہے کیونکہ رنگ آمیزی کے بغیر کوئی کہانی خوبصورت نہیں ہوتی۔ بہرحال زیر نظر کہانی کے کردار آپ کو سماجی کارکنوں اور غیر افراد کے روپ میں جا بجا نظر آجائیں گے۔ یہ چہرے بظاہر اتنے خوب صورت ملمع چڑھے ہوتے ہیں کہ کوئی ان پر شک بھی نہیں کرسکتا لیکن ان کا گھناؤنا پن صرف ان کا شکار بننے والے افراد کو ہی نظر آتا ہے۔ امید ہے یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

والسلام
عبدالرؤف

رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں، بادل پوری گھن گرج کے ساتھ چمک رہے تھے، سردی، دھند اور مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے کوئی باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بادل کبھی گرجنے لگتے تھے تو کبھی چمکنے۔ ماحول میں اتنی تاریکی پھیلی ہوئی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کبھی جب بجلی چمکتی تو سیکنڈ دو سیکنڈ کے لیے چیزیں نظر آتیں اور پھر ماحول پہ وہی گہری تاریکی چھا جاتی۔

موسم کی شدت اور بادلوں کی گھن گرج سے بے نیاز حماد محلہ فیض آباد کی ایک گلی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا جارہا تھا۔ اس کی منزل سیٹھ ہمدانی کی کوٹھی تھی جہاں اس کی متاع جاں اس کی زندگی اور امیدوں کا مرکز لائبہ رہتی تھی۔

پورے شہر میں سیٹھ ہمدانی معزز اور فلاحی شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ علاقے کے لوگوں کے کام آنا اور ان کی ضرورتیں پوری کرنا اس کے معمول کا حصہ تھا۔ سیٹھ ہمدانی کی ایک بیٹی تھی۔ ہمدانی چند ماہ پہلے ہی اس شہر میں آیا تھا اور آتے ہی اس نے علاقے میں اپنا اچھا خاصا اثر ورسوخ بنالیا تھا۔ علاقے کے سب لوگ سیٹھ کی نرم دلی کا دم بھرتے نظر آتے تھے۔

حماد بظاہر ایک پرائیویٹ فرم میں کلرکی کرتا تھا لیکن درحقیقت وہ سیٹھ ہمدانی کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ غریب ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ تین سال کا تھا تو اس کا باپ اسے داغ مفارقت دے گیا تھا۔ ماں پر سارے گھر کی ذمہ داری آن پڑی لیکن اس نے سب مشکلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ گھروں میں صبح شام کام کرکے اس نے حماد کو پالا پوسا اور پھر اسے اچھی تعلیم دلوائی۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد حماد نے نوکری کی تلاش شروع کردی۔ جوں جوں وہ نوکری کے لیے اپلائی کرتا گیا، توں توں اس کی مایوسی میں اضافہ ہوتا گیا اور بالآخر یہ مایوسی اسے جرم کی دنیا میں لے گئی۔ کئی دھکے کھانے کے بعد اسے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری مل ہی گئی۔ گوکہ اب اسے نوکری کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی ماں کی تسلی کے لیے اس نے جوائن کرلیا۔ جیسی بھی تھی نوکری تو تھی ماں نے شکر ادا کیا لیکن نوکری ملنے کے ایک ماہ بعد ماں بھی چل بسی۔

حماد گھر سے دفتر اور پھر دفتر سے ہمدانی کی کوٹھی تک روز پیدل جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ دفتر سے چھٹی کر کے ہمدانی کے گھر جارہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ سفید رنگ کا لباس پہنے کھلے بال اور دوپٹا گلے میں لٹکائے برائے نام سنگھار کیے وہ دھیمی دھیمی مورنی کی سی چال چلتی اسے کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔

حماد نے اس لڑکی کا پیچھا شروع کردیا۔ حیرت انگیز طور پر لڑکی انہی راستوں سے گزر رہی تھی جن سے گزر کر اس نے سیٹھ ہمدانی کی کوٹھی تک پہنچنا تھا۔ اس وقت تو اس کو شدید ترین جھٹکا لگا جب وہ لڑکی سیٹھ ہمدانی کی کوٹھی میں داخل ہوگئی۔ حماد اس لڑکی کے عشق میں اس وقت تک گرفتار ہوچکا تھا۔ جلد ہی حماد نے پتا کروالیا کہ لڑکی ہمدانی کی بیٹی ہے اور نام لائبہ ہے۔

چند دن بعد اسے معلوم ہوا کہ لائبہ کسی آصف نامی لڑکے سے پیار کرتی ہے۔ یہ بات اسے خود لائبہ نے اس وقت بتائی جب حماد نے لائبہ کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کیا تو اس نے نفرت سے حماد کے منہ پر تھوکتے ہوئے اسے اپنے عشق کے بارے میں بتایا۔ لائبہ نے حماد کو یہ بھی بتایا کہ آصف سے کچھ دیر کے لیے ملتی ہے۔

حماد کو لائبہ کے بغیر زندگی گزارنا مشکل لگ رہا تھا اور لائبہ تھی کہ اس نے صاف صاف انکار کرتے ہوئے اس پر نا صرف تھوک دیا تھا بلکہ اسے ذلیل اور گھٹیا شخص بھی کہا تھا۔ آج اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ لائبہ سے دو ٹوک بات کرے گا، چاہے اس مقصد کے لیے لائبہ کو اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر لائبہ مان گئی تو ٹھیک ورنہ وہ اسے آصف کے قابل بھی نہ چھوڑے گا۔

سیٹھ ہمدانی کی کوٹھی کے باہر پہنچ کر حماد نے موبائل نکالا اور لائبہ کا نمبر ملایا۔

لائبہ جو اپنے کمرے میں الیکٹرک ہیٹر جلائے بظاہر کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی لیکن درحقیقت آصف کی کال کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ موبائل کی وائبریشن ہوتے ہی اس نے لحاف پرے پھینکا اور اٹھ کر بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ

کے پاس آئی اور چھوٹی سی کھڑکی کھول کر اس نے باہر گلی میں دیکھا۔ کالی سیاہ اور دھند میں لپٹی ہوئی رات میں اسے گلی میں ہیولہ سا دکھائی دیا۔ جس نے سیاہ گرم چادر سے اپنا وجود اور نصف چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اپنی طرف سے یہ تسلی کر کے کہ باہر آصف آ چکا ہے' وہ واپس مڑی اور کمرے میں سے اپنی گرم چادر اٹھا کر دوبارہ واپس آئی اور گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر گلی میں نکل آئی۔

لائبہ کے کوٹھی سے نکلتے ہی کوٹھی کے اندر تین سائے حرکت میں آ گئے ایک نے گیٹ کو دوبارہ بند کر دیا جب کہ باقی دونوں نے آہستہ سے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اطمینان سے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

دوسری طرف حماد نے جونہی لائبہ کو کوٹھی سے نکلتے دیکھا اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ سڑک ویران تھی اور وہاں پر ان دونوں کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ آگے آگے حماد اور پیچھے لائبہ تھی۔ سفر خاموشی سے کٹ رہا تھا' کوٹھی سے تقریباً دو فرلانگ تک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد لائبہ نے محسوس کیا کہ آصف آج خاموش خاموش ہے۔ ورنہ عام حالت میں اس کی زبان بند کروانا مشکل ہو جاتا تھا۔

"آصف! کیا بات ہے' خاموش کیوں ہو۔ بات کیوں نہیں کر رہے تم مجھ سے.....؟" آخر کار جب اس سے رہا نہ گیا تو اس نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

آگے چلتے ہوئے حماد کے قدم ایک دم لڑکھڑائے جیسے اسے لائبہ سے اس سوال کی توقع نہ ہو۔

کایا پلٹتی دیکھ کر پول کھل جانے کے ڈر سے حماد نے رک کر غیر محسوس طریقے سے جیب سے پستول نکالا اور لائبہ کی طرف مڑا۔ سڑک کے اطراف لگی اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں جس سے سڑک پر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اسی ایک لمحے میں لائبہ کی نظر حماد پر پڑی تو وہ آصف کی جگہ اسے دیکھ کر زور سے چیخ پڑی اور ساتھ ہی وہ الٹے قدموں واپسی کے لیے پلٹنے لگی۔

"رک جاؤ لائبہ! میں کہتا ہوں رک جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔" لائبہ کو پلٹتے دیکھ کر اور اپنے منصوبے کو ناکام ہوتے پا کر وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں! تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں نہیں رک سکتی۔ مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہے۔" لائبہ نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

"میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ تم خود میری کال پر میرے ساتھ آئی ہو اور مجھ سے نفرت کی کوئی وجہ بھی ہو گی۔" حماد کی حالت ہذیانی سی ہو رہی تھی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں خود تمہارے ساتھ نہیں آئی تم مجھے دھوکے سے لائے ہو۔"

"میں دھوکے سے نہیں لایا' میری کال پر تم خود آئی ہو۔ حماد نے چیخ کر ایک بار پھر وہی جواب دیا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔

"میں نے موبائل پر نمبر نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس وقت تم آ سکتے ہو۔" لائبہ نے غلطی تسلیم کی۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" حماد نے جواب دیا۔

"قصور ہے جب تم جانتے تھے کہ اس وقت آصف مجھ سے ملنے آنے والا ہے تو تم کیوں آئے؟" لائبہ کی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ غصے کے سبب اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔

"یہ محبت کی جنگ ہے جو تین فریقوں کے درمیان ہے۔ جس میں کامیابی دو کو ملنی ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک سلطنت کے حصول کے لیے دو فریقوں

کے درمیان جنگ ہے۔ بات ایک ہے کامیاب دو نے ہی ہونا ہے۔" حماد کی حالت جنونی ہو رہی تھی۔ "اب اس جنگ میں قدرت مجھ پر مہربان ہے تو تم پیچھے کیوں ہٹ رہی ہو؟ یاد رکھو اگر تم میری نہیں ہو سکتیں تو میں تمہیں کسی اور کا بھی نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے اپنے خون سے ہاتھ رنگنے پر مجبور نہ کرو۔" حماد نے اسی جنونی حالت میں لائبہ کو وارننگ دی۔

"تم میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو تب بھی تم مجھے حاصل نہیں کر سکتے۔ میں مر تو سکتی ہوں لیکن تمہاری نہیں ہو سکتی۔" لائبہ نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"سوچ لو لائبہ! مجھے مجبور نہ کرو۔" حماد نے نڈھال مگر بے بس لہجے میں کہا۔

"مجھے سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں میں نا تمہاری تھی نا تمہاری ہوں اور نا تمہاری ہو سکتی ہوں۔" لائبہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا اور واپسی کے لیے پلٹ کر اندھا دھند دوڑ لگا دی۔

فائر کی آوازیں گونجیں اور تین گولیاں لائبہ کی پشت سے سینے کے پار ہو گئیں۔ وہ وہیں چیخ مارتی ہوئی ڈھیر ہو گئی۔

حماد کچھ دیر تو وہیں گم صم کھڑا رہا پھر حالات کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی ریوالور کو وہیں پھینک کر دوڑ پڑا۔

حماد کے جاتے ہی ایک سایہ کسی پتھر کی اوٹ سے نکلا' اس نے جیب سے دستانے نکالے اور لائبہ کو چھو کر اس کی موت کا یقین کر کے لاش کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

♥...../●/.....♥

"آیئے آیئے ہمدانی صاحب! میں نے اپنی طرف سے کیس کی چھان بین کی ہے' ریوالور سے اس کے نشانات بھی لے لیے گئے ہیں۔ فی الحال کوئی واضح کلیو سامنے نہیں آیا۔" انسپکٹر ذوالفقار نے سیٹھ ہمدانی کو تھانے میں داخل ہوتے دیکھا تو سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

انسپکٹر ذوالفقار' ہمدانی کے انتظار میں ہی بیٹھا تھا کیونکہ اسی نے ہمدانی کو بلوا بھیجا تھا۔

"اس کے ساتھ ہی معذرت چاہوں گا کہ آپ کو تھانے تک آنے کی تکلیف دی لیکن کیس کی تفتیش اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔" انسپکٹر نے مصافحہ کرنے کے بعد ہمدانی کو کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں انسپکٹر صاحب! آپ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" ہمدانی نے کرسی پر بیٹھ کر رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ اب کوئی بھی کارروائی میری بیٹی کو واپس نہیں لا سکتی۔"

انسپکٹر ذوالفقار نے محسوس کیا کہ اس کے یہ آنسو فرضی ہیں۔

"ہمدانی صاحب! اگر میرے سوالات کا صحیح جواب مل گیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دو سے تین دن میں مجرم کو پکڑ لوں گا۔" انسپکٹر نے ہمدانی کے فرضی آنسوؤں کی لاج رکھتے ہوئے تسلی دی۔

"سب سے پہلے تو یہ بتایئے کہ لائبہ کا کسی سے کوئی عشق وغیرہ کا چکر تو نہیں تھا۔ معاف کیجیے گا تفتیش کے دوران شاید کچھ ایسے سوالات بھی آئیں گے جو آپ کو ناگوار گزریں گے لیکن معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔" انسپکٹر نے سوال پوچھنے کے ساتھ ساتھ معذرت بھی کی۔

"جی ہاں! میری بیٹی آصف سے بے پناہ پیار کرتی تھی۔" ہمدانی نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"کیا آصف بھی لائبہ سے پیار کرتا تھا؟" انسپکٹر نے پہلے محرر اور پھر ہمدانی کی طرف دیکھتے ہوئے اگلا

سوال کیا۔
محرر انسپکٹر کا اشارہ سمجھ کر مسکرایا تو انسپکٹر نے غیر محسوس طریقے سے ہلکا سا سر ہلا دیا۔
"جی ہاں! آصف بھی لائبہ سے محبت کرتا تھا اور مجھے ان دونوں کی محبت کا نا صرف علم تھا بلکہ میں چند ماہ تک ان کی شادی کرنے والا تھا۔" ہمدانی نے جواب دیا۔
"اس شادی کی رضا مندی میں آپ کی طرف سے یا لڑکے کے والدین کی طرف سے کوئی زور زبردستی تو نہیں کی گئی تھی؟" انسپکٹر نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔
"نہیں! دونوں فریقین باہم رضا مند تھے۔" ہمدانی نے جواب دیا۔
"اس کا مطلب ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے اور شادی بھی ہونے والی تھی اور شادی پر دونوں میں سے کسی ایک فریق کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ پھر تو آصف پر شک کیے جانے کے چانس کم ہیں لیکن......! لیکن پھر بھی ممکن ہے ان دونوں کے بیچ بھی کوئی جھگڑا یا تلخ کلامی ہوئی ہو اس صورت میں ہوسکتا ہے آصف نے اس پرانی رنجش کا بدلہ لیا ہو اور آج موقع پاکر اسے قتل کردیا ہو؟" انسپکٹر نے میز پر کہنی ٹیک کر پنسل دانتوں میں دباتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔
"نن......نہیں ان دونوں کے بیچ میرا خیال ہے کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔" کچھ دیر سوچ کر ذہن پر زور دیتے ہوئے ہمدانی نے انسپکٹر کی بات کی نفی کی۔
"کوئی اور لڑکا لائبہ کو پسند کرتا ہو ایسا کچھ ذہن میں ہے آپ کے؟" انسپکٹر نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بولا۔
"حماد......حماد ایک لڑکا ہے جو کسی پرائیویٹ محکمے میں کلرک ہے۔ وہ میری بیٹی سے اپنی محبت کا دعویدار تھا۔ نچ طبقے کا تھا۔ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔" ہمدانی نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر جواب دیا۔
"گڈ! اس کا مطلب ہے کہ لائبہ کے قتل میں آصف یا حماد میں سے کسی ایک کا ہاتھ ہے۔" انسپکٹر نے پرخیال انداز میں گویا خود کلامی کی۔
"صرف حماد کا انسپکٹر صاحب! صرف حماد کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ آصف کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" ہمدانی نے اپنی نفرت کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"ہمدانی صاحب! لائبہ رات کے ایک بجے کے بعد اکیلی کس شخص کے ساتھ جاسکتی ہے آصف یا پھر حماد کے ساتھ؟" ایک بار پھر انسپکٹر نے ہمدانی کی طرف جھکتے ہوئے کہنیاں میز پر ٹکا کر سوال کیا۔
ہمدانی نے چونک کر انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا لیا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس نکتے پر تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ پھر دو منٹ کی خاموشی کے بعد بولا۔
صاف ظاہر ہے وہ آصف سے محبت کرتی تھی تو اس کے علاوہ وہ اور کس کے ساتھ جاسکتی تھی۔" ہمدانی کے پاس اس سوال کا یہ جواب دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔
"پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لائبہ کے قتل میں حماد کا ہاتھ ہے؟ ایسی صورت میں تو شک سیدھا آصف پہ ہوتا ہے۔" انسپکٹر نے پوائنٹ نوٹ کرتے ہوئے کن انکھیوں سے محرر کی طرف دیکھا تو وہ زیر لب مسکرا دیا مطلب یہ تھا کہ اس نے بھی پوائنٹ نوٹ کرلیا ہے۔
"ٹھیک ہے ہمدانی صاحب! تکلیف کے لیے معذرت' ضرورت پڑی تو آپ کو ایک مرتبہ پھر تکلیف دوں گا۔" انسپکٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"ضرور انسپکٹر صاحب ضرور میں حاضر ہوجاؤں گا۔" ہمدانی انسپکٹر سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا جب کہ انسپکٹر واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوچوں میں گم ہوگیا۔ نجانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس واقعے میں کہیں نا کہیں ہمدانی کا اپنا ہاتھ یا ارادہ ملوث ہے۔ انسپکٹر کی تیز نظروں نے ہمدانی کی آنکھوں میں تیرتی شاطری وشیطانیت کو صاف طور پر دیکھ لیا تھا۔

♥......./●/......♥

حماد اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ اچانک اسے کھٹکا سا محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں کو کھول کر دیکھا تو ایک نقاب پوش ہاتھ میں خنجر اٹھائے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔
حماد کی آنکھوں میں یکدم خوف لہرا گیا۔
"کک......کک......کون ہو تم؟" حماد نے خوف سے لرزتے ہوئے ہکلا کر پوچھا۔
"تمہاری موت اور لائبہ کا عاشق۔ ہاہاہا" اتنا کہہ کر نقاب پوش نے بڑھ کر اپنا ہاتھ حماد کے منہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا خنجر حماد کے سینے میں دل کے مقام پر اتار دیا۔ خنجر مارنے کے بعد نقاب پوش نے جب تک اس کے منہ سے ہاتھ نہ ہٹایا جب تک کہ اسے تسلی نہ ہوگئی کہ حماد کے اندر اب زندگی کی کوئی رمق نہیں رہی۔
"خس کم جہاں پاک۔" کہہ کر نقاب پوش نے خنجر کو اپنے بیلٹ میں اڑس لیا اور بیرونی دیوار پھلانگ کر باہر نکل گیا لیکن عجلت میں اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس کا خنجر پس دیوار ہی گر گیا ہے۔

♥......./●/......♥

"ہمدانی صاحب مجھے آصف کے فنگرز پرنٹس میں یوں سمجھیں کہ کیس نوے فیصد حل ہوگیا ہے کیونکہ آپ کا دشمن لائبہ کا عاشق اور آپ کے داماد کا رقیب بھی کل رات قتل کردیا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام سوائے آصف کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔"

ایک عظیم شاعر

اردو زبان اور اردو ادب شعراء اور ادباء کی تخلیقات سے مالا مال ہے۔ ان میں سے سہیل عظیم آبادی ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر انڈیا کے صوبہ بہار کے صدر مقام پٹنہ میں اپنے ماموں جعفر امام کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اردو ادب کی مشہور شخصیت اور بانی اردو کالج کی ہدایت پر چھوٹا ناگپور میں اردو مرکز قائم کیا تھا۔ جو رانچی میں تھا۔
عظیم فنکار سہیل عظیم آبادی نے ہندوستان کے صوبے بنگال کے صدر مقام کلکتہ میں تعلیم حاصل کی تھی وہاں آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت کے پیشے سے کیا۔ اپنے دوست ابراہیم شاہ کے ساتھ مل کر رسالہ "چندن" نکالا تھا۔ پٹنہ سے ماہنامہ "تہذیب" جاری کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ 1936ء سے آپ پٹنہ میں قیام پذیر ہوئے تھے۔
1955ء میں آپ ریڈیو کشمیر میں ملازم ہوئے اور 1958ء میں آپ کی شادی ہوئی تھی۔ آپ کو ریڈیو کشمیر میں رام دھاری سنگھ نے ملازمت دلائی تھی۔ بچپن میں آپ "تجارت کتب" کے خواہاں تھے۔ پٹنہ میں آپ اپنے ماموں کی مشہور تحقیقی لائبریری "خدا بخش اورینٹل لائبریری" کے نگراں مقرر ہوئے۔
عظیم شاعر سہیل عظیم آبادی نے کلکتہ میں بننے والی ایک اردو فلم کی کہانی بھی لکھی تھی۔ آپ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن بھی رہے۔ آپ نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز "کانگریس سوشلسٹ پارٹی" سے کیا تھا۔
سمیرا حیات......کراچی

انسپکٹر نے فون کر کے ہمدانی کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ دھما کا کیا۔

”کک...... کیا مطلب انسپکٹر صاحب آپ میرے داماد پر یہ الزام کیسے لگا سکتے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی ثبوت کے۔“ ہمدانی کا موڈ یکدم آف ہو گیا۔

”مل جائے گا ہمدانی صاحب! ثبوت بھی مل جائے گا۔ فی الحال تو مجھے آصف کے فنگر پرنٹس چاہئیں اور ساتھ آپ کے بھی۔“ انسپکٹر ایسے بات کر رہا تھا جیسے ہمدانی یا آصف کے مجرم ہونے کا اسے یقین ہو۔

”لیکن آصف تو تین دن سے شہر سے باہر ہے۔ بہر حال آئے گا تو میں اسے روک کر آپ کو بلا لوں گا۔“ ہمدانی نے گویا طنز کرتے ہوئے انسپکٹر کو اس کی اوقات یاد دلائی تھی۔‘

”اوہ تو یہ بات ہے لگتا ہے معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا ہے۔ بہر حال آصف کب آئے گا میں خود آؤں گا اس کے فنگر پرنٹس لینے۔ مجھے یقین ہے کہ آصف ہی حماد کا قاتل ہے۔“ انسپکٹر نے حیرت کا اظہار کیا پھر لائن ڈراپ کر دی۔

”حیرت ہے پہلے معشوقہ قتل کی گئی پھر عاشق اس کا مطلب ہے کہ یہ رقیب کا کام ہے لیکن رقیب تین دن سے شہر سے باہر ہے یا تو یہ کرائے کے قاتل کا کام ہے اور قاتل اسی شہر میں موجود ہے یا شہر سے باہر جانے کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔“ انسپکٹر نے ریسیور رکھتے ہوئے خود کلامی کی اور کیپ سر پر رکھ کر تھانے سے باہر نکل گیا۔

♥....../●/......♥

”آصف! پولیس کے شکوک کا مرکز صرف اور صرف تم ہو۔ اس سے پہلے کہ پولیس بس اڈے اسٹیشن یا پھر ایئر پورٹ سے پتا کرے، تم تمام انتظامات کر لو تاکہ پولیس کو یقین ہو سکے کہ اس قتل میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ کم آن دیر نہ کرو۔“ ہمدانی نے آصف کو جلدی جلدی احکامات دیے۔ اور خود فون کی طرف بڑھ گیا۔ نمبر ملا کر اس نے کچھ لوگوں کو بلایا اور کوٹھی کے چاروں طرف پھیل کر کوٹھی کی نگرانی کرنے کا حکم دیا اور پھر وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

♥....../●/......♥

اس شام مقررہ وقت پہ مکمل تیاری کے ساتھ انسپکٹر ذوالفقار سیٹھ ہمدانی کی کوٹھی میں فنگر پرنٹ لینے کے لیے موجود تھا۔

”آیئے آیئے انسپکٹر صاحب! آیئے۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ باقی مہمان...... میرا مطلب ہے کہ آپ کے ساتھی نظر نہیں آ رہے؟“ ہمدانی نے اٹھ کر انسپکٹر کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے دروازے کی جانب نظریں دوڑا کر کہا۔

”میں اکیلا ہی آیا ہوں۔“ انسپکٹر نے ہاتھ ملا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ لیکن بیٹھتے ہوئے اس کی چیتے جیسی نظروں نے ہمدانی کو آصف کو آنکھ مارتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

کچھ دیر کی بات چیت کے بعد انسپکٹر فنگر پرنٹ لینے کی تیاری کرنے لگا۔

انسپکٹر کو اپنے کام میں مصروف دیکھ کر آصف نے موقع غنیمت جانا اور ریوالور نکال کر اس کا رخ انسپکٹر کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

”انسپکٹر! ہاتھ اوپر اٹھا دو اور اپنا ریوالور میرے حوالے کر دو ورنہ میں ریوالور کی تمام کی تمام گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔“

انسپکٹر جو اپنے کام میں مصروف تھا چونک کر مڑا اور آصف کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ہمدانی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔

آصف نے ہمدانی کو اشارہ کیا تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور انسپکٹر کا ریوالور نکالنے لگا۔ صرف ایک لمحے کے لیے آصف نے پلک جھپکا کر ہمدانی کی طرف دیکھا اور انسپکٹر نے اس وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمدانی کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے آصف کی طرف اچھال دیا۔ سب کچھ اتنا غیر متوقع ہوا تھا کہ آصف کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ ہمدانی سے ٹکرا کر صوفے پر گر گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دروازے کے پاس جا گرا۔ اس سے پہلے کہ دونوں میں سے کوئی اٹھتا انسپکٹر نے ریوالور ان پر تان کر انہیں ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔

”خبردار! اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ ورنہ میں فائر کھول دوں گا۔“ انسپکٹر نے حکم نے ساتھ دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

دونوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے لیکن دوسرے ہی لمحے آصف نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ہمدانی نے بھی اس کی تقلید کی۔ انسپکٹر نے انہیں بھاگتا دیکھ کر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے تو دونوں زمین پر آ رہے۔

انسپکٹر نے آگے بڑھ کر اپنی بیلٹ کے ساتھ اڑسی ہتھکڑی نکالی اور دونوں کا ایک ایک ہاتھ ہتھکڑی کے شکنجے میں کس کر واکی ٹاکی پر پولیس کی نفری کو حکم دیا کہ وہ خاموشی کے ساتھ ہمدانی کی کوٹھی پر آ جائیں۔

کچھ دیر بعد فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں انسپکٹر کو وائرلیس پر بتایا گیا کہ باہر پولیس اور ہمدانی کے کارکنوں کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔

آدھے گھنٹے کے مقابلے کے بعد ہی ہمدانی کے آدمی پسپا ہو گئے اور پولیس فاتحانہ انداز میں کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی دونوں حوالات میں بند تھے۔

♥....../●/......♥

دوسری پیشی پر ہی عدالت نے دونوں مجرموں کا پانچ روزہ جسمانی ریمانڈ منظور کر لیا۔ ریمانڈ کے دوران دونوں مجرموں نے حیران کن انکشافات کیے۔

سیٹھ ہمدانی جس کا بطور سوشل ورکر پورے شہر میں نام تھا وہ درحقیقت انسانی اعضاء کا اسمگلر تھا۔ آصف اور حماد دونوں اس کے آلۂ کار تھے اور ہمدانی کے لیے کام کرتے تھے۔ آصف دور دراز شہروں سے لڑکیوں کو محبت کا جھانسہ دے کر لاتا اور انہیں در بدر ہونے کے لیے شہر میں چھوڑ دیتا۔ اس کے بعد ہمدانی انہیں بہلا پھسلا کر اور ان کے ساتھ ہمدردی جتا کر انہیں اپنے گھر لے آتا اور بیٹی بنا کر ان کا اعتماد حاصل کر لیتا۔ اس کے بعد اپنے کسی آلہ کار کے ذریعے لڑکی سے عشق کی پینگیں بڑھا کر اسی کے ہاتھوں اسے قتل کروا دیتا تھا۔ اور پھر ان کے اعضاء نکال کر بیچتا تھا۔

ہمدانی اور آصف پر جرم ثابت ہو جانے پر عدالت نے دونوں مجرموں کو سزائے موت سنا دی۔

○

حصول فراخی رزق کے اسباب

نماز پڑھنے سے رزق کی تنگی دور ہو جاتی ہے۔
صدقہ کرنے سے رزق بڑھتا ہے۔
صلہ رحمی کرنے سے رزق میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔
والدین کی خدمت کرنے سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔
سچ بولنے سے رزق بڑھتا ہے۔
صبح کے کاموں میں برکت ہوتی ہے۔
حج و عمرہ کرنے سے رزق بڑھتا ہے۔
اللہ پر توکل رزق کو بڑھاتا ہے۔
تقدیر پر راضی رہنا رزق بڑھاتا ہے۔

انجانی محبت

محترم عمران احمد
السلام علیکم!
امید ہے مزاج بخیر ہوگا دوسری کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جو محبت کو مذاق سمجھتا رہا لیکن جب محبت کی حقیقت اس پر واضح ہوئی تو وقت اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ میری کہانی پر رائے ضرور دیں‘ چاہے وہ مثبت ہو یا منفی۔ میرے نزدیک عام قاری ہی صحیح نقاد اور لکھنے والے کے اصل استاد ہوتے ہیں۔
والسلام
عثمان
یوکے

آنے سے اس کے آئے بخار
جانے سے اس کے جائے بخار
بڑی سی ایک وائرس ہے
ہماری زیب النساء

”ہائے نا جانے کون سا بدلہ لیا دادی نے تمہارا نام زیب النساء رکھ کے۔“ نومی‘ سرمد کے سرہانے بیٹھا زیبی کو چھیڑ رہا تھا۔ جو ابھی ابھی بخار میں تپتے سرمد کے لیے دوائی لے کے آئی تھی۔ حرا اور سلیمان بھی وہاں ہی موجود خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

”ایسے لگتا ہے کسی بڑی خاتون کا نام ہو زیب النساء۔“ اس نے بڑا زور دے کر ”زیبی“ کا نام پکارا۔

”ہاں نومی بھائی! کیا بات کی آپ نے‘ زیبی آپا تو ایک وائرس ہی ہیں۔“ حرا نے بھی نومی کا ساتھ دیا۔

”جہاں بھی جاتی ہیں سب کو بیمار کرتی ہیں۔“

”حرا کی بچی میں ٹھیک کرتی ہوں تمہیں اور تمہارے نام پہ تو جیسے پھول جھڑتے ہیں نا۔ شکر کرو تم بچ گئے ورنہ دادی تو تمہارا نام حشمت اللہ رکھنے والی تھیں۔“

”اوہو بس کرو تم دونوں ایک تو میں بیمار ہوں اوپر سے تم دونوں کے جھگڑے۔“ سرمد سے بھی رہا نا گیا۔

”سرمد تمہیں پتا تو ہے میں کچھ نہیں کرتی ہر بار یہی شروع کرتا ہے۔“

”لو میں نے کب شروع کیا۔ تم نے میرے آتے کے ساتھ مجھے پتھر مار کے ویلکم کیا تھا۔“

”وہ تو میں نے ایسے ہی مار دیا تھا۔“

”لو اپنی دفعہ ایسے ہی۔“

”اچھا بس کرو تم دونوں۔“ سرمد نے پھر سے دونوں کو چپ کروانے کی کوشش کی۔

”زیبی تمہیں تائی اماں کچن میں بلا رہی ہیں۔“ اتنے میں شزا بھی آن پہنچی۔

”آیئے میڈم بس آپ کی ہی کمی تھی۔“ نومی نے شزا کا استقبال کیا۔

”کہاں تھی میڈم اب تک؟“

”وہ ذرا کچن میں کام کر رہی تھی۔“

”دیکھا زیبی کتنی سگھڑ ہے شزا‘ اس سے کچھ سیکھو ورنہ سسرال والے کیا کہیں گے کہ لڑکی کو کھانا بنانا بھی نہیں آتا۔“ نومی نے پھر زیبی کو چھیڑا۔

”جی نہیں مجھے سب کچھ آتا ہے اور اس وقت تمہاری فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں میں جا رہی ہوں کچن میں بائے۔“

”اوہو کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑے رہتے ہو تم دونوں۔“ شزا نے کشن نومی کو مارتے

ہوئے کہا۔

”سرمد دیکھا شزا کا اشارہ تمہاری طرف ہے۔“

”لو میں بیمار بندہ کسی کو تنگ نہیں کرتا اور شزا جانتی ہے یہ۔“

”اچھا بس کرو اب تم دونوں اور نومی‘ پھوپو کہہ رہی ہیں کہ نومی کو بولو چلو گھر چلیں۔“

”اوہو اماں جی میرے آنے میں بھی جلدی اور جانے میں بھی‘ خیر اب ہم چلتے ہیں او کے سرمد ٹھیک ہو جاؤ۔ اب بس کرو یہ ڈرامے او کے شزا بائے۔ حرا میرے جانے کے بعد کوئی میری برائی کرے تو جلدی سے مجھے ایس ایم ایس کرنا۔“

”فکر ہی نا کریں نومی بھائی میں ہوں نا!“ حرا بہت پرجوش نظر آئی۔

”گڈ بائی رپورٹر بائے۔“ شزا اسے دور تک جاتے دیکھتی رہی۔

□......☆......□

شزا‘ نومی‘ سرمد اور زیبی نے بچپن ایک ساتھ ہی گزارا۔ نومی کی ماں اپنے تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ناتے اپنی بھابیوں کی بھی لاڈلی رہی۔ بڑے بھائی اکرم کے تین بچے سرمد حرا اور بلال۔ چھوٹے بھائی اصغر کی ایک بیٹی زیب النساء اور سب سے چھوٹے بھائی ساجد کا ایک بیٹا سلیمان اور بیٹی شزا تھی۔ تینوں بھائیوں میں بہت پیار ہونے کی وجہ سے آج بھی اکٹھے ایک ہی گھر میں رہ رہے تھے۔ نومی اپنی ماں کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ پورے خاندان میں ان سب بچوں کی دوستی ایک مثال بنی ہوئی تھی۔

□......☆......□

شزا کا فون بجے جا رہا تھا پر وہ پتا نہیں کہاں گم تھی۔ زیبی اس کے کمرے سے گزری تو فون کی آواز سن کر شزا کو آواز دی۔

”شزا تمہارا فون بج رہا ہے۔ شزا‘ شزا......!“

”اوہو میں ہی اٹھا لیتی ہوں۔“ زیبی جیسے ہی فون اٹھانے آگے بڑھی فون بند ہو گیا۔ شزا بھی کمرے میں آن پہنچی کس کا فون تھا زیبی۔“ شزا شاید بھاگتی آئی تھی۔ سانس پھول رہا تھا۔ زیبی نے اسے دیکھا۔

”پتا نہیں بند ہو گیا میرے اٹھانے سے پہلے ہی۔“

”او کے......!“ شزا نے جیسے شکر کیا۔

”تمہاری کیوں سانس پھول رہی ہے۔ کہیں کچھ راز تو نہیں۔“ زیبی نے شرارتاً کہا۔

”نہیں یار میرا راز ہو اور تمہیں نا بتاؤں ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔“

”یہ تو ہے اینی وے میں چھت پر جا رہی ہوں۔ تم چلو گی۔“ زیبی نے شزا سے پوچھا۔

”نہیں تم جاؤ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“

”او کے......!“ زیبی کمرے سے باہر نکل گئی۔

شزا کی جیسے جان میں جان آئی۔ جلدی سے فون اٹھایا۔

”تم سے صبر نہیں ہوتا ابھی تو تم گھر گئے ہو اور ابھی سے کال......!“ دوسری طرف نومی تھا۔

”لو جی ایک تو بندہ اتنے پیار سے کال کرے اور آگے سے یہ رسپانس‘ جاؤ میں نہیں بولتا تم سے۔“

”نومی مجھے لگتا ہے زیبی کو بتا دینا چاہیے‘ ابھی وہ فون اٹھانے والی تھی‘ شکر ہے تم نے بند کر دیا ورنہ اسی سے بات ہوتی تمہاری۔“

”تو کیا میں کوئی بہانہ بنا لیتا۔“

”نومی بات وہ نہیں‘ ہم سب بچپن سے ایک ساتھ ہیں اگر اسے بعد میں پتا چلا تو اسے برا لگے گا۔“

”شزا وہ برا نہیں مانے گی‘ بلکہ ایک دم خوشی سے پاگل ہو جائے گی اور سرمد کو بھی تو نہیں پتا نا۔“

”پر سرمد کی بات اور ہے وہ لڑکا ہے۔“

”اوہو شزا تم بھی نا کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔

جب بتانا ہوگا بتادیں گے اب یہ بتاؤ کیا کررہی ہو میں تو تمہیں بہت سارا مس کررہا تھا۔"

"اسی لیے جناب نے جھٹ سے فون کیا۔ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھو......!"

"تم مجھ سے باتیں کرتے تھکتے نہیں۔اتنی لمبی لمبی کالز کرتے ہو۔"

"وہ اس لیے کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

"سچی......!"

"ہاں جی پکی......!"

"اچھا اگر تم نے مجھ سے باتیں کرنا کم کردیں تو۔"

"ویسے تو ایسا کبھی نہیں ہوگا اگر ہوا تو سمجھنا کہ تم بورنگ ہوگئی ہو یا مجھے کسی اور سے پیار ہوگیا ہے۔"

"نومی میں ماردوں گی تمہیں۔"

"مذاق کررہا ہوں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

"پکا......!"

"ایک دم پکا......!"

"اچھا چلو رات کو بات ہوگی بائے۔"

"تسی جارہے ہو نا جاؤ۔" نومی نے بچے کے جیسے کہا۔

"چلو اب بنو مت بائے۔"

"او کے بائے۔"

"یہ شزا باجی آج چھت پہ کیوں نہیں آرہی۔" حرا منجھے ہوئے جاسوسانا انداز میں زیبی سے پوچھ رہی تھی۔

"آجائے گی تم کیا جاسوسوں کی طرح ہر بات پوچھتی رہتی ہو۔"

"آپ کو پتا ہے زیبی باجی' میں نا جب سے سی آئی ڈی دیکھ رہی ہوں' مجھے لگتا ہے میں بھی ایک جاسوس بن سکتی ہوں اور آپ کو پتا ہے محلے کا کوئی راز اب راز نہیں رہے گا۔میں نے اپنے جال چاروں طرف بچھا دیے ہیں۔ایک ایک لڑکے لڑکی پر نظر......!"

"او میڈم اتنی توجہ تم نے اپنی پڑھائی پر کی ہوتی نا تو آج پاس ہو جاتیں تمہاری عمر کی لڑکیاں آج ایف اے میں ہیں اور تم ابھی میٹرک میں۔" زیبی نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اوہو زیبی باجی آپ بھی نا کتنی بورنگ باتیں کرتی ہیں دیکھیے گا میں ایک دن بڑے بڑے کیس حل کروں گی۔ڈیٹیکٹو حرا کے نام سے ایک دن لوگ مجھے پہچانیں گے۔دنیا میرے آٹو گراف کے لیے ترسے گی تب آپ کتنا فخر کروگی مجھ پر۔"

"او میڈم جاؤ جاکر برتن دھو کے آؤ تمہارا کچھ نہیں ہوسکتا ایک دم پاگل ہو۔"

"ہائے......گھر کے ٹیلنٹ کی تو کوئی قدر ہی نہیں چلو ہم چلتے ہیں اپنا کام ختم کرنے۔"

"توبہ ہے اس لڑکی سے۔" زیبی مسکرادی۔

☐......☆......☐

"سرمد تمہارے ابا کہہ رہے ہیں کہ تم سے پوچھوں کہ تمہیں شادی کس سے کرنی ہے۔شزا سے یا زیبی سے کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ شادی ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہی کرنی ہے اور ایک کی نومی کے ساتھ اب فیصلہ تم خود کرو۔"

سرمد کے دل میں تو جیسے لڈو پھوٹنے لگے۔

"نہیں امی جو آپ کو اچھی لگتی ہے دونوں میں سے آپ اس سے طے کردیں۔"

"بیٹا زندگی تو تم نے گزارنی ہے اور میرے لیے تو دونوں ایک جیسی ہیں جیسی زیبی ویسی شزا اب مرضی تمہاری ہے اور ہاں فیصلہ جلدی کرنا یہ نہ ہو کہ نومی بھی اسی کے لیے رشتہ لے آئے۔جسے تم چنو۔"

"امی ایسی بات ہے تو پھر آپ زیبی سے کردیں۔" سرمد شرمارہا تھا۔ماں نے مسکراتے ہوئے سرمد کو دیکھا۔

"مجھے پتا تھا میری اور میرے بیٹے کی پسند ایک ہی ہوگی۔"

"اچھا تو آپ نے خود کیوں نہیں فیصلہ کیا؟" سرمد نے ماں سے پوچھا۔

"وہ اس لیے میرے بچے کہ زندگی تم نے گزارنی ہے۔چلو اب تم چاروں کی شادی پکی کرنی ہی پڑے گی۔"

☐......☆......☐

"لگتا ہے ہمارے گھر میں شادی ہونے والی ہے۔وہ بھی ایک نہیں چار چار۔" حرا نے چاول صاف کرتی شزا اور زیبی کو نظر اٹھانے پر مجبور کردیا۔

"میڈم کس کی شادی کروانے چلی ہو۔" شزا نے انکوائری کرتے ہوئے پوچھا۔

"لو جی میری جاسوسیوں کا کمال دیکھ لو پھر ایسے ہی تو میں دن رات خبریں اکٹھی نہیں کرتی رہتی آخر مجھ میں کچھ تو ہے۔"

"اچھا اب ذرا بتاؤ گی کہ کس کی شادی کی بات ہو رہی ہے؟" زیبی نے بے چینی سے پوچھا۔

"اچھا بابا بتاتی ہوں' بتاتی ہوں' تو ہوا کچھ یوں کہ میں کل سرمد بھائی کے کمرے کے باہر سے گزر رہی تھی کہ امی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔جس نے مجھے رکنے پر مجبور کردیا پر بس اتنا ہی سن پائی کہ آپ چاروں کا رشتا طے ہونے والا ہے۔آپ دونوں کا سرمد اینڈ نومی بھائی سے۔"

"سچی!" شزا نے خوشی اور حیرانی سے پوچھا۔

"لو جی میری خبر کبھی غلط نہیں ہوسکتی ایکسپریس نیوز سے بھی پکی خبر ہے۔لو جی خبر سنی نہیں اور آپ دونوں کے چہرے کیسے چمکنے لگے۔" حرا زیبی اور شزا کے چمکتے ہوئے چہرے دیکھ سکتی تھی۔دونوں خوشی سے کیسے مسکرارہی تھیں۔

"حرا کی بچی میں ٹھیک کرتی ہوں تمہیں۔" زیبی نے حرا کو دھمکی دی۔

"زیبی باجی آپ اپنے آپ کو ٹھیک کریں کیسے خوشی سے پھول رہی ہیں۔"

"حرا ٹھہر جا تو۔" زیبی حرا کے پیچھے بھاگی پر حرا کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔

☐......☆......☐

زیبی اپنے کمرے میں بیٹھی دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ان سب شرارتوں کو یاد کرکے جو اس نے اور نومی نے مل کر کی تھیں۔

نومی تم جانتے نہیں میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں اور دیکھو مجھے پتا ہے تم بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہو۔آج تک یہ بات تم نے کہی نہیں' پر مجھے تو پتا ہے نا اور اب ہم دونوں کی شادی ہوگئی تو میرا سب سے بڑا خواب پورا ہوجائے گا اور اب تو میں تمہیں اور تنگ کروں گی شادی جو ہونے والی ہے۔

زیبی نے نا جانے کتنے خواب اپنے دل میں سجا رکھے تھے۔جن کی تعبیر اسے نظر آنے لگی تھی۔

☐......☆......☐

"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں اور پھوپو کل رشتا لے کر آنے والی ہیں۔" شزا نومی سے فون پر لڑنے کے موڈ میں تھی۔

"چلو اب بتادیتا ہوں اور شکر ہے سرمد کو زیبی پسند ہے اگر اسے بھی تم پسند ہوتیں تو بڑا مسئلہ ہوجانا تھا۔"

"پر نومی کبھی زیبی سے تو پوچھا ہی نہیں کہ اسے سرمد سے شادی کرنی بھی ہے یا نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی مجھے پتا ہے زیبی کو سرمد بہت اچھا لگتا ہے۔تم فکر نہیں کرو۔"

"نومی اگر اسے تم اچھے لگتے ہوئے تو......!" شزا کے اس سوال نے نومی کو لاجواب کردیا۔ایک منٹ کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

"یار ایسا کچھ نہیں بس ہم اچھے دوست ہیں مانا کہ

ہم بہت قریب ہیں پر شادی کے لیے اسے میں پسند آؤں مشکل ہے دیکھو نا میں نے تم سے شادی کرنی ہے اسی طرح زیبی کو سرمد پسند ہے۔“

”لیکن نومی......!“

”اوہو بس اب چھوڑو۔“ نومی نے شزا کی بات کاٹ دی۔

□......☆......□

حرا صحن میں بیٹھی نا جانے کون سے جاسوسی کے منصوبے بنارہی تھی۔ جب نومی نے دبے پاؤں آکر اسے ڈرایا۔

”ہائے نومی بھائی آپ کو پتا نہیں میں معصوم دل کی مالک مجھے ہارٹ اٹیک ہو جاتا تو‘ کون ذمے دار ہوتا اور ویسے بھی آپ کو پتا نہیں میں کتنی سہمی سہمی ڈری ڈری رہتی ہوں۔“ حرا نے بڑی معصومیت سے کہا۔

”تم اور معصوم تھوڑے جھوٹ بولا کرو آگے ہی بارش نہیں ہوتی اور یہ تم کر کیا رہی تھی۔“

”آپ میری چھوڑیے اپنی بتایئے آج اتنے دنوں بعد۔ سنا ہے کوئی شادی کے ارادے ہیں آپ کے۔“

”یہ ہر خبر تم کہاں سے سن لیتی ہو؟“ نومی نے شرارتاً پوچھا۔

”آپ کیا جانیں میری عمر میں تو ایک نظر میں پتا چل جاتا ہے کہ اگلے کے دل میں کیا چل رہا ہے۔“

”کیا بات ہے آپ کی۔ تھوڑے فلمی ڈائیلاگ مارا کرو یہ بتاؤ باقی کہاں ہیں۔“

”نومی بھائی......!“ حرا نے اونچی آواز میں نعرے لگانے شروع کردیے۔ اس سے پہلے کہ نومی اسے روکتا دو آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

”نومی آیا ہے۔“ صحن کے ایک طرف سے شزا اور ایک طرف سے زیبی برآمد ہوئی۔ حرا نے ایک دفعہ شزا کو پھر ایک دفعہ زیبی کو دیکھا پھر بولی۔

”نومی تو آیا ہے اور پہلی دفعہ نہیں آیا پر آپ دونوں اتنی خوش کیوں ہوگئی ہیں۔ خیر تو ہے نا۔“ شزا اور زیبی بھی شرمندہ سی ہوگئیں۔

”حرا تمہارا تو دماغ ہی الٹا چلتا رہتا ہر وقت‘ جاؤ امی بلارہی ہیں تمہیں کب سے۔“ شزا نے جلدی سے بات کور کی۔

”ہاں بھئی! تم دونوں کو آج کیا ہوگیا ہے‘ ایسے بھاگتے ہوئے خیر تو ہے نا۔“ نومی نے بھی دونوں کو چھیڑا۔

”تو جی ہم تو چلے‘ باقی کی انکوائری اب آپ کریں۔“ حرا اپنا دوپٹا سنبھالتے نومی سے کہتے ہوئے چلی گئی۔

”زیبی میڈم کہاں گم رہتی ہیں۔ آپ نظر ہی نہیں آتیں۔“

”میں نے کہاں جانا ہے بس اِدھر ہی ہوں۔“

ابھی باتیں چل ہی رہی تھیں کہ حرا پھر سے آن پہنچی۔

”نومی بھائی چلیں ذرا آپ کو سب بڑی خواتین بلا رہی ہیں۔ آپ کی خیر نہیں چلیں ذرا۔“

”کیوں جی ایسا کیا ہوگیا۔ جو مجھ معصوم کی خیر نہیں۔“

”لو آپ اور معصوم کس اینگل سے۔“

”وہ پوچھ رہی ہیں کہ پھوپو نے کب آنا ہے آپ سب کے رشتے طے کرنے۔“ شزا اور زیبی کے چہرے کی مسکان نے حرا کو پھر سے موقع دے دیا

”لو ان دونوں کی خوشی دیکھو۔“

□......☆......□

پھوپو آج گھر میں موجود تھیں سب بہت مصروف تھے۔ زیبی اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی اور نومی کی شادی کا سوچ رہی تھی کہ شزا کمرے میں آئی اسے دیکھ کر زیبی اور بھی خوش ہوئی۔

”شزا میرا نام نومی کے ”ن“ سے جڑے گا۔“ زیبی کے منہ سے نکلتے لفظ شزا پر شاک تھے۔

”جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا زیبی تو نومی کے سپنے سجا رہی ہے۔ او مائی گاڈ......!“ شزا کے رنگ اڑنے لگے دل ہی دل میں وہ گھبرا گئی۔ زیبی تو اپنی خوشی میں شزا کے چہرے کے بدلتے رنگ بھی نا دیکھ پائی۔

”تمہیں پتا ہے شزا جب بھی میں نومی کو تنگ کرتی ہوں نا مجھے بہت مزا آتا ہے وہ بھی تو مجھ سے بہت محبت کرتا ہے کہتا نہیں‘ میں جانتی ہوں دیکھو کیسے پھوپو کو اپنی پسند بتادی اس نے۔“ زیبی کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا اور شزا کی الجھن میں اضافہ ہو رہا تھا کہ اتنے میں فون بج پڑا۔

”ہیلو‘ ہیلو زیبی کیسی ہو۔ امی وہاں ہی ہیں؟ کیا بنا پھر کب کی ڈیٹ فکس ہوئی۔ دوسری طرف نومی تھا۔“

”جناب آپ بڑے بے صبرے ہیں پتا چل جائے گا پھوپو گھر ہی آئیں گی اور اب تم مجھ سے بچ جاؤ خوب تنگ کرنا ہے اب تمہیں۔“

”وہ تو تم ویسے بھی کرتی ہو میڈم۔“

”پر اب تو میں ہمیشہ کے لیے تمہارے گھر جو آرہی ہوں اور تم نے پھوپو کو ڈائریکٹ کیوں بھیج دیا میری مرضی تو پوچھی ہی نہیں میں انکار کردیتی تو۔“

”کیا کہہ رہی ہو مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“

”میں اپنی اور تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں۔“

”او مائی گاڈ زیبی امی میرے اور تمہارے نہیں میرے اور شزا کے رشتے کی بات کرنے گئی ہیں۔“ زیبی پر تو نومی کی ان دو باتوں نے جیسے بجلی گرادی۔ فون ہاتھ سے گر گیا۔

”او مائی گاڈ......!“ زیبی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں شزا شرمندگی کے مارے کچھ بول نا پائی۔ اتنے میں حرا کمرے میں داخل ہوئی۔

”تو آج کی خبر یہ ہے کہ نومی بھائی اور شزا باجی ایک دوسرے کو ساری زندگی برداشت کرنے والے ہیں اور زیبی باجی کو سرمد بھائی برداشت کرنے والے ہیں۔“ زیبی نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہیں تھے۔

”حرا جاؤ تو ذرا ایک گلاس پانی لے آؤ پلیز......!“ شزا نے حرا کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔

”زیبی آر یو او کے......؟“ زیبی نے اپنی نظریں اٹھائیں۔

”مبارک ہو شزا میں بہت اسٹوپڈ ہوں مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب تم دونوں...... خیر شاید میں خود میں اتنا یقین رکھتی تھی کہ کچھ نظر ہی نہیں آیا۔“

”زیبی نومی سرپرائز دینا چاہتا تھا ورنہ کب کا بتا دیتے۔“

”اٹس او کے شزا تب بتاتے یا اب مجھے خوابوں کی دنیا سے باہر نکلنا ہی تھا۔“

”او مائی گاڈ میں کیا کچھ سوچ بیٹھی ایم سو اسٹوپڈ۔“

”زیبی پلیز ایسے مت بولو۔“ شزا کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

”سوری شزا۔“ زیبی سے آنسو ضبط نا ہوسکے وہ کمرے سے بھاگ گئی۔

□......☆......□

”مجھے اسی بات کا ڈر تھا نومی پر تم میری سنتے کہاں ہو۔“ شزا نومی کو فون پر بتا رہی تھی۔ ”تمہیں پتا ہے زیبی نے شاید کھانا بھی نہیں کھایا اپنے کمرے میں بند ہے میری تو ہمت ہی نہیں ہو رہی اس کا سامنا کرنے کی۔“

”یار مجھے کیا پتا تھا وہ مجھ میں انٹرسٹ لیتی ہے میں تو بس ایک دوست سمجھتا تھا اسے۔“

”پر وہ نہیں سمجھتی تھی نا۔“

”چلو سب ٹھیک ہو جائے گا میں زیبی سے خود

بات کروں گا۔"

"نومی اب اس سے کیسے بات کروں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ اتنی ہمت کہاں سے لاؤں بہت گلٹی فیل ہورہا ہے۔"

"یار شزا! اس ریلیٹی کو فیس تو کرنا ہے نا۔"

"خیر اب کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"

"ایسے وے رات بہت ہوگئی ہے میں فون رکھتی ہوں۔"

□......☆......□

"شزا کیسی ہو؟" زیبی دوسرے دن صبح شزا کے کمرے میں تھی۔

"آؤ زیبی بیٹھو میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔"

دونوں میں ایک منٹ کی خاموشی رہی۔

"زیبی آئی ایم سوری میں تمہارے پاس ہی آنے والی تھی۔" شزا نے ہی شروعات کی۔

"نہیں شزا تمہیں سوری بولنے کی کوئی ضرورت نہیں شاید میں نے ہی بہت سی امیدیں لگالی تھیں۔ کبھی سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ تمہیں چاہتا ہے تمہیں پتا ہے شزا رات بھر میں بہت روئی ایسا لگا جیسے کوئی بچہ ہو اور کوئی اس سے اس کا کھلونا چھین لے۔ تمہیں پتا ہے شزا جب دل ٹوٹتا ہے نا تو سب کچھ بدمزا ہو جاتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے رنگین دنیا سے کوئی سارے رنگ چرا لے لائف بہت بے معنی سی ہوجاتی ہے نا۔" ایک بے دل سی مسکراہٹ زیبی کے چہرے پر آئی شزا کچھ بول نہیں پائی۔ بس سنتی رہی۔

"خیر پھر مجھے سمجھ آیا کہ رشتے تو خدا نے آسمانوں پہ پہلے سے طے کر دیے ہوتے ہیں زمین پر تو بس رسمیں پوری کرنا ہوتی ہیں اور شاید نومی سے میری جوڑی لکھی ہی نہیں سرمد میرے نصیب میں ہے تو وہ ہی مجھے قبول ہے۔ شاید سرمد کی محبت میرے لیے میری محبت نومی کے لیے جو تھی اس سے بہت زیادہ ہے اسی لیے تو میں اسے مل گئی اور شاید تمہاری محبت میں بھی بہت طاقت ہے شزا! تم فکر مت کرنا میں کبھی بھی تمہارے اور نومی کے بیچ نہیں آؤں گی وعدہ ہے تم سے نومی میرا خواب تھا اور اب سرمد حقیقت ہے۔"

زیبی کی آنکھیں پھر سے بھر آئیں۔

شزا بس اس کی باتیں سنتی رہی زیبی کو پرنم دیکھ کر شزا نے اسے گلے لگالیا۔

"زیبی سوری اگر تم کہو تو میں نومی کو منالوں تمہارے لیے۔" ناجانے کہاں سے اتنی ہمت لائی شزا۔

زیبی نے ایک دم سے شزا کو پیچھے ہٹایا۔ "نہیں شزا نومی صرف تمہارا ہے تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں اور اس حقیقت کو میں نے تسلیم کرلیا ہے۔" شزا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

□......☆......□

"کافی دن گزر گئے نومی بھائی نہیں آئے۔" حرا کو ناجانے آج نومی کہاں سے یاد آگیا تھا زیبی کا ہاتھ چاول چنتے ایک دم سے رکا تھا۔ زیبی نے کوئی جواب نا دیا۔ چپ چاپ پھر سے چاول چننے لگی۔

"سرمد بھائی آپ کہاں جارہے ہیں؟" سرمد کو جاتا دیکھ کر حرا سے رہا نہ گیا۔

"وہ ذرا بازار جارہا ہوں کچھ چاہیے۔"

"ہاں زیبی باجی کہہ رہی تھیں کہ آج آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔" زیبی نے ایک دم سے حرا کو دیکھا۔

"پر میں نے کب کہا' نہیں سرمد تم جاؤ یہ ایسے ہی بول رہی ہے۔"

"لو جی میں نے کب ایسے ہی کہا؟ ابھی تو آپ نے کہا تھا نا سرمد بھائی سی آئی ڈی کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں۔" زیبی نے حرا کو روکنا چاہا۔

"اچھا یہ بات ہے تو چلتے ہیں چلو زیبی تم اور شزا تیار ہو جاؤ۔" سرمد نے ارادہ بنالیا۔ حرا نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

"نہیں سرمد تم لوگ جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی۔" زیبی نے صاف انکار کردیا۔

"او ہو زیبی باجی چلیں نا پلیز۔"

"نہیں حرا تم لوگ جاؤ۔"

"زیبی نہیں جائے گی تو پروگرام کینسل۔" سرمد نے بھی فیصلہ سنادیا۔

"زیبی باجی چلیں نا دیکھیں آپ نا گئیں تو ہم بھی نہیں جاسکتے پلیز!" حرا بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

زیبی نے آخر ہار مان لی اور چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔

"شزا تم چلوگی۔"

"نہیں آپ لوگ جاؤ مجھے بہت کام ہے۔"

"شزا ابھی نہیں جارہی ہم دونوں تھوڑا عجیب نہیں لگے گا؟" زیبی نے سرمد سے پوچھا۔

"اچھا ہے نا ہم دونوں کچھ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزاریں گے۔" زیبی نے سرمد کی طرف دیکھا پھر مسکرادی او کے چلتے ہیں۔

"زیبی تمہیں پتا ہے میں تمہیں بچپن سے بہت چاہتا تھا جب بھی تمہاری کوئی چیز گم ہو جاتی تو میں اپنی تمہیں دے دیتا۔" زیبی آئس کریم کھانے کے بہانے چمچہ ہلا رہی تھی۔

"زیبی تم اس رشتے سے خوش تو ہو نا۔" زیبی کا ہاتھ سرمد کے اس سوال سے رک گیا۔ نظریں اٹھیں سرمد کی طرف دیکھا۔

"سرمد میں بہت خوش ہوں۔"

"سچی۔"

"ہاں......!"

"اہم' اہم۔ اگر آپ دونوں کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو کیا مجھے پیسے ملیں گے اور آئس کریم کے لیے۔" حرا آن ٹپکی۔

"حرا کتنا کھاؤ گی میری ایک بھی ختم نہیں ہوئی اور تمہاری چار ختم ہوگئی۔"

"او ہو زیبی باجی آپ تو باتوں میں کھوئی ہیں پر میں نہیں دیکھو آپ دونوں کو اتنی باتیں کرنے کا موقع صرف میری وجہ سے ہی ملا ہے۔"

"اچھا بابا یہ لو اور جاؤ جو کھانا ہے کھاؤ۔" سرمد نے پیسے نکال کر دیے حرا نے خوشی سے پیسے لے لیے۔

"یا ہو یہ ہوئی بات۔" حرا پیسے لے کر بھاگ گئی۔

"یہ حرا بھی نا بالکل پاگل ہے۔" زیبی مسکرادی۔

□......☆......□

"ہیلو شزا کیسی ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں جناب آپ سناؤ۔"

"میں بھی ایک دم ٹھیک' کیا ہو رہا ہے؟"

دوسری طرف نومی تھا۔

"کچھ خاص نہیں کام کررہی ہوں۔"

"واہ جی تم کام بھی کرلیتی ہو؟"

"نہیں کام تو میرے نوکر کرتے ہیں میں تو بس حکم چلاتی ہوں۔ ہاں شادی کے بعد میں نے تو کام کرنے نہیں تمہیں یا تو خود کرنے ہوں گے یا کوئی نوکرانی رکھنی پڑے گی۔"

"ہاہا نہیں اماں ہیں نا وہ کام کروالیں گی تم سے میں بولوں گا ڈبل کام کروائیں اس سے۔"

"تم کتنے بدتمیز ہو مجھ معصوم سے کام...... چلو دیکھا جائے گا۔"

"اچھا اور سناؤ باقی سب کیا کررہے ہیں۔"

"زیبی اور سرمد آئس کریم کھانے گئے ہیں اور میں گھر پر ہوں۔"

"وہ دونوں اکیلے گئے ہیں؟" نومی کو حیرت ہوئی۔

"نہیں حرا بھی ساتھ ہے۔"

''پر زیبی کو تو آئس کریم اچھی نہیں لگتی۔'' نوی کو ابھی بھی حیرت تھی۔

''تمہیں کیسے پتا کہ اسے اچھی نہیں لگتی۔'' شزا نے نوی سے پوچھا۔

''یار میں اسے جانتا ہوں۔'' نوی نے اعتماد سے جواب دیا۔

''او پھر وہ سرمد کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی ہوگی اور کیا ویسے بھی اب انہیں ایک دوسرے کو ٹائم دینا چاہیے۔''

''ہاں پر سرمد نے مجھے نہیں بتایا۔''

''او ہو اب وہ ہر بات تمہیں تھوڑی بتائے گا۔'' شزا نے سمجھایا۔

''ہاں یہ بھی ہے اینی وے میں رکھتا ہوں بعد میں بات ہوگی اللہ حافظ۔'' نوی نے فون بند کردیا۔

□......☆......□

''ارے شزا باجی آپ کو پتا ہے میری ان معصوم آنکھوں نے کل کیا کیا دیکھا؟ توبہ ایک لڑکا' لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گارڈن ایریا میں چلے جارہے تھے۔ مجھ سے بھی رہا نا گیا میں نے بھی پیچھا شروع کیا وہ مجھے دیکھ کر اور تیز ہوئے میرے قدم بھی اور تیز چلنے لگے پھر جب میں پاس پہنچی تو دیکھا وہ کوئی اور نہیں اپنے سرمد بھائی اور زیبی آپا تھیں۔''

''سچی......!'' شزا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

زیبی نے حرا کو کھینچ کر کشن مارا۔

''حرا ٹھہر جاؤ۔'' سرمد کی نظریں کتاب پر تھیں پر کان حرا کی باتوں پر۔

''حرا لگتا ہے اب تمہیں آئس کریم کبھی نہیں ملنے والی۔''

''ارے سرمد بھائی میں تو مذاق کر رہی تھی۔ وہ دونوں آپ لوگ نہیں تھے وہ تو کوئی اور ہی تھے۔ اچھا چھوڑیں ساری باتیں یہ بتائیں کہ شادی پر کیا پہننے والے ہیں۔''

''میں سوچ رہا ہوں دھوتی کرتا سلوا لوں کیوں اچھا لگوں گا نا زیبی۔'' سرمد نے شرارت کی۔

''جی نہیں ایک دم کارٹون لگو گے میرا دلہا تو ایک اچھی سی شیروانی میں آنا چاہیے بگھی میں بیٹھ کر۔''

''بھئی کیا باتیں ہورہی ہیں۔'' نوی بھی آن پہنچا۔

''آیئے آپ ہی کی کمی تھی۔ کہاں تھے آپ اتنے دن؟'' حرا نے آتے ہی شروع کردیا۔ زیبی اپنی باتیں بھول گئی۔ نظریں نیچے کرلیں۔ شاید اب نوی سے نظریں ملانا یا بات کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔

''بس سنا تھا لوگ میرے پیچھے آئس کریم کھاتے رہے۔'' سرمد ہنس دیا۔

''نہیں یار بس زیبی ہی ضد کر رہی تھی۔'' زیبی نے سرمد کو دیکھا۔

ایک مسکراہٹ دونوں کے چہرے پر آئی۔ نوی نے دونوں کو دیکھا نا جانے کیوں اسے ان دونوں کی مسکراہٹ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''اچھا پر تمہیں تو آئس کریم اچھی نہیں لگتی تھی۔'' نوی نے زیبی سے سوال کر ڈالا۔ زیبی کی نظریں نوی سے ٹکرائیں پر جلدی سے ہٹالیں۔

''اب مجھے اچھی لگتی ہے۔'' زیبی کے اس مختصر سے جواب نے نوی کو لاجواب کر ڈالا۔ زیبی اٹھ کر چلی گئی۔ سوائے شزا کے کسی نے دونوں کے رویے کو نوٹ نہیں کیا۔

''نوی تم بھی نا کیوں بیچاری کو تنگ کرتے ہو۔'' شزا بول پڑی۔ نوی ہنسا۔

''بس ایسے ہی۔ عادت سے مجبور ہوں۔ یونو جب تک کسی کو تنگ نا کروں مزا نہیں آتا۔''

''زیبی تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی۔'' زیبی کپڑے استری کر رہی تھی جب نوی وہاں آن پہنچا۔ زیبی کو اس کی آمد کی خبر نا تھی۔

''تم کب آئے۔'' زیبی نے حیرت سے پوچھا۔

''کافی دیر ہوگئی' تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''کون سی بات۔'' زیبی نے بات کو ٹالنا چاہا۔

''یہی کہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی۔''

''کرتی تو ہوں اب بھی کر رہی ہوں۔'' زیبی نے مختصر جواب دیا۔

''ایسے کرتی تھی تم پہلے کیا۔'' نوی کے لہجہ میں شکوہ تھا۔

''نومی پہلے کی بات اور تھی بچپنا تھا ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ اب ہمیں حقیقت کی دنیا میں آجانا چاہیے چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے یہ زندگی نہیں ہے۔''

''زیبی کیا ہوگیا ہے یار تم ناراض ہو نا مجھ سے دیکھو آئم سوری لیکن میں تمہاری اس طرح ناراضگی نہیں دیکھ سکتا۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ میں ناراض ہوں۔'' زیبی نے پوچھا۔

''کسی نے نہیں بس تمہارے رویے نے۔''

''نہیں نومی ایسی بات نہیں ہے بھلا میں کیوں ناراض ہونے لگی تم سے اور ویسے بھی جو بات تم سوچ رہے ہو وہ تو کب کی میں بھول گئی۔ بس کبھی کبھی انسان دوسرے سے توقعات زیادہ بنا لیتا ہے۔ خیر چھوڑو اور بات اب بھی کرتی ہوں کم اس لیے کہ اب میرا نام سرمد سے جڑ گیا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ سرمد کو کچھ برا لگے یا کوئی ایسی بات ہو جو اسے پسند نا ہو۔''

زیبی کی باتیں نومی پر حیرت کے دروازے کھول رہی تھیں۔ یہ وہی زیبی تھی کہ نومی کے آتے ہی اس کے آگے پیچھے ہر وقت ساتھ مل کر شرارتیں کرنا پر اب یہ زیبی بالکل ویسی نہ تھی۔ نومی اسے دیکھتا رہا۔ زیبی نے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہ کی۔

''زیبی تم بہت بدل گئی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

زیبی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

زیبی کی آنکھیں پھر سے بھر آئیں۔ نوی کو زیبی کی باتیں بار بار یاد آرہی تھیں نا جانے کیوں اس کو زیبی کے اس رویہ سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ ''زیبی میری اچھی دوست تھی یار پر شاید محبت نے دوستی کو ختم کردیا اسے مجھ سے محبت ہے۔ پر اب تو نا محبت نا دوستی کیا سمجھوں میں اسے وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ اب بھی ہونی چاہیے آخر بدلا ہی کیا ہے بس نام ہی تو جڑا ہے اس کا سرمد سے۔ میں اس سے بات کروں تو سرمد کو کیوں برا لگے گا۔ آخر وہ بھی تو جانتا ہے نا کہ ہم کتنے اچھے دوست ہیں۔ پر زیبی کیوں ایسا سوچتی ہے۔ اوہو میرا دماغ گھوم رہا ہے۔'' فون کی گھنٹی نے نوی کو سوچوں سے آزاد کیا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف شزا تھی۔

''کیسے ہو۔''

''میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔''

''میں بھی ٹھیک ہوں سنا تم آج گھر آئے تھے۔ میرا ویٹ بھی نہیں کیا اور چلے بھی گئے۔''

''ہاں آیا تھا بس کچھ کام تھا تو جلدی چلا آیا۔''

''نومی جب سے ہماری شادی طے ہوئی ہے تم نے مجھ سے بات کرنا کم کردی ہے کہیں کوئی اور تو پسند نہیں آگئی۔'' شزا نے مذاق کیا۔

''کم آن شزا تم بھی نا بس پاگل ہو بس آج کل تھوڑا بزی ہوں اس لیے۔''

''او کے اچھا سنو مہندی پر کون سا رنگ پہنوں؟ گرین یا پھر یلو؟'' شزا نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''یار کوئی بھی پہن لو تم پر اچھا ہی لگے گا۔''

''سچی......؟'' شزا اور خوش ہوگئی۔

''ہاں یار سچی اچھا بعد میں بات کریں گے میں تھوڑا بزی ہوں۔''

''ٹھیک ہے اللہ حافظ۔'' شزا نے فون بند کردیا۔

زیبی کی باتیں ابھی بھی نومی کو پریشان کر رہی تھیں۔

"نومی یہ دیکھو یہ ڈریس میں نے اور زیبی نے پسند کیا ہے۔" سرمد نومی کو اپنے شادی کے کپڑے دکھا رہا تھا۔ زیبی، شزا، حرا سبھی موجود تھے۔ سرمد نے بے پروائی سے دیکھا۔

"یہ تم نے پسند کیا یا زیبی نے۔"

"آف کورس زیبی نے۔" سرمد نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو زیبی نے پسند کیا۔ زیبی تمہارے ٹیسٹ کو کیا ہوگیا ہے لگتا ہے سرمد کا اثر ہوگیا ہے تم پر یہ کیا پسند کیا؟" نومی کو جیسے یہ باتیں کرکے دلی سکون مل رہا تھا۔

زیبی نے حیرت سے نومی کی طرف دیکھا۔

"کیوں کیا ہوا اتنا اچھا تو ہے سرمد اس میں بہت اچھا لگے گا۔"

"ہاں شاید تم پر یہ سوٹ نا کرے۔" زیبی کے اس جواب نے نومی کو خاموش کر دیا۔

"چلو تم دونوں کی مرضی، میں اور شزا تو بیسٹ سیلیکشن کریں گے۔"

"ارے آپ لوگ بھی نا شادی کو ابھی ایک مہینہ پڑا ہے۔ پر آپ لوگ ابھی سے بورنگ ہوگئے ہیں۔" حرا سے بھی نا رہا گیا۔ "کافی دن ہوگئے ہم سب نے کوئی مستی نہیں کی۔ ایسا کرتے ہیں ٹرتھ یا ڈیئر کھیلتے ہیں۔"

"ہاں آئیڈیا اچھا ہے۔" نومی نے بھی ہاں کر ڈالی۔

"نہیں کوئی ضرورت نہیں ایسے ہی فضول ہے سب۔" زیبی نے صاف انکار کر دیا۔

"ہاں حرا سب فضول ہے چھوڑ دو۔" اب سرمد نے بھی زیبی کا ساتھ دیا نومی کو پھر جیسے کچھ برا لگا۔

"آپ تو زیبی آپا کا ہی ساتھ دیں گے۔ سرمد بھائی! پلیز دیکھیں کتنا مزا آئے گا آپ کو زیبی آپا کا واسطہ۔" حرا اموشنل بلیک میلنگ پر اُتر آئی۔ سرمد کو ہنسی آ گئی۔

"ہاہا حرا تم بھی نا قسم سے پورا ڈرامہ ہو چلو اب کھیل ہی لیتے ہیں۔"

"سرمد یہ تو ڈرامہ ہے ہی اب تم بھی اس کے ساتھ شروع ہوگئے۔" زیبی نے سرمد کو ڈانٹا۔

"یار دیکھو نا واسطہ کتنا بڑا دیا اس نے اب کھیلنا تو پڑے گا نا۔ شزا تم بھی آؤ۔" نومی نے شزا کو آواز دی۔

"زیبی آ جاؤ یار" نومی نے زیبی کو بھی پکارا۔

"نہیں تم لوگ کھیلو میں نہیں کھیل رہی۔" زیبی نے صاف انکار کر دیا۔

"میرے لیے آ جاؤ یار!" سرمد نے پیار بھرے انداز میں پکارا۔ زیبی نے سرمد کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

"او کے۔ کیا یاد کرو گے۔" زیبی بھی میدان میں اُتر آئی۔ نومی کو اندر ہی اندر جلن کھائے جا رہی تھی، زیبی اور سرمد کو دیکھ دیکھ کر۔

"او کے تو گیم کے کچھ رولز ہیں پہلے سب ٹرتھ بتائیں گے او کے اس کے بعد ڈیر۔" حرا نے گیم کے رولز واضح کیے۔ باٹل کو سپن کیا گیا۔ پہلی باری حرا کی آئی۔

"تو میڈم سوال یہ ہے کہ کوئی ایسا سچ بتاؤ جو اب تک تم نے نا بتایا ہو۔"

"او کے پر میرے بتانے کے بعد مجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا، پرامس۔" حرا نے اپنی تسلی کی سب نے پرامس کیا۔

"او کے تو سچ یہ ہے کہ شزا باجی کل جو آپ نے مجھے اپنا نیا سوٹ استری کرنے دیا تھا نا وہ مجھ سے جل گیا۔"

"حرا کی بچی میرا سوٹ، میں نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔ گیم ختم ہونے دو پھر بتاتی ہوں تمہیں۔"

"نومی بھیا بچایئے نا شزا باجی گیم کے رولز توڑ رہی ہیں۔"

"شزا بری بات چلو میں تمہیں نیا سوٹ لے دوں گا۔ ڈونٹ وری چلو اب ڈانٹنا بند کرو بے چاری کو۔" شزا غصے میں تھی پر چپ کر گئی۔ اگلی باری سرمد کی آ گئی۔ سرمد سے سوال شزا نے کیا۔

"سرمد زیبی کو کتنا چاہتے ہو؟"

"سوال تو ایزی ہے پر جواب بہت مشکل ہے اتنا کہ جتنا کبھی تمہیں نومی نے نا چاہا ہو یا اتنا کہ اسے پا کر ایسا لگا جیسا میری ادھوری زندگی مکمل ہوگئی۔ جیسے کچھ مسنگ تھا۔ پر اب مل گیا ہو۔ جیسے میری لائف کا مقصد ہی یہی ہو۔ جیسے......!"

"اچھا اب بس کرو یار پتا چل گیا اب ہمیں۔" نومی نے سرمد کی بات کاٹ ڈالی۔ زیبی اور سرمد ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ نومی کی بات پر دونوں چونکے۔

"او کے جناب جو آپ کا حکم۔" سرمد نے نومی کی بات جیسے مان لی۔ بوتل کو پھر سے گھمایا گیا۔ اب باری نومی کی تھی۔

حرا نے سوال پوچھنا چاہا۔

"ہاں تو نومی بھائی اگر آپ اور سرمد بھائی کو ایک ہی لڑکی پسند آ جاتی مطلب زیبی آپا یا شزا تو آپ کیا کرتے۔" تینوں کو حرا کے اس سوال نے ایک بار چونکا دیا۔

"حرا یہ کیسا سوال ہے؟" زیبی بول پڑی۔

"اگر ایسی بات ہوتی تو میں سرمد سے اپنی پسند چھین لیتا۔" نومی کے جواب نے سب کو اور بھی حیران کر دیا۔

"تب تو شکر ہے تمہاری پسند زیبی نہیں تھی۔" سرمد نے بات کو مذاق میں ٹال دیا۔

"ہاں سرمد شکر کرو۔" نومی نے زیبی کو دیکھا زیبی کو نومی کی باتیں چبھنے لگیں۔

"چلو دوبارہ گیم شروع کریں بوتل کو پھر سے گھمایا گیا۔ اب باری زیبی کی تھی۔

"زیبی سے سوال میں پوچھوں گا۔" نومی ایک دم سے بول پڑا۔

"تو مس زیبی کیا تمہیں سرمد کے علاوہ کسی اور سے کبھی محبت ہوئی۔" سوال چونکا دینے والا تھا۔ زیبی نے غصے سے نومی کو دیکھا۔ شزا کے رنگ اڑنے لگے نومی ریلیکس تھا۔ سرمد کے دل میں ایک ڈر کی لہر دوڑی حرا سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔

"شزا بول پڑی یہ کیسا سوال ہے نومی تم بھی نا حد کرتے ہو چلو کوئی اور سوال پوچھو۔"

"ہاں یار۔" سرمد بھی بولا۔

"نہیں سوال تو یہی رہے گا۔" نومی اور بھی ریلیکس ہوگیا۔ اب سب کی نظریں زیبی کی طرف مڑیں جو غصے کو مشکل سے قابو کیے ہوئے تھی۔

"ہاں ہوئی ہے۔" زیبی کے منہ سے نکلنے والی "ہاں" سے سرمد کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ شزا کو پسینے آنے لگے حرا حیرت سے تکنے لگی اور نومی شاید اس کا منتظر تھا۔ "ہاں مجھے تھی محبت بلکہ اب بھی ہے اور وہ محبت مجھے اپنی سب سے اچھی دوست شزا اور حرا سے ہے ان سے محبت سرمد کی محبت سے پہلے سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔" زیبی کے جواب نے سب کو ریلیکس کر دیا۔ نومی کو کچھ بہت بری طرح دل میں چبھا۔

"زیبی تمہاری ہاں نے تو میرے دل کی دھڑکن اور بھی تیز کر دی تھی۔ شکر کرو مجھے ہارٹ اٹیک نہیں ہوگیا۔" سرمد کی جان میں جیسے جان آ گئی تھی۔

"اوہو سرمد تم بھی نا۔" زیبی نے کشن سرمد کو مارا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ہارٹ اٹیک تمہیں کیوں آئے اس

کی ضرورت تو تمہارے دشمنوں کو ہے۔" نومی شزا کو اور شزا نومی کو دیکھے جا رہی تھیں۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں زیبی سے وہ سوال کرنے کی۔" شزا نومی سے جھگڑ رہی تھی۔

"بس یار مجھ سے رہا نہیں گیا۔ تم اس کا رویہ دیکھ رہی ہو۔ کتنا بدل گیا ہے پہلے وہ کیسی تھی اور اب کیسی ہے۔ مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتی۔ ہر وقت سرمد سرمد۔" نومی غصہ میں تھا۔

"تو کیا وہ نا کرے سرمد سرمد آخر وہ اس کی منگیتر ہے شادی ہونے والی ہے اور تمہیں کیوں اس کی اتنی پروا ہے اگر وہ دونوں اب خوش ہیں تو تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے آخر تم بھی تو یہی چاہتے تھے۔"

"ہاں چاہتا تھا' پر پتا نہیں اب میں کیا چاہتا ہوں۔"

نومی نے فون کاٹ دیا۔ شزا شاک کے عالم میں تھی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ نومی کیا کہہ گیا۔ اس کے دماغ میں نومی کی اور اپنی باتیں گھومنے لگیں۔

("ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھو......!"

"تم مجھ سے باتیں کرتے تھکتے نہیں۔ اتنی لمبی لمبی کالز کرتے ہو۔"

"وہ اس لیے کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

"سچی......!"

"ہاں جی مچی......!"

"اچھا اگر تم نے مجھ سے باتیں کرنا کم کر دیں تو۔"

"ویسے تو ایسا کبھی نہیں ہوگا اگر ہوا تو سمجھنا کہ تم بورنگ ہوگئی ہو یا مجھے کسی اور سے پیار ہوگیا ہے۔")

"نومی تمہیں کسی اور سے پیار ہوگیا ہے۔" شزا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

☐......☆......☐

"زیبی مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" زیبی اپنے کمرے میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جب شزا آئی۔

"آؤ شزا خیر تو ہے کیا بات ہے اتنی پریشان کیوں ہو۔" شزا زیبی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"زیبی کیا تم اب بھی نومی سے محبت کرتی ہو۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو کیا وہ بات تو کب کی ختم ہوگئی۔ تم اب تک اسی بات کو لے کر پریشان ہو۔ میں نومی کو بھول گئی۔ جب سے میری زندگی میں سرمد آیا اور شاید مجھے نومی سے محبت تھی بھی نہیں بس ایک ایٹریکشن تھی اور کچھ نہیں۔"

"شاید وہ تمہیں نہیں بھول پا رہا۔"

"کیا مطلب؟"

"زیبی مجھے لگتا ہے نومی مجھ سے نہیں تم سے محبت کرتا ہے۔" شزا کی باتیں زیبی کو الجھا رہی تھیں۔

"ہاں زیبی جب سے منگنی ہوئی ہے اس کا رویہ بدل گیا ہے۔ اب اسے مجھ سے زیادہ تمہاری فکر رہتی ہے۔ تم بات نہیں کرتیں تو اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ اب مجھ سے بات بھی بہت کم کرتا ہے۔"

"اوہو شزا ایسی بات نہیں ہے اسے مجھ سے محبت ہوتی تو وہ تم سے کیوں شادی کرنا چاہتا۔ تمہیں پتا ہے آج کل پھوپو کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اس لیے وہ بزی ہوگا اور اس کے ایگزامز بھی ہیں۔ میں جانتی ہوں وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے تم بس فکر نہ کرو۔"

"زیبی تمہیں یقین ہے نا۔" شزا جیسے کوئی تسلی چاہتی تھی۔

"ہاں بابا پورا یقین ہے تم اب بے فکر ہو جاؤ اور اپنی شادی کی تیاریاں کرو ساتھ میں میری بھی ہیلپ کرو۔" زیبی نے شزا کو تسلی دی شزا کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

زیبی پوری رات نومی کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیا اسے مجھ سے محبت ہے؟ شاید ہوگئی ہو پر اس نے

تھا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا پھر ایسا ...ال......؟ اگر اسے مجھ سے محبت ہے تو وہ بولتا کیوں ...ا؟ اگر اس نے بول دیا تو میں کیا کروں گی......؟ بہت سارے سوال زیبی کے دماغ میں گھوم رہے ...ے۔

اوہو یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں کیوں سوچ رہی ...ں مجھے سرمد کا سوچنا چاہیے نا کہ نومی کو۔ ہائے میری ...ست جسے چاہتی ہوں وہ میرا ہو نہیں سکتا۔ جسے نہیں ...اہتی ہوں میرا ہونے جا رہا ہے۔ کبھی کبھی انسان کتنا بے بس ہوتا ہے اسے چاہتے ہوئے بھی اپنی مرضی ...ے خلاف جانا پڑتا ہے۔ کیا ساری زندگی مجھے نومی اسی طرح یاد آتا رہے گا۔ کیا پتا وقت کے ساتھ بھول جاؤں۔ ہاں ایسا ہی ہوگا بالکل ایسا۔

☐......☆......☐

زیبی میرے دماغ سے کیوں نہیں نکل جاتی آخر کیوں پورا پورا دن بس زیبی' زیبی......! مجھے کیا ہوگیا ہے پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ جیسے جیسے شادی کے دن ...ذیک آ رہے تھے نومی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ...میں شاید زیبی کے بغیر نہیں رہ سکتا ہاں مجھے زیبی سے محبت ہے پر اب کیا ہو سکتا ہے سب کچھ تو میں نے خود ...اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا۔ نہیں اب بھی بہت کچھ ...ہو سکتا ہے زیبی کو میرا ہی ہونا ہوگا صرف میرا۔

ڈھولک شادی سے ہفتے پہلے ہی رکھ لی گئی۔ ...ڑکیاں گلے پھاڑ کر گانے گا رہی تھیں اور حرا ان میں ...فہرست تھی۔ زیبی اور شزا بھی بیٹھ کر لطف اندوز ہو ...رہی تھیں۔

مہندی سے لکھو گورے ہاتھوں پہ سکھیوں
میرے سنوریا کا نام میرے سنوریا کا نام

گانا گایا جا رہا تھا گانے کے الفاظ زیبی کے دل ...ے تار چھیڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا ...ن کتنا اچھا لگتا اگر نومی کا نام میرے ہاتھوں پہ لکھا جاتا ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کو چھو گئی۔ ایک لمبی آہ بھری میں بھی کتنی پاگل ہوں ہر وقت وہ بات سوچتی ہوں جو کبھی ہو نہیں سکتی۔ زیبی کی نظریں دروازے کی طرف ایسے ہی اٹھیں۔ سامنے نومی کھڑا تھا جو کہ زیبی کو ہی دیکھے جا رہا تھا۔ زیبی کے رنگ ایسے اڑے جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ زیبی نے نظریں چرا لیں۔ نومی ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ زیبی نے ایک دفعہ پھر سے دیکھا نومی نے کچھ اشارہ کیا شاید وہ اسے بلا رہا تھا۔ پر زیبی کو سمجھ نا آئی۔ زیبی نے "کیا ہے" کا اشارہ کیا نومی کچھ کہتا چھوٹے چاچو اسے لے کر چلے گئے۔ وہ کچھ کہہ نا پایا۔ زیبی ابھی بھی کشمکش و پیچ میں تھی پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا نومی۔ زیبی اٹھ کر کمرے سے باہر آئی پر نومی جا چکا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی؟ کوئی بات ہوتی تو وہ پھر سے آ جاتا خیر چھوڑو زیبی ایسے ہی سوچوں میں گم تھی۔ فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی حرا نے فون اٹھایا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف نومی تھا۔

"حرا کیسی ہو۔"

"میں ٹھیک آپ سنائیں کیسے ہیں؟ اور آپ آج آئے نہیں۔"

"بس ذرا کام تھا۔"

"اچھا جی شزا آپی کو بلاؤں؟"

"نہیں یہ بتاؤ گھر میں کون کون ہے؟"

"گھر میں سبھی ہیں کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔ اچھا زیبی پاس ہے۔"

"کیا زیبی آپا' ہاں یہاں ہی ہیں ابھی دیکھتی ہوں۔"

"ہاں ذرا دیکھو اور بلا دو۔ مجھے ضروری بات کرنی ہے کسی اور کو مت بتانا۔"

"کیا بات ہے نومی بھائی ایسی بھی کیا ضروری بات ہے۔"

''سمجھ لو زیبی کے لیے سرپرائز ہے۔'' نومی نے جان چھڑانا چاہی۔

''او اچھا چلیں میں بلاتی ہوں انہیں۔'' حرا فون رکھ کر چلی گئی۔

''زیبی باجی آپ کا فون ہے۔''

''کس کا ہے؟''

''نومی بھائی کا کچھ ضروری بات کرنی ہے آپ سے پر بتانے سے منع کیا ہے۔ آپ جائیں اور سن لیں۔''

''نومی......!'' زیبی کی دل کی دھڑکن تیز ہوئی یا اللہ خیر زیبی فون کی طرف بڑھی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو زیبی مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں کہو نومی میں سن رہی ہوں۔''

''زیبی میں کہنا چاہتا ہوں کہ......!''

اس سے پہلے کہ نومی کچھ کہتا شادی پر آئے کسی شرارتی بچے نے فون کی تار کاٹ دی۔

''ہیلو ہیلو نومی! ہیلو......!'' زیبی کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ دیکھا تو شرارتی بچوں نے فون کی تار کاٹ دی تھی۔ زیبی کو بہت غصہ آیا۔ زیبی چیخی۔

''حرا...... حرا......!'' حرا دوڑتی ہوئی آئی۔

''کیا ہوا......؟''

''حرا ذرا دیکھو یہ تار کٹ گئی اسے جوڑ دو پلیز۔''

حرا نے دیکھا۔ ''اوہو یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا رات کو سرمد بھائی آئیں گے ان کو بولنا پڑے گا۔''

''اوہو۔'' زیبی کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔

□......☆......□

آج مہندی کی رات تھی گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ مہندی سب کی اکٹھی ہی رکھی گئی تھی۔ شزا اور زیبی دونوں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ پر نومی اور سرمد بھی کسی سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ شزا کی رسم شروع تھی شزا اسٹیج پر بیٹھی تھی سارا انتظام گھر کے بیرونی حصہ میں کیا گیا تھا۔

زیبی ابھی کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ حرا اس کے ساتھ تھی پر مہندی کا شور شرابا دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔

''اوہو زیبی باجی میں جا رہی ہوں آپ کو لینے آؤں گی۔ بیس منٹ میں میں تھوڑا انجوائے کر کے آئی۔'' زیبی مسکرادی۔

''اچھا جلدی آنا۔'' حرا کمرے سے باہر چلی گئی۔

زیبی اپنی چوڑیاں پہن رہی تھی اس کے ہاتھ رک گئے۔ ''یہ تمہاری چوڑیاں کتنی پیاری لگتی ہیں تمہارے ہاتھوں میں۔''

اسے نومی کی کہی ہوئی باتیں یاد آرہی تھیں۔ شزا بول پڑی۔ ''نہیں جی میرے ہاتھوں میں بھی اچھی لگتی ہیں۔''

''نا نا جو بات زیبی کی کلائی کی ہے وہ تمہاری نہیں زیبی تو بس زیبی ہے۔'' ایک مسکراہٹ زیبی کے لبوں پر آئی۔ نومی میری کتنی تعریفیں کرتا تھا نا۔ پر شاید وہ سب شزا کو جلانے کی خاطر کرتا تھا۔ زیبی پھر سے چوڑیاں پہننے لگی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔

''آ گئی تم۔'' زیبی نے سمجھا حرا آئی ہے پر نومی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ہاں زیبی میں آ گیا۔'' زیبی نے ایک دم سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''نومی تم یہاں کیا کر رہے ہو۔''

''زیبی مجھے بہت پہلے یہاں آجانا چاہیے تھا۔ زیبی مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے میں کافی دنوں سے کوشش کر رہا ہوں۔ پر تم سے بات نہیں ہو پا رہی۔ پر آج اگر بات نہ ہو پائی تو ساری زندگی نہیں ہو پائے گی۔'' زیبی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''نومی تم کیا باتیں کر رہے ہو میری کچھ سمجھ میں ...آ رہا۔ میں جا رہی ہوں۔ باہر سب انتظار کر رہے ...گے۔'' زیبی آگے بڑھی۔

...نومی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ''زیبی آج میری بات نا سنی ...بہت پچھتاوا ہوگا تمہیں بھی اور مجھے بھی۔ زیبی میں ...اسے نہیں تم سے محبت کرتا ہوں یہ بات میں سمجھ ...ہی پایا۔ پر جب تمہارا نام سرمد سے جڑا تو مجھ سے ...اشت نہیں ہو پایا۔ مجھے تب احساس ہوا کہ مجھے تم ...محبت ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دن ...ات تمہاری سوچ' شزا تو جیسے شاید اتنی خاص تھی ہی ...یں میری زندگی میں جتنی کہ تم اور میں جانتا ہوں تم ...ھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہو۔''

زیبی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ''ایسی بات ...ہیں ہے نومی مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ وہ بس ایک ...ری ایکشن تھی جو مجھ پر حاوی ہوگئی پر اب میرے دل میں ایسا کچھ بھی نہیں۔''

''جھوٹ بول رہی ہو تم میری آنکھوں میں دیکھو ...مجھ سے نظریں ملا کر کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔''

نومی پر دیوانگی چھائی ہوئی تھی۔

''زیبی پلیز مجھے سچ بتاؤ مجھے۔ کہو کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے زیبی پلیز......!''

زیبی پھٹ پڑی۔

''ہاں میں محبت کرتی ہوں تم سے بہت محبت اتنی کہ شاید کبھی کسی اور سے نا کر پاؤں' نہیں رہ سکتی ...تمہارے بغیر پر اب تم آئے ہو مجھ سے یہ سب پوچھنے ...جب سب کچھ ختم ہوگیا۔ نا میرے ہاتھ میں کچھ ہے نا ...تمہارے۔'' زیبی کی آنکھیں بھر آئیں۔

''نہیں زیبی ابھی بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر تم ...چاہو تو میں سب کو منا لوں گا تمہاری ایک ہاں سے ہم ...دونوں کی زندگی بن جائے گی۔ نا کوئی غم ہوگا نا ...پچھتاوا۔'' زیبی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا دل کہہ رہا تھا ہاں ...دو۔ جی لو اپنی زندگی یہ موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔ پر دماغ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔

''بولو زیبی پلیز بولو۔''

''نومی میری ایک ہاں سے ہم دونوں کی زندگی تو بن جائے گی پر میری نا سے ان دونوں کی زندگی بن جائے جو ہمیں بہت چاہتے ہیں۔'' زیبی نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ ''اور شاید مجھے نا ہی کرنا چاہیے نومی۔''

''نہیں زیبی میری زندگی کا سوال ہے ساتھ میں تمہاری بھی پلیز زیبی۔'' نومی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زیبی مان جائے۔ ''ان دونوں کی زندگیاں بھی ہم سے جڑی ہیں۔''

''نومی میں اتنی سیلفش نہیں ہونا چاہتی کہ دو دل توڑ کر اپنا گھر بسالوں اور ویسے بھی اب بہت دیر ہو چکی۔ بہت دیر......!'' حرا کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔

''میں جا رہی ہوں باہر حرا آرہی ہے تم بھی سب بھول جاؤ اور شزا کے ہو جاؤ۔''

زیبی آنسو صاف کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

نومی کو ایسا لگا جیسے سب کچھ پا کر ایک دم سے کھو دیا کتنا یقین تھا کہ شاید کچھ ہو سکتا اب بھی۔ پر اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ نومی کی آنکھیں بھر آئیں سکتے کی سی کیفیت تھی اس پر۔

کاش کہ زیبی میں بہت پہلے جان لیتا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ آج یوں پچھتانا نہ پڑتا۔ آج سب کچھ بدل جاتا کاش میں وہاں ہوتا جہاں آج سرمد ہے۔ کاش یہ سب کچھ خواب ہوتا میں اٹھتا تو تم میری ہوتیں کاش۔ پر یہ کاش اب ساری زندگی کہ لیے اس کے ساتھ تھی۔

□

بدانجام

محترم عمران احمد مدیر نئے افق کراچی
تسلیمات!
زیر نظر کہانی دراصل ایک کورٹ رپورٹر کی ڈائری ہے جو اپنے شوق کے باعث کوئی نہ کوئی دلچسپ واقعہ ڈائری میں لکھ دیتا تھا۔ جبکہ میرا تعلق تدریس کے شعبہ سے ہے۔ یہ ڈائری اچانک میرے ہاتھ لگی تو میں نے اس دوست کی اجازت سے ان سچے واقعات کو کہانی کے پیرائے میں لکھنے کی اجازت مانگی۔ اس ڈائری سے ایک واقعہ نذر نئے افق کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو پسند آئے تو ہر دوسرے ماہ کوئی نہ کوئی واقعہ آپ کو ارسال کردیا کروں گا۔

والسلام
خلیل جبار
حیدر آباد

''ہاں بھئی آج تمہارے پاس جو خبریں جمع ہوگئی ہیں وہ لکھوادو مجھے آج جلدی گھر جانا ہے شام میں گھر پر قرآن خوانی ہے۔'' نعیم قریشی نے اپنی نوٹ بک نکالی۔

''ہاں ہاں میں ابھی لکھواتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔ اس وقت ہم کورٹ کے احاطے میں نوٹری پبلک اور اسٹامپ وینڈروں کے شیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کے چار بجے تھے۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہے جب کورٹ کی کارروائی ختم ہوچکی ہوتی ہے تو ہم کورٹ رپورٹرز بھی ایک دوسرے سے خبروں کا تبادلہ کرکے اپنے اپنے آفس پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں' اخبارات میں خبریں فیکس اور ای میل کرنے کا وقت پانچ سے چھ بجے تک کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اندرونی صفحات کو خبریں بھیجنے کا وقت ختم ہوجاتا ہے اور اخبارات کے بیرونی صفحات کو خبریں بھیجنے کا وقت چھ بجے سے رات بارہ بجے تک چلتا رہتا ہے۔ کورٹ کی خبریں اندرونی صفحات پر شائع ہوتی ہیں اس لیے ہماری ہرممکن کوشش ہوتی ہے کہ بروقت خبریں فائل کردیں۔

''نعیم صاحب' ان دنوں استاد پیارے نظر نہیں آرہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شکر کرو اچھا ہے نظر نہ آئیں ورنہ وہ ہمارا دماغ کھائے گا۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''استاد پیارے کو ہمارے دماغ کھانے کی بجائے گھاس کھانی چاہیے۔ اداکار رنگیلا مرحوم نے بھی فلموں میں خوب گھاس کھانے کی اداکاری کی ہے استاد پیارے کو بھی رنگیلا کی کاپی کرنی چاہیے۔ اس سے ان کو بڑا فائدہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' وہ چونکے۔

''استاد پیارے کی دور اور قریب کی نظر خراب ہے وہ گھاس کھانا شروع کردیں پھر دیکھیں کیسے ان کی آنکھیں اچھی ہوتی ہیں انہیں چشمہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''

''گھاس کھانے سے نظریں کس طرح تیز ہوں گی۔'' نعیم قریشی نے پوچھا۔

''کبھی آپ نے کسی جانور کو چشمہ لگاتے دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

''بس ثابت ہوگیا گھاس کھانے سے نظریں تیز ہوتی ہیں۔''

''یار تم بھی کبھی کبھی استاد پیارے کی طرح دلچسپ باتیں کرتے ہو۔'' نعیم قریشی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''صحبت کا اثر آ ہی جاتا ہے۔'' میں نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے ایک بات ہے استاد پیارے ہے دلچسپ آدمی۔ اکثر میں جب بستر پر لیٹتا ہوں تو استاد پیارے کی باتیں یاد آجانے پر خوب ہنسی آجاتی ہے۔ تمہاری بھابی کے پوچھنے پر میں جب انہیں استاد پیارے کی باتیں بتاتا ہوں وہ بھی ہنسی کے مارے دوہری ہوجاتی ہیں۔''

''ہوں غداری اور وہ بھی استاد پیارے سے۔ غداری کی جارہی ہے۔'' استاد پیارے نے شیڈ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''استاد پیارے آپ سے کون غداری کرسکتا ہے' آپ خود ہی غائب ہوجاتے ہیں۔ کورٹ میں روزانہ آپ کی غیر حاضری لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ تم یوں دھوپ میں پریشان نہ ہوا کرو دیکھو نعیم بھائی کا دھوپ میں گھوم گھوم کر رنگ کس قدر کالا پڑ گیا ہے۔ بیمار بھی رہنے لگے ہیں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''کیا کریں استاد ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ سخت دھوپ میں اس کورٹ سے اُس کورٹ میں جاکر خبریں تلاش کرتے ہیں۔''

''یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ اس عمر میں بھی اتنی محنت کرتے ہیں ایمان سے تم دونوں کو محنت کرتا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن جب تم استاد پیارے سے غداری کرتے ہو' تو اس وقت بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اگر میں کورٹ میں نہ آؤں تو آپ مجھے جمال کسٹمر سروس پر دیکھ لیا کرو میری ان دنوں ان سے اچھی دوستی ہوگئی ہے۔ وہ میری بڑی خدمت کرتے ہیں۔ کسٹمر سروس میں اے سی لگا ہوا ہے۔ لوگوں کے بیٹھنے کو کرسیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ وہاں آکر میرے ساتھ چائے پیو' سموسے کھاؤ مجھے تمہاری خبروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شام کو مختلف رپورٹرز وہاں خبریں فیکس کرنے کو آتے ہیں مجھے ساری خبریں ان سے مل جاتی ہیں۔ مجھے تمہاری خبروں کی ضرورت نہیں' مجھے بس تم دونوں سے محبت ہے اس لیے جب تک تم دونوں کو دیکھ نہ لوں چین نہیں آتا۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''استاد پیارے کبھی ہم نے آپ سے کوئی خبر چھپائی ہے۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''نعیم بھائی یہ آپ لوگوں کی محبت ہے کہ مجھ سے کوئی خبر نہیں چھپاتے ورنہ اور بھی کورٹ رپورٹر ہیں میں ان سے کبھی زیادہ بات نہیں کرتا لیکن آپ دونوں کے کورٹ میں نظر نہ آنے پر بے چین ہوجاتا ہوں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''اگر پیدا کی بات ہو تو یہ ایسے بن جاتے ہیں جیسے ہمیں جانتے ہی نہیں اور اس طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں جیسے طوطا چشم ہوں۔'' میں نے نعیم قریشی کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''خلیل جبار تم میں یہ عادت خراب ہے میں جب بھی کوئی اچھی بات کرتا ہوں تم کانا پھوسی شروع کردیتے ہو۔'' استاد پیارے کو میری یہ حرکت سخت ناگوار گزری تھی۔

''استاد یہ آپ کی تعریف کررہے ہیں کہ واقعی اس میں کوئی شک نہیں ہے استاد پیارے ہم کو اپنا سمجھتے

ہیں۔" نعیم قریشی نے استاد پیارے کے تیور دیکھ کر بات بنائی۔

"یہ بات کھل کر بولنا چاہیے تا کا ناپھوسی کرنے کا کیا فائدہ میں بھی یہ بات سننے سے محروم رہ گیا۔" استاد پیارے نے کہا۔

"خلیل جبار استاد پیارے کی کھل کر تعریف کیا کرو یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔" نعیم قریشی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"ارے صحافی برادری یہاں موجود ہے اور ایک اہم خبر ان کی وہاں منتظر ہے۔" سید سرفراز علی ایڈوکیٹ نے ہمیں وہاں دیکھ کر کہا۔

"اچھا کہاں ہے وہ خبر؟" استاد پیارے اچھی خبر کا سن کر چونکے۔

"سید سرفراز علی ایڈوکیٹ ہمارے اچھے ساتھی تھے۔ انہیں کوئی اچھی خبر ملتی تھی وہ ضرور بتاتے تھے۔ ان کی وکالت سے متعلق بھی ہم نے بہت خبریں چلائی تھیں اس لیے وہ ہماری بڑی عزت کرتے تھے۔

"وہ نیچے مسجد کے برابر والی سول کورٹ میں ایک مائی کو پولیس لائی ہے اس کے ساتھ اس کے تین آشنا بھی ہیں جنہوں نے مل کر ایک شخص کو قتل کیا ہے۔" سید سرفراز علی ایڈوکیٹ نے کہا۔

"ویری گڈ! میرے اخبار میں یہ خبر بڑے نمایاں انداز میں لگے گی۔" استاد پیارے کی گردن اکڑ گئی تھی۔ کلف لگے کپڑے پہننا ان کا شوق تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے پیلے جسم پر کلف لگے کپڑے ایسے لگتے تھے جیسے کسی نے بانس کو کپڑے پہنا دیئے ہوں۔

"جلدی کرو کہیں پولیس مائی کو لے نا جائے پولیس ملزمان کو ریمانڈ حاصل کرنے کو لائی ہے جیسے ہی عدالت سے ریمانڈ ملا پولیس ایک منٹ کورٹ میں نہیں رکے گی۔" سید سرفراز علی نے کہا۔

"جلدی کرو واقعی کورٹ کے بند ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔ کورٹ بند ہو جانے پر ہمیں یہ خبر نہیں مل سکے گی۔" نعیم قریشی نے کہا۔

سول کورٹ کے باہر میدان میں ایک سوزوکی کھڑی ہوئی تھی۔ میدان میں اگے ہوئے درخت کے نیچے چھاؤں میں ایک نوجوان عورت اور تین نوعمر لڑکے جن کی ابھی داڑھی مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں لگی ہوئی تھیں تا کہ وہ کورٹ کے احاطے سے فرار نہ ہو سکیں۔

"ایس ایچ او صاحب کیا حال ہیں استاد پیارے کی دعا سے تم بھی ایس ایچ او بن گئے ہو۔" استاد پیارے نے ایس ایچ او کو دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔

"آپ نے کب مجھے دعا دے دی۔" ایس ایچ او نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"یاد کرو ایک دن آپ کورٹ کی وہ سامنے والی کینٹین جس میں اکثر دن میں بھی اندھیرا ہی رہتا ہے بیٹھے ہوئے تھے اور ایک خبر بھی آپ نے لکھوائی تھی جس پر میں نے آپ کو دعا دی تھی کہ بہت جلد آپ ایس ایچ او بن جائیں۔" استاد پیارے نے اسے یاد دلایا۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا کہ کب ہماری ملاقات ہوئی تھی لیکن آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"پھر استاد پیارے کی مٹھائی کہاں ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے ایمان سے مٹھائی کا منہ نہیں دیکھا ہے۔" استاد پیارے نے کہا۔

"اس وقت میرے پاس یہ سو روپے ہی بچے ہیں یہ رکھ لو۔" ایس ایچ او نے استاد پیارے سے جان چھڑانے کو سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ استاد

کے چہرے پر سو کا نوٹ دیکھ کر مسکراہٹ دوڑ گئی اور انہوں نے فوراً سے وہ نوٹ جھپٹ لیا۔ انہیں خطرہ تھا کہ کہیں یہ نوٹ ایس ایچ او واپس جیب میں نہ رکھ لے۔

"استاد پیارے ایسی دعا ہمیں بھی دے دو تا کہ ہماری بھی ترقی ہو جائے۔ ہم بھی تمہیں مٹھائی کھلائیں گے۔" میں نے استاد پیارے کے کان میں سرگوشی کی۔

"خاموش ہو جاؤ کیوں میرا کام خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو۔" استاد پیارے نے آہستہ سے کہا۔

"ایس ایچ او صاحب کتنے دن کا ریمانڈ حاصل کیا ہے آپ نے؟" نعیم قریشی نے پوچھا۔

"ابھی فی الحال تین دن کا ریمانڈ ملا ہے۔ پھر تین دن بعد ہمیں مزید ریمانڈ لینے کو آنا پڑے گا۔" ایس ایچ او نے بتایا۔

"یہ کام بڑا اچھا ہو گیا کہ فوٹو گرافر بھی آ گئے ہیں۔" استاد پیارے نے فوٹو گرافر کو کورٹ کے احاطے میں آتا دیکھ کر کہا۔

کورٹ کی کچھ خبریں ایسی ہوتی ہیں جن کے ساتھ تصاویر لگنا ضروری ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم نے فوٹو گرافروں کو کہا ہوا تھا کہ جب بھی انہیں فرصت ملے ایک چکر کورٹ کا ضرور لگا لیا کریں۔

"تم لوگ بالکل اچھے وقت پر آئے ہو ان کی تصاویر بنا لو۔" استاد پیارے نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا

حکم ملتے ہی فوٹو گرافرز نے پوزیشن سنبھال لی۔

"میں تصویر نہیں بنواؤں گی۔" عورت نے دوپٹہ سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

"ہم تمہارے ناز نخرے برداشت کرنے نہیں آئے ہیں ان فوٹو گرافر کو اور بھی بہت کام کرنا ہیں۔ سیدھی طرح کھڑی ہو کر تصویر بنوا لے جتنی تو شریف ہے اس کا سب کو معلوم ہے کہ کس طرح تو نے اپنی شرافت کا مظاہرہ کر کے اپنے آشناؤں سے مل کر اپنے شوہر کو ہلاک کیا۔" استاد پیارے نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔

"استاد پیارے آج ایس ایچ او کا کردار ادا کر رہے ہیں۔" میں نے آہستہ سے نعیم قریشی کے کان میں کہا۔

"استاد پیارے کی پیدا ہونے پر اس میں زبردست پھرتی آ جاتی ہے دیکھتے رہو اس وقت یہ کیا کیا حرکتیں کرتا ہے۔" نعیم قریشی نے کہا۔

"نہیں...... نہیں میں تصویر نہیں بنواؤں گی۔" اس عورت نے انکار کیا۔

"تصویر تجھے بنوانی پڑے گی۔" استاد پیارے

عشق و محبت

♥ جب عشق پتلا ہوتا ہے تو خامیاں گاڑھی ہو جاتی ہیں۔

♥ عشق جسم چاہتا ہے دوستی دل۔ (اسپینی کہاوت)

♥ محبت کبھی مطالبہ نہیں کرتی۔ وہ تو ہمیشہ دیتی ہے نہ کبھی جھنجلاتی ہے نہ انتقام لیتی ہے۔ (گاندھی)

♥ عشق کاہل آدمی کے دل کا بھلاوا ہے۔ (نپولین)

♥ سزا دینے کا حق صرف اسے ہے جو سزا دینے والے سے محبت کرتا ہے۔ (ٹیگور)

♥ محبت انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ (بدھ)

♥ نفرت شیطان کا حصہ ہے۔ معافی انسان کا وصف ہے اور محبت فرشتوں کا۔ (بھرتری ہری)

♥ محبت میٹھا زہر ہے۔ (دانیال)

(نادیہ فاطمہ رضوی، کراچی)

نے کہا۔
"نہیں میں تصویر نہیں بنواؤں گی۔" عورت نے غصے سے کہا۔
"تصویر تیرا باپ بھی بنوائے گا۔"
"استاد پیارے کیا کہہ رہے ہو ہمیں اس کے باپ کی نہیں اس کی تصویر چاہیے۔" میں نے استاد پیارے کو ٹوکا۔
"اس کی تصویر ضرور بنے گی' میرے اخبار کی یہ بڑی خبر ہے کم از کم 5 کالم میں خبر لگے گی۔ خبر کے ساتھ تصویر سے جان پڑ جائے گی۔" استاد پیارے نے کہا۔
"ایس ایچ او صاحب آپ اپنی زبان میں اس کو سمجھائیں ہماری بات اس پر اثر نہیں کر رہی ہے۔" نعیم قریشی نے ایس ایچ او کو کہا۔
"سیدھی طرح تصویر بنوالے زیادہ شریف زادی بننے کی کوشش مت کر' ہمیں سب پتا ہے تیری شرافت کا۔" ایس ایچ او نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔
ایس ایچ او کا حکم سنتے ہی اس عورت نے اپنے چہرے سے پردہ ہٹالیا۔ فوٹو گرافرز نے فوراً تصاویر بنالیں۔ ان کے فارغ ہونے پر ہم اس عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔
"تم نے اپنے شوہر کا قتل کیوں کیا' کوئی خاندانی جھگڑا تھا یا کوئی اور وجہ تھی؟" نعیم قریشی نے پوچھا۔
"تم یہ پوچھ کر کیا کرو گے۔" اس عورت نے غصے سے نعیم قریشی کو دیکھا۔
اس عورت کی اپنی تصویر بن جانے پر وہ بہت غصے میں آ گئی تھی۔ ہم لوگوں پر اس کو غصہ بہت آ رہا تھا لیکن وہ کر کچھ نہیں سکتی تھی۔
"دیکھیں بی بی یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ کورٹ میں جو بھی مقدمات آتے ہیں ان کی تفصیلی خبر اپنے اخبارات کو شائع کرنے کو دیں۔ آپ ہمارے ساتھ تعاون کر کے بتاویں تاکہ ہم اس واقعہ کو اخبار میں ... کے طور پر شائع کر سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قتل آپ نے کسی مجبوری کے تحت کیا ہو' اور اس طرح کے واقعات کسی اور خاتون کے ساتھ پیش آئیں تو وہ ایسا کوئی اقدام نہ اٹھائے جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے جاتا ہو۔ لوگ دوسرے کے ساتھ گزری ہوئی باتوں سے بھی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔" میں نے اس کو سمجھایا۔
"کیا سب کچھ بتانا پڑے گا۔" اس نے ایس ایچ او کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں ہاں سب بتادو' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی تم لوگ آلۂ قتل سمیت پکڑے گئے ہو' بچنے کا تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ اچھا ہے کوئی عورت تمہاری طرح بھٹکنے سے بچ جائے۔" ایس ایچ او نے انتہائی نرم لہجے میں سمجھایا۔
"میرا نام حمیرا ہے' میں ابھی 6 سال کی ہی تھی کہ میری ماں بشیراں کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد کاشف نے اپنی تنہائی دور کرنے کو اپنے ایک واقف کار جواد علی کی بیٹی یاسمین سے شادی کر لی۔ ان کے مقابلے پر میرا ابا اس سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ جواد علی ٹی بی کے مرض کی آخری اسٹیج پر تھا' اس کا علاج اب ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے انتقال کر جانے پر کوئی بھی گھر میں نہیں تھا جو میری سوتیلی ماں کو سہارا دیتا۔ رشتے دار بھی اس وقت ساتھ دیتے ہیں جب مرنے والا اپنے پیچھے اچھی خاصی رقم چھوڑ جائے۔ جواد علی نے یہ سوچ کر اپنی بیٹی میرے ابا کو دی تھی کہ ابا رنڈوا ہے کنوارے کے مقابلے پر وہ اس کی بیٹی کا زیادہ خیال رکھے گا' اس کے خوب ناز نخرے اٹھائے گا اور مرنے سے پہلے وہ اپنی بیٹی کو بیاہنے کے فرض سے بھی فارغ

صلہ رحمی

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابوایوب سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کہتے
تھا۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شب جمعہ میں جمعرات کی شام ہمارے پاس تشریف لائے
ہ فرمایا۔
"ہماری اس مجلس میں جو بھی قطع رحمی کرنے والا بیٹھا ہوا ہے میں اسے تاکید سے کہتا ہوں کہ وہ ہمارے
پس سے اٹھ کر چلا جائے' اس پر کوئی کھڑا نہ ہوا۔ انہوں نے یہ بات تین دفعہ کہی تو اس پر ایک جوان اپنی
بوپی کے پاس گیا۔ جس سے اس نے دو سال سے تعلقات ختم کر رکھے تھے۔ اور اسے چھوڑا ہوا تھا۔ وہ
جب اپنی پھوپی کے پاس پہنچا تو پھوپھی نے اس سے پوچھا کہ "میاں تم کیسے آ گئے؟"
اس نے کہا "میں نے ابھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ اس وجہ سے
آیا ہوں۔" پھوپی نے کہا "ان کے پاس واپس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ انہوں نے ایسے کیوں فرمایا ہے؟"
اس جوان نے واپس جا کر ان سے پوچھا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
"میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شب جمعہ میں ہر جمعرات کی شام بنی
آدم کے اعمال اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں (اور انسانوں کے اعمال تو قبول ہو جاتے ہیں)
لیکن قطع رحمی کرنے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔"
"اس اقتباس میں اک بھرپور سبق ہے۔ کیا خیال ہے، بہن بھائیو۔"
(حافظ رحیم بخش...... ضلع خانیوال)

ہو جائے گا۔
میری سوتیلی ماں کم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی بہت تھی۔ شروع میں میری سوتیلی امی بلقیس بانو ڈری ڈری اور سہمی سہمی رہتی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آنے لگی تھی اور اس کا خوف جاتا رہا۔ وہ گھر میں بااختیار بن چکی تھی۔ اکثر وہ ایسے کام کر جاتی تھی جو کہ شوہر سے اجازت لیے بغیر نہیں کیے جاتے' وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور مجھ میں سمجھ بوجھ آتی جا رہی تھی۔ اس دوران میری امی سے نئے مہمانوں کا گھر میں اضافہ ہو چکا تھا۔ میرے دو بھائی نوید اور حامد اس دنیا میں آ چکے تھے' ان کی پیدائش سے امی کو حوصلہ ملا اور وہ گھر میں ایسے حکم چلانے لگی تھی جیسے اس گھر پر ان ہی کا حق ہے۔ مجھ سے وہ سوتیلے پن کا سلوک کرنے لگی تھی۔ اسکول سے بھی ہٹا دیا تھا۔ صرف مدرسے جانے کی اجازت تھی میں جب مدرسے سے گھر آتی تو شام ہو جاتی تھی۔
وہ خود آرام سے بیٹھی بناؤ سنگھار میں لگی رہتی اور مجھ سے گھر کا سارا کام کراتی رہتی تھی۔
ایک دن میں مدرسے سے بچوں کی جلدی چھٹی ہو جانے پر گھر چلی آئی' گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں گھر کے اندر داخل ہونے پر امی کو تلاش کرنے لگی لیکن امی نظر نہیں آئیں میں گھر میں حیران و پریشانی کے عالم میں تھی کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بیٹھک میں کوئی ہے میں تیزی سے بیٹھک کی جانب بڑھی۔ میں نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ ابھی میں دروازہ بجانا ہی چاہ رہی تھی کہ دروازہ کھلا' مجھے سامنے پا کر ایک لمحے کو امی کے

چہرے کا رنگ فق پڑ گیا لیکن پھر وہ سنبھل گئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''تو اتنی جلدی کیسے آ گئی ہے؟''

''وہ امی آج مولوی صاحب نہیں آئے تھے اس لیے سب بچوں کی چھٹی ہو گئی۔''

''کیا مولوی صاحب واقعی نہیں آئے تھے یا تو مسجد پڑھنے ہی نہیں گئی۔'' امی نے مجھے غصے سے گھورا۔

''ن...... نہیں...... امی واقعی مولوی صاحب نہیں آئے تھے۔'' میں امی کے اس طرح غصے سے گھورنے پر ڈر گئی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے جلدی سے برتن دھو لے۔'' امی نے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ امی مجھ پر زیادہ غصے ہوتی' میں برتن دھونے کو بیٹھ گئی۔ مجھے برتن دھوتا دیکھ کر وہ دوبارہ سے بیٹھک میں چلی گئی۔

دوسرے دن مدرسے جاتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ آخر بیٹھک میں کون تھا۔ امی نے کنڈی کیوں لگا رکھی تھی۔ مدرسے پہنچنے پر معلوم ہوا کہ آج بھی مولوی صاحب مدرسے نہیں آئے ہیں۔ دوسرے بچوں کی طرح خوش خوش میں بھی گھر لوٹ آئی۔ آج بھی کل کی طرح گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ امی کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ اچانک میری رگ تجسس پھڑکی اور میں بے اختیار بیٹھک کی طرف چلی گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازے میں ایسا کوئی سوراخ بھی نہیں تھا کہ اندر کا منظر نظر آ جائے۔ بیٹھک سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن اندر جو باتیں ہو رہی تھیں ان کا صحیح طریقے سے مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں تجسس کے سبب دیکھنا چاہتی تھی کہ اندر کون ہے اور کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ امی نے دروازہ اندر سے کیوں بند کیا ہوا ہے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ چھت پر ایک بڑا چھید ہے جس میں سے اکثر بارش کے دنوں میں بارش کا پانی بیٹھک میں جمع ہو جاتا ہے۔ میں تیزی کے ساتھ سیڑھی کے ذریعے بیٹھک کی چھت پر چڑھ گئی اور اس چھید کے اندر سے نیچے کو جھانکا' سوتیلی امی کسی نوجوان کے ساتھ چارپائی پر باتوں میں مگن تھی۔ کچھ دیر تک میں یونہی یہ منظر دیکھتی رہی اور پھر میں اس منظر میں کوئی کشش نہ دیکھ کر خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ کھانے کے استعمال شدہ برتن صاف ہونے کو رکھے ہوئے تھے میں خاموشی سے برتن دھونے لگ گئی۔ برتن دھلنے کی آواز سن کر ماں کو کچھ شک گزرا اور فوراً سے بیٹھک سے باہر نکل آئی اور مجھے برتن دھوتا دیکھ کر وہ میرے پاس آئی۔

''تو اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے تجھے مدرسے میں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ غصے سے بولی۔

''امی مولوی صاحب آج بھی چھٹی پر ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس مولوی کے بچے کو بھی بہت چھٹیاں کرنے کی عادت ہو گئی ہے مدرسے والوں کو چاہیے کہ وہ کسی اور مولوی کا انتظام کر لیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھک میں چلی گئیں۔

ان کے بیٹھک میں جانے پر میں برتن دھولے میں مصروف ہو گئی۔ مجھے اب تجسس ہو چلا تھا کہ یہ شخص کون ہے اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا اور میری سوتیلی ماں کو کیوں اس نے اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا۔ میں اکثر ہفتے میں ایک یا دو بار ضرور جلدی آ کر چھت پر چڑھ جاتی اور اس چھید سے ان کی حرکات وسکنات کو بغور دیکھتی رہتی۔ اس

عظیم الشان کرامات

کوئی نہیں مانتا تھا کہ ''امریکا'' کا مقابلہ کرنا ممکن ہے...... کوئی نہیں مانتا تھا کہ افغانستان میں نیٹو افواج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا...... بڑے بڑے عسکری پنڈت کہتے تھے مجاہدین زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک لڑ سکیں گے...... مگر یہ کیا ہوا؟ آٹھ سال سے زائد کا عرصہ بیت گیا۔ جدید طیارے بمباری کرتے کرتے گھس گئے۔ ٹینکوں کے دہانے آگ اگل اگل کر پگھل گئے۔ خلائی سیارے جاسوسی کر کر کے اندھے ہو گئے۔ ٹیکنالوجی کروٹیں بدل بدل کر شرمندہ ہو گئی۔ مگر افغانستان آج بھی تکبیر کے نعروں اور مجاہدین کے قدموں سے گونج رہا ہے...... کیا یہ کرامت نہیں ہے......؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ''قرآن کریم'' برحق ہے اسلام سچا دین ہے اور جہاد نا قابل تسخیر ہے؟ صدر اوباما نے اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں دوسری بار مزید فوج افغانستان بھیجی ہے اور ساتھ ہی اٹھارہ مہینے بعد اپنی افواج واپس بلانے کا اعلان کر دیا ہے...... اللہ اکبر...... تھوڑا سا سوچیں تو دل اللہ تعالیٰ کی عظمت سے بھر جاتا ہے۔ کہاں امریکا اور اس کی طاقت اور کہاں مجاہدین اور ان کی بے سروسامانی...... مگر اللہ پاک ایک ہے اور وہ غالب' قوت والا ہے۔

(''رنگ ونور'' سے اقتباس)

(ایم۔ کے مجاہد...... کراچی)

وقت میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ میری امی اس شخص کے ساتھ کیا کرتی ہے' لیکن پھر میری سمجھ میں آنے لگا تھا کہ یہ سب کیا چکر چل رہا ہے۔ میں نے ڈر کے مارے ابا کو اس لیے نہیں بتایا کہ سوتیلی امی مجھے اپنا راز کھلنے پر روئی کی طرح دھنک نہ دے۔

میری عمر جیسے جیسے بڑھ رہی تھی۔ میری سوتیلی ماں کی فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ شاید اس کو یہ خوف تھا کہ کہیں میں اس نوجوان کے گھر آنے کا ذکر نہ کر دوں۔ یہ بات محلے والوں سے کہاں چھپ سکتی تھی۔ محلے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ یہ بات ابا تک بھی پہنچ گئی کہ کوئی نوجوان اس کی غیر موجودگی میں آتا ہے اور بلقیس بانو کا اس کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے۔

ایک رات میں صحن میں سو رہی تھی کہ اچانک شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ امی اور ابا کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ میں نے غور سے ان کی بات سننے کی کوشش کی۔

''محلے والے جھوٹ بول رہے ہیں۔'' ابا زور سے گرجا۔

''ہاں ہاں دس بار کہوں گی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔'' امی بھی اسی لہجے میں چیخی۔

''ٹھیک ہے میں خود چیک کروں گا جس دن تم رنگے ہاتھوں پکڑی گئیں میں تجھے اور تیرے آشنا کو قتل کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔'' ابا نے سختی سے کہا۔

''ہاں ہاں قتل کر دینا میں ڈرتی نہیں ہوں۔'' امی نے کہا۔

ابا کو محلے والوں کی زبانی سب خبر لگ گئی تھی۔ اس نے خود اس نوجوان کو بیٹھک سے نکلتے دیکھ لیا تھا جو ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ ابا بھی مجبور تھا اس کو اپنی خوبصورت بیوی سے بہت محبت تھی۔ امیر لوگوں کو اس عمر میں بھی جوان بیوی مل جاتی ہے لیکن غریب لوگوں کو بیوہ عورت ملنا بھی مشکل ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیوی کی اس حرکت پر سخت غصے میں تھا لیکن وہ اس کو طلاق دینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ ابا کا امی کو ڈانٹنے

کا ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح وہ اس نوجوان لڑکے سے ملنا بند کردے تاکہ محلے والوں کی زبانیں بند ہوجائیں۔ امی بھی ضد کی پکی تھیں اس کو جس کام سے منع کیا جاتا تھا وہ ضرور کرتی تھی

کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی پھر کمرے سے ابا اور امی کے زور زور سے ہنسنے کی آواز آنے لگی۔ میں حیران تھی کہ چند لمحوں میں لڑائی دوستی میں تبدیل کیسے ہوگئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں کے درمیان کوئی خاموش معاہدہ ہوگیا ہے۔ ان کے درمیان کیا معاہدہ ہوا تھا میں اس سے بالکل بے خبر تھی۔

اس نوجوان نے اب گلی کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا' کئی ماہ ہونے پر بھی وہ پھر نہیں آیا۔ میں بھی خوش تھی کہ اچھا ہوا۔ ابا امی میں صلح ہوگئی اور ان کا گھر بکھرنے سے بچ گیا۔

ایک دن مجھے مولوی صاحب نے مدرسے سے جلدی چھٹی دے کر کچھ سامان پکڑا دیا کہ میں ان کے گھر دے آؤں۔ میں وہ سامان دے کر گھر آرہی تھی کہ ایک مکان سے ایک عورت باہر نکلی اس نے امی جیسا برقعہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہی نوجوان باہر آیا' دروازے کو تالا لگا کر وہ ایک طرف کو نکل گیا۔ وہ عورت بازار کی طرف چلی گئی۔ مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں کہ یہ عورت کون ہے۔ میں خاموشی سے اس کا پیچھا کرنے لگی۔ اس عورت نے سبزی والے سے سبزی خریدی اور آگے کو چل دی۔ جب چلتے چلتے وہ عورت ہماری گلی میں داخل ہوئی تو میرا ماتھا ٹھنکا یہ میری سوتیلی ماں ہے۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ میری سوتیلی ماں ہی ہے۔ میرے گھر میں داخل ہونے پر میری سوتیلی ماں تیر کی طرح میری طرف لپکی اور میری چٹیا پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔

''کیوں ری کلموئی میرا پیچھا کیوں کر رہی تھی؟''

''مم......مم......میں......تو......'' میں گھبرا سی گئی اور میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

''میرا راز جاننا چاہتی ہے کہ میں دن میں کہاں کہاں جاتی ہوں اور اپنے کس کس یار سے ملاقات کرتی ہوں۔'' اس نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''نن......نہیں......میں تو۔''

''بول جھوٹ' جھوٹ بولنا تیری پرانی عادت ہے۔'' اس نے میرے گال پر چٹکی لی۔ میں سی کر کے رہ گئی۔

''کان کھول کر سن لے اس راز کو کسی کے آگے مت کہنا اس میں تیرے ابا کی ہی بدنامی ہوگی۔ اس نے ہی مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ اپنے یار سے باہر مل لیا کرتا کہ محلے والوں کی زبانیں بند رہیں میری بات کو جھوٹ سمجھ رہی ہے تو شام کو اپنے ابا سے خود پوچھ لینا۔'' امی نے ایک جھٹکے سے میری چٹیا چھوڑ دی۔

''آج کے بعد میرا پیچھا نہ کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''امی میں مولوی صاحب کے گھر سامان دینے گئی تھی۔'' میں نے ہمت کرکے بات کہہ ہی دی۔

''کیوں میری اس پیاری کو پریشان کر رہی ہے مولوی صاحب کے گھر سامان دینے ہی گئی تھی اس پر اتنا گرم ہونے کی کونسی بات ہے۔'' ابا کی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا۔

ابا مسکین سی صورت بنا کر امی کو دیکھ رہے تھے۔

''اس کو سمجھا دینا کہ میرا پیچھا نہ کیا کرے ورنہ میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔'' امی نے غصے سے کہا۔

''نہ......نہ......تم گھر چھوڑ کر نہیں جانا۔ یہ تمہارا

پیچھا نہیں کرے گی۔''

گھر چھوڑنے کی دھمکی پر ابا کا چہرہ فق پڑ گیا تھا۔

''تو جا باہر صحن میں کھیل لے۔'' ابا نے میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ میں خاموشی سے کمرے سے باہر صحن میں آگئی۔

اس دن سے امی کا رویہ مجھ سے بڑا خراب رہنے لگا تھا۔ وہ بات بات پر جھڑکتی رہتی تھی اس طرح کی حرکتیں کرکے وہ سمجھتی تھی کہ میں اس سے ڈرتی رہوں گی اور کسی کے آگے اس کا راز افشا نہیں کروں گی۔

میری عمر ابھی بامشکل 16 سال ہوئی ہوگی کہ امی کو میری شادی کی فکر لگ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں جتنی جلدی ہو اپنے گھر کی ہوجاؤں۔ ابا بھی امی کی ہاں میں ہاں ملانے میں کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ امی نے میرا رشتہ اپنے ایک 40 سالہ کزن سے کردیا۔ میں نے اس شادی سے لاکھ انکار کیا لیکن وہ میری کہاں سننے والی تھیں' ان کا خیال تھا کہ بڑی عمر کے لوگ لڑکی کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ رشتہ داروں نے اس رشتے کی بڑی مخالفت کی اور ابا کو سمجھایا کہ کچھ صبر کرلو اپنی برادری میں ہی لڑکی کی عمر کا لڑکا مل جائے گا پھر شادی کردینا لڑکی کون سا گھر سے بھاگی جارہی ہے لیکن ابا نے کسی کی کوئی پروا نہ کی اور خاموشی سے میرا نکاح کاشف سے کرادیا۔ کاشف عیاش قسم کا آدمی تھا' اس نے اپنی ساری زندگی عیاشی میں گزاری تھی۔ حد سے زیادہ عیاشی نے اسے اندر سے کھوکھلا کرکے رکھ دیا تھا اس عمر میں نوعمر لڑکی مل جانے پر بڑا خوش تھا۔ اس کی جوانی کی عمر جیسے جیسے ڈھلنے لگی تھی مجھ پر نکھار آنے لگا تھا۔ محلے میں جب بھی باہر نکلتی تھی نوجوانوں کی نظریں مجھ پر مرکوز ہوجاتی تھیں۔ نوجوانوں کو اپنی

جانب متوجہ پاکر میں بہت خوش ہوتی تھی۔
میرے شوہر کاشف کی تیل کی دکان تھی۔ اس علاقے میں سب سے اچھی چلتی تھی۔ وہ تازہ تیل نکال کر دیتا تھا۔ دکان زیادہ بڑی نہ ہونے کی وجہ سے مختلف بیج جن سے تیل نکلتا ہے' وہ گھر پر رکھتا تھا۔ ضرورت کے مطابق دکان لے جاتا تھا۔ بیجوں سے تیل نکل جانے پر کھل رہ جاتا تھا۔ وہ بھی گھر لاکر رکھ دیتا تھا۔ گھر سے سامان لانے لی جانے کے لیے اس نے محلے کے ایک نوعمر لڑکے عمران کو رکھا ہوا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا چور نگاہوں سے میرے سراپے کو ٹٹولتا رہتا۔ پہلے پہل کو میں نے توجہ نہ دی لیکن پھر اس کی نظریں مجھے اپنے بدن میں گدگدی کرتی محسوس ہوتیں۔ دھیرے دھیرے مجھے بھی مزا آنے لگا۔ اب وہ جب بھی گھر آتا میں جان بوجھ کر اپنے بدن کو نمایاں کرنے لگی۔ میری خواہش ہوتی وہ زیادہ سے زیادہ مجھے دیکھے۔ لیکن میں اظہار کرنے سے ڈرتی تھی کہیں وہ میری بات کاشف سے نہ کہہ دے۔
وہ سخت گرمی کا دن تھا گرمی سے بے حال ہوکر میرا دل بے اختیار نہانے کو چاہنے لگا۔ بعض خواتین میں عادت ہوتی ہے کہ وہ غسل خانے کے دروازے کو بند ضرور کرلیتی ہیں لیکن کنڈی نہیں لگاتیں۔ میں بھی اس عادت میں مبتلا ہوں۔ گرمی کے زیادہ تنگ کرنے پر میں غسل خانے میں نہانے چلی گئی۔ اچانک ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دروازے کھل گیا۔ میری دروازے کی طرف پیٹھ تھی۔ اس لیے پتا ہی نہیں چل سکا۔ اس دوران میں اپنے چہرے پر پانی ڈونگے سے ڈال رہی تھی اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اپنی بانہوں میں بھرلیا ہے۔ میں سمجھی کہ کاشف ہے کیونکہ اکثر گھر میں موجود ہونے پر ایسی حرکتیں کرتے تھے۔ میں جب بے خودی ہونے لگی تو مجھے کسی اور کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا یہ لمس کاشف سے الگ تھا چنانچہ میں نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ وہ کاشف کے بجائے عمران تھا۔ عمران کی اس بے باکی میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں نے خود کو عمران سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ میری مسلسل خاموشی کو اس نے نیم رضامندی سمجھ کر شرارت کر ہی ڈالی۔ اس شرارت نے ہم دونوں میں ودستی کی فضا قائم کردی تھی۔
عمران کا قرب کیا ملا میں گلاب کی مانند کھل گئی۔ میں اپنے انجام سے بے خبر اپنی سوتیلی ماں کے نقش قدم پر چل نکلی تھی۔ عمران اپنے ساتھ دو اور دوستوں ندیم اور کلیم کو بھی لانے لگا تھا۔
جب بھی عمران سامان لینے گھر آتا وہ دیر سے دکان پہنچتا تھا۔ میرا شوہر اس پر سخت ناراض ہوتا اور مجھ سے اس کی شکایت کرتا لیکن میں اس ڈر سے کہ کہیں وہ دکان سے عمران کو فارغ نہ کردے اس کی حمایت کرتی تھی۔ جس پر کاشف چڑ جاتا۔
"تم اس کی کچھ زیادہ ہی حمایت لیتی ہو۔ میں اس کے چکر میں اپنی دکان تباہ کرلوں۔ آج کل گاہک بہت جلدی میں آتا ہے۔ ذرا دیر لگانے پر دوسری دکان پر چلا جاتا ہے۔ جس دن بھی مجھے غصہ آ گیا اسے کان پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔ پھر اس کو عقل آئے گی۔"
"ایسا کام نہ کرنا بے چارہ بے روزگار ہوجائے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔
"تم اس کی زیادہ حمایت مت لو۔" کاشف نے مجھے گھور کر دیکھا۔
"میں بھلا کیوں اس کی حمایت لوں گی میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اعتماد کا لڑکا ہے۔ دوسرا کوئی ملازم پتا نہیں کیسا آجائے دکان میں پیسوں کی خرد برد

دے۔"
"بس بس ٹھیک ہے آئندہ اس کی زیادہ وکالت نہیں کرنا ورنہ اچھی بات نہیں ہوگی۔"
"سچی بات پتا نہیں کیوں تمہیں کڑوی لگ رہی ہے۔" میں نے جل بھن کر کہا۔ میں کسی صورت نہیں چاہتی تھی کہ عمران کو میرا شوہر دکان سے نکال دے۔ اس دن وہ بات رفع دفع ہوگئی اور میں بھی اس واقعہ کو بھول گئی کہ اس دن کیا ہوا تھا۔
دن اچھے گزر رہے تھے میں جیسا چاہ رہی تھی ویسا ہی ہو رہا تھا۔ ایک دن عمران اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ گھر آ گیا۔ عمران نے مجھ کو بے اختیار بانہوں میں بھرلیا۔ اچانک میرا شوہر کاشف آ گیا۔ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار ہورہی تھیں۔
"بے شرم بے غیرت میرے پیچھے دن میں یہ رنگ رلیاں منائی ہے۔ میں بھی کہوں کہ تو عمران کی اتنی طرفداری کیوں کرتی ہے۔" کاشف غصے سے بری طرح کانپ رہا تھا۔
کاشف کلہاڑی لے کر ہم دونوں پر وار کرنے کو لپکا ابھی اس کی نظر ندیم اور کلیم پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اس کے ارادے بھانپ چکے تھے انہوں نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرکے کاشف پر حملہ کرکے کلہاڑی چھین لی۔ اس سے پہلے کہ کاشف سنبھلتا میں' ندیم اور کلیم نے کاشف کو مضبوطی سے پکڑلیا۔
"چھوڑو مجھے' میں تمہیں دیکھ لوں گا۔" کاشف چیخا۔
عمران نے پے در پے کلہاڑی کے کئی وار کرکے کاشف کو ہلاک کردیا۔ کاشف کے خون کے نشان' ہم یاروں کے کپڑوں پر لگ چکے تھے۔ ہمارے حق میں یہی بہتر تھا کہ اس جگہ کو فوری چھوڑ دیں۔ ہم ابھی یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ ہی بنا رہے تھے کہ محلے کے لوگ شور شرابے کی آواز سن کر گھر میں داخل ہوگئے اور ہم فرار ہونے سے پہلے ہی گرفتار ہوگئے۔
آج پولیس ہمیں ریمانڈ لینے کے لیے کورٹ لے کر آئی ہے۔ اس قتل سے ہم کسی طرح انکار کر ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ اس کے چشم دید گواہ محلے والے موجود ہیں۔
"ہم آپ کی یہ کہانی ضرور شائع کریں گے۔ شاید کوئی اور شخص بھٹکنے سے بچ جائے اور ایسا اقدام نہ کرے جو تم نے مل کر کیا ہے۔" میں نے کہا۔
"ہمیں اجازت ہے۔" ایس ایچ او نے ہماری طرف مصافے کو ہاتھ بڑھایا۔
"ہاں اجازت ہے۔" استاد پیارے نے مسکراتے ہوئے کہا۔
استاد پیارے کی معنی خیز مسکراہٹ بتارہی تھی کہ اس کے اخبار کے لیے بڑی اچھی خبر مل گئی ہے اور وہ تصور ہی تصور میں خبر کو اپنے اخبار میں تین کالم میں شائع ہوتا دیکھ رہے تھے۔ ہر اچھی خبر پر ان کی صورت ایسی ہوجاتی تھی ان کے اخبار کا مزاج ہی کرائم کی خبروں خصوصاً خواتین کے حوالے سے خبروں کو نمایاں انداز میں شائع کرنے کا تھا۔
رپورٹر کسی بھی اخبار کا ہو اس کی خبریں صبح کے اخبار میں دو یا تین کالم میں شائع ہوجانے پر یا بکس کی شکل میں شائع ہوجائے وہ سمجھتا ہے کہ محنت کام آ گئی اور وہ دن اس کا بڑا خوشگوار گزرتا ہے۔

❖

خوشبوئے سخن

عمر اسرار

تشنگی

اپنی روح کی
ردا
میرے وجدان پر
اوڑھ دو
کہ میری رگ رگ
پور پور میں
تشنگی ہے

سرور شاذ......منچن آباد

ادھورا پن

مئے اشک پیتا ہوں
یادتم جب آتے ہو
آخر کیوں؟
اتر گئے ہو مجھ میں
تم دیدۂ نم بن کر
اک
ادھورا خواب بن کر
ہجر کی شب میں
جگنو بن کر
کہاں پھر
گم ہو جاتے ہو
ستارۂ شام بن کر
ہاں!
میں ادھورا ہوں
تم بن
اک
ویران جزیرے کے مانند
برگِ صحرا کی مانند
آدھی رات کی مانند
ہاں!
بالکل ادھورا ہوں

عبدالحکیم ساجد......منچن آباد

غزل

ہو چکا اب کسی کا وہ
کبھی میری زندگی تھا وہ
کون بھولا ہے پہلی محبت
میری ساری خوشی تھا وہ
پھولوں کی طرح مسکراتا تھا
میری ہونٹوں کی ہنسی تھا وہ
بعد برسوں دیکھا تھا اسے
آج بھی اتنا حسین تھا وہ
زندگی جس کے نام کردی مجاہد
افسوس لوگ کہتے ہیں اجنبی تھا وہ

مجاہد ناز عباسی......سنجر پور

غزل

غم نے مارا بگڑے حالات نے مارا
اے ظالم مجھ کو تیری ذات نے مارا
زندگی کی ان خوشیوں کو
بے رحم صدمات نے مارا
تیری یاد نے پھر مضطر کیا
ساون کی برسات نے مارا
فرقت کے بے نور جہاں میں
یادوں کی بہتات نے مارا
ساتھ رقیبوں کے جو گزرے ہیں
تیرے ان لمحات نے مارا
یہ کیسی اپنی قسمت پرویز
جیت نے مارا مات نے مارا

رانا پرویز احمد......منچن آباد

غزل

قریۂ خلوت میں عمر بسر ہو جائے
کاش کہ دشت مرا گھر ہو جائے
خواہشوں کی راکھ میں لپٹا وجود
بے خواب رتوں کا منظر ہو جائے
تلخیٔ درد رہے تبسم میں پنہاں
چہرہ زرد، آنکھ سمندر ہو جائے
رنج مستقل یونہی جاوداں رہے
اشک چنتا رہوں اور سحر ہو جائے
رت جگوں کے ادھ کھلے دریچے میں
دامنِ خیال لہو سے تر ہو جائے
اداسیوں کی اب یہی صدا ہے
نخل الفت بے ثمر ہو جائے
آسودگی کا نام لیتا ہی نہیں
خدا کرے یہ دل پتھر ہو جائے

امیر حمزہ......منچن آباد

غزل

غم بھلانے کو یہی روز کیا کرتے ہیں
مئے جو اک زہر ہے وہ زہر پیا کرتے ہیں
روح گھائل ہے مگر چہرے پر مسکان سجی
اک الگ شان سے دیوانے جیا کرتے ہیں
خواب سجتے ہیں تری آنکھوں میں لیکن لڑکی!
یہ اگر ٹوٹیں تو بینائی لیا کرتے ہیں
ہم وہ میکش ہیں جو ہر روگ کو پیارے ساقی
زیست کے جام میں بھر بھر کے پیا کرتے ہیں
حسنِ مغرور وفاؤں کا ہے قاتل راغب
چاند چہرے ہی جفا عام کیا کرتے ہیں

راغب عثمان کیانی......راولپنڈی

غزل

مرجھا کے کالی جھیل میں گرتے ہوئے بھی دیکھ
ورج ہوں، میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ
کاغذ کی کترنوں کو بھی کہتے ہیں لوگ پھول
رنگوں کا اعتبار ہی کیا، سونگھ کے بھی دیکھ
عالم میں جس کی دھوم تھی اس شاہکار پر
دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ
تُو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پر بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے ہوئے بھی دیکھ
تلوے برہنہ پا نہیں اس جلتی ریت پر
تلوؤں میں جو ہو چکے ہیں وہ آبلے بھی دیکھ
بچھتی تھیں جس کی راہ میں پھولوں کی چادریں
اب اس کی خاک گھاس کے پیروں تلے بھی دیکھ
کیا شاخ باثمر ہے جو تکتا ہے واجد فرش کو
نظریں اٹھا اب، کبھی سامنے بھی دیکھ

پروفیسر واجد نگینوی......بلیز کراچی

غزل

یہ جو دل تھا خون کا دریا ہوا
جانے پھر کیا سے کیا ہوا
وہ میرے دل کا حال کیا جانے
اسے کیا معلوم پھر کیا ہوا
زندگی کے سفر میں آج پھر
پہلے کی طرح میں تنہا ہوا
شہر میں یہ قتل کیا ہوا
عجب سا ایک شور بپا ہوا
وہ تیر کر اس پار جائے گا کیسے
پانی دریا کا ہے ٹھہرا ہوا
اتنا تو سخت جان تھا میں بھی
زہر پی کر بھی یوں بچا ہوا

وسیم اختر......راولپنڈی

غزل

چھوڑ دو چھوٹی چھوٹی باتوں پر خود کو یوں بے حال رکھنا
غموں کے جھمیلوں میں جاناں دل کا اپنے خیال رکھنا
یاد ہے دیارِ غیر میں ملنا سب سے خندہ رد ہو کر

دل حزیں کا اے جانِ جاں یاد اک اک سوال رکھنا
بے ساختہ پن مری باتوں کا جو ہنساتا ہے تم کو اکثر
اداس لمحوں کے لیے مری ساری باتیں سنبھال رکھنا
عجب انداز سے ہیں توڑے رشتے ناتے بوقت رخصت
برہم سا تھا اگر چہ پھر بھی کہا کہ اپنا خیال رکھنا
ہار جاتی ہوں چند باتوں میں جانِ من سے یاد رکھنا
کوئی تو دیکھے گفتگو میں اس کا فنِ کمال رکھنا
بھول کر ساری رنجشیں بعد مرے اتنا ضرور کرنا
تربت پر مری جانِ جاں پھولوں کی اک ڈال رکھنا
مری یاد میں آنکھ تیری کبھی نم ہوئی کہ نہیں
ملا کہیں وہ عین تو اس سے پوچھنے کی مجال رکھنا

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم

غزل

جب کبھی دشمن نگاہیں مجھ کو دکھلانے لگے
ہم کو بے اختیار سارے دوست یاد آنے لگے
ایسا لگتا ہے تصور میں ہے اب تصویرِ یار
آئینے میں خود کو دیکھا اور شرمانے لگے
وقت مشکل ہو تو کوئی ساتھ یاں دیتا نہیں
دشمنوں کو چھوڑیے اب دوست کترانے لگے
سر زمین پاک پر دشمن مسلط ہوگئے
جل اٹھا سارا چمن اور پھول مرجھانے لگے
جا چکے ہو دل سے تم پھر خواب میں آتے ہو کیوں
زخم سارے روح کے اب ہم کو سمجھانے لگے
وہ ہوئے کچھ بد گماں ایسے کہ دل کہنے لگا
بے خبر دنیا سے تھے اب ہوش میں آنے لگے
ذکر ان کا چھیڑ کر یاروں نے بسمل کر دیا
ٹیس بھی اٹھنے لگی آنسو بھی اب آنے لگے
عشق کے دعوے بہت کرتے تھے یارانِ چمن
دیکھ کر حالت غزل کی وہ بھی پچھتانے لگے

سلمیٰ غزل...... کراچی

تعظیم

حق یہ ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے سوا ہے
ماں باپ کو دکھ دینا روا تھا نہ روا ہے
کہتے ہیں کہ یہ قول رسول ﷺ دوسرا ہے
ناراض ہیں ماں باپ تو ناراض خدا ہے
ماں باپ کی صورت میں اک آیت ہے خدا کی
ماں باپ کی تعظیم عبادت ہے خدا کی
بچپن میں جب کوئی سہارا نہیں ہوتا
کچھ کہنے کا کچھ کرنے کا یارا نہیں ہوتا
کروٹ بھی بدلنے کا اجارہ نہیں ہوتا
رونے کے سوا کوئی بھی چارہ نہیں ہوتا
اس لیے فریضہ یہ ادا کرتے ہیں ماں باپ
بچوں کے لیے جیتے ہوئے مرتے ہیں ماں باپ
خوش بخت ہے وہ جس کو ملا سایۂ رحمت
اس سایہ رحمت میں ہے ایک مخزن الفت
عظمت بخدا! ان کی دعاؤں کا اثر ہے
جنت جو زمین پر ہے وہ ماں باپ کا گھر ہے
ماں باپ کی خدمت میں جو مصروف رہے گا
تقدیر کے ہاتھوں سے وہ ایذا نہ سہے گا
خوش بخت ہیں وہ لوگ جنہیں اس کا یقیں ہے
ماں باپ کی خدمت کا صلہ خلد بریں ہے
یاں باپ ہیں، زندہ تو غنیمت اسے جانو
تعظیم کرو ان کی عبادت اسے جانو
جس بات سے وہ شاد ہوں راحت اسے جانو
خدمت کو کہیں وہ تو سعادت اسے جانو
اصحاب کو تاکید پیغمبر ﷺ تھی مسلسل
ماں باپ کی خدمات بجا لاؤ ہر اک پل
ناراض خدا ہوگا اگر ہوں یہ بے کل
ماں باپ کی دل جوئی شہادت سے ہے افضل
دنیا میں سکون، دین میں عزت نہ ملے گی
ماں باپ کو دکھ دو گے تو جنت نہ ملے گی

فقیر محمد بخش لنگاہ...... خانیوال

ذوقِ آگہی

عفان احمد

انفاق فی سبیل اللہ

☆ کیا آپ اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے ہیں؟
☆ کیا آپ توشۂ آخرت جمع کرنا چاہتے ہیں؟
تو پھر اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور کسی سے نہ گھبرائیں...... ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

”تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کردے۔ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

(البقرہ: ۲۴۰)

کیا آپ چاہتے ہیں کہ فرشتے آپ کے لیے دعا کریں کہ اے اللہ! ہر خرچ کرنے والے کو مزید عطا فرما۔ تو پھر اللہ کے راستے میں دل کھول کر خرچ کیجیے۔

وسیم اختر...... راولپنڈی

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا

حضرت معاذؓ بن جبل سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جنت کی کنجیاں اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

(مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان)

بشیر احمد بھٹی...... بہاولپور

درخت

ہرے درخت کو مت کاٹو کہ یہ درخت خدا کی حمد کرتے ہیں۔ ہرا درخت اس ماں کی طرح ہے جو اپنے بیمار بچے کی خاطر کالی راتوں میں جاگ کر اسے اپنی گرم آغوش میں چھپائے رکھتی ہے تاکہ رات کے آسیبوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس طرح یہ درخت بھی تم پر آنے والی بلاؤں کا رخ موڑ دیتے ہیں تم نے ریت کے میدانوں میں چلنے والے ان جھکڑوں کو دیکھا ہے جو ایک پراسرار قوت کے ساتھ ریت کے تودوں کو آن واحد میں مٹا دیتے ہیں لیکن یہی جھکڑ جب جنگلوں میں چلتے ہیں تو درخت انہیں زمین سے اٹھا کر خلاؤں کی طرف دھکیل دیتے ہیں تاکہ جنگل کے باسی اس سے محفوظ رہ سکیں۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

افسانچہ

میری سانس بہت پھول رہی ہے۔ میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگی ہوں۔ میں نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے جو یہ لوگ مجھے دیکھتے ہی مارنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں کہیں بھی جاؤں سب کی نگاہوں میں میرے لیے حقارت ہے میں کچن میں گئی تو وہاں موجود راشد صاحب کی بیٹی چیخیں مارتی ہوئی بھاگ گئی اور بھائی سے شور مچا کر بولی۔ ”پہلے اس کمبخت کو باہر نکالو۔“ میں وہاں سے بھاگ کر واش روم میں چھپ گئی تو وہاں بھی میرے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ میں جہاں بھی جاتی ہوں مجھے دیکھ کر لڑکیوں کی چیخ نکل جاتی ہے۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ یا اللہ تُو نے میری شکل ایسی کیوں بنائی ہے کسی کو میرے اوپر پیار کیوں نہیں آتا؟

آج اس گھر میں بہت رونق ہے شاید کسی کی شادی ہے اس کی جو مجھ سے بہت نفرت کرتی ہے حالانکہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے کمرے میں جا کر اسے دیکھتی رہوں۔ رات کو جب سب سو جاتے ہیں تو میں چپکے سے اس کے کمرے میں چلی جاتی ہوں اور جی بھر کے اسے دیکھتی ہوں اور پھر چپکے سے اس کے جاگنے سے پہلے نکل جاتی ہوں کہ اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو

خالی دامن

محمد اعظم خان

خواہشیں کس دل میں جنم نہیں لیتیں۔ ہر ذی روح اپنا آج اور کل اچھا اور خوشگوار بنانے کی خواہش اور تمنا رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے کہ
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
مگر زمانے میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خواہشوں کے غلام بن کر خود غرضی کے اسیر بن جاتے ہیں۔ جب خواہشیں خود غرضی میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو انسان انسانیت کے رتبے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی اسے نہ تو اپنی تمناؤں کے آگے دیکھنے دیتی ہے نہ سمجھنے بس وہ اپنی خوشی چاہتا ہے اور ہر قیمت و ہر طریقے سے......

ایک خواہشوں کے غلام کا قصہ، اس کی پیاس صرف ایک بوند تھی مگر وہ پورا دریا پی جانا چاہتا تھا

کرم دین کے بھائی ایک ایک کر کے اپنے اپنے بیوی بچوں کو لیے، پنچھیوں کی طرح ماں کا آشیانہ چھوڑ کر اڑ گئے تھے۔ خاوند کی موت کے بعد عظمت بی بی نے بچوں کو ممتا کی آغوش میں چھپا لیا تھا، وہ اپنے بچوں کو ہر طوفان سے بچانے کے لیے تند و تیز ہواؤں سے لڑتی رہی، انہیں اپنی ہمت کے مطابق اچھا کھلایا پلایا، تعلیم دلوائی اور پھر ان کی شادیاں کیں، لیکن ان سب نے اسے چھوڑ کر جانے میں ذرا سی بھی دیر نہیں کی تھی۔

وہ اذان کی آواز سن کر فجر کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھی تھی، ابھی تک ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اس کا جوان بیٹا، کرم دین، اپنے کمرے میں لیٹا گہری نیند کے مزے لے رہا تھا، عظمت بی بی نے باتھ روم کا بلب جلا رکھا تھا اور وضو کر رہی تھی، اچانک اندھیرا چھا گیا، اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور اندھیرے میں ہی اپنا وضو مکمل کیا، پھر اپنے دوپٹے کے پلو سے چہرہ اور بازو خشک کر کے دیوار کو پکڑ پکڑ کر پاؤں گھسیٹتی ہوئی کچن کی طرف بڑھنے لگی، تاکہ ماچس ڈھونڈ کر موم بتی جلا لے۔

باورچی خانے میں موجود ہر چیز کے بارے میں وہ اچھی طرح آگاہ تھی کہ کون سی چیز کہاں پڑی ہے، کیونکہ بوڑھی ہونے کے باوجود اپنے اور کرم دین کے لیے کھانا اسی کو تیار کرنا پڑتا تھا، یوں بھی بہوؤں کے ہوتے ہوئے بھی کھانے پکانے کا کام اسی کی ذمہ داری تھی، جب اس کے بیٹے، بہوئیں اور پوتے پوتیاں، اس کے ہاتھوں کے پکے ہوئے کھانوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے "اماں کے ہاتھوں میں جو ذائقہ ہے وہ کسی اور کے ہاتھوں میں نہیں" تو اسے دلی اطمینان ہوتا تھا۔ عظمت بی بی کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ سب کو اپنے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا کھلائے، اس لیے اس کا زیادہ تر وقت باورچی خانے میں ہی گزرتا تھا، پھر جب اسے کئی بیماریوں نے ایک ساتھ گھیر لیا تو نہ اس میں پکانے کی ہمت رہی اور نہ ہی کھانے والے رہے۔

اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر باآسانی ماچس تلاش کر لی تھی، پھر ایک تیلی نکال کر اسے جلانے لگی تاکہ موم بتی جلائی جا سکے، ماچس کی تیلی پہلی ہی کوشش سے جل گئی تھی مگر اسے کوئی بھی چیز

دکھائی نہیں دی تھی، اس نے یہ سوچ کر وہ تیلی نیچے پھینک دی کہ شاید وہ جلی ہی نہیں تھی، اس نے دو تین بار یہی عمل دہرایا لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

وہ الجھ کر رہ گئی تھی، اسے ماچس کی تیلی جلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، مگر روشنی کیوں نہیں ہو رہی تھی، اس نے آخری کوشش کے طور پر ایک اور تیلی جلائی، اب اس نے تیلی پر لگے مسالے کو آگ لگنے کی آواز اپنے کانوں سے سنی تھی مگر روشنی پھر بھی نہیں ہوئی تھی، اس بار اس نے تیلی پھینکنے کی بجائے، ہاتھ میں ہی پکڑے رکھی تھی، جب آگ کی تپش اس کی انگلیوں کو محسوس ہونے لگی تو اس نے جلدی سے تیلی نیچے پھینک دی۔

یہ جان کر وہ کانپ اٹھی تھی کہ اس کی آنکھوں کی بینائی اچانک ختم ہو گئی تھی، وہ سوچنے لگی کہ یقیناً بلب بھی اسی طرح روشن ہو گا اور ماچس کی تیلیاں بھی جلتی رہی ہوں گی، مگر اسی کی آنکھیں کچھ دیکھ نہیں پائیں۔

یہ خیال آتے ہی، وہ چیختے ہوئے کرم دین کو آوازیں دینے لگی، اس کی آواز میں اس قدر دکھ اور درد شامل تھا کہ جو بھی سنتا دوڑا چلا آتا، مگر ایک کرم دین تھا کہ آوازیں سن کر بھی سکون سے لیٹا ہوا تھا، کیونکہ اس طرح کی آوازیں ہر صبح اس کے کانوں میں پڑا کرتی تھیں، جب اس کی ماں اسے فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے پکارتی تھی، اور اس کے نہ اٹھنے پر تھک ہار کر خود ہی خاموش ہو جاتی تھی۔

ماں کی آواز کرم دین کے کانوں میں پڑی تھی، لیکن اس نے سنی ان سنی کی اور روز کی طرح کروٹ بدل کر پھر سے آنکھیں بند کر لی تھیں، عظمت بی بی نے یہ سوچ کر کہ شاید اس کی آواز کرم دین کے کانوں میں نہیں پڑی تھی، اس لیے اس نے ایک دو بار نام لے کر کرم دین کو اونچی آواز میں پکارا، مگر جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے مایوس ہو کر اپنی چارپائی تک جانے کا فیصلہ کر لیا اور دیوار کو ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ کچن کی دیوار سے آگے نکلتے ہی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے ساتھ ساتھ چل کر وہ اپنے کمرے میں پہنچ جاتی، اس نے اپنا دایاں بازو آگے کی طرف پھیلا دیا اور اسے دائیں بائیں لہراتی ہوئی قدم بڑھانے لگی، مگر اسے ایسا کرنے میں انتہائی دشواری محسوس ہو رہی تھی، اس لیے وہ پاؤں کے بل زمین پر بیٹھ گئی، کچن سے کمرے تک چند گز کا فاصلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا، وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین ٹٹولتے ہوئے کبھی اپنا دایاں پاؤں آگے بڑھاتی کبھی بایاں۔

وہ چند قدم بھی آگے بڑھ نہ پائی تھی کہ اس کی ہمت جواب دے گئی، ان لمحوں میں اسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ زمین پر ڈھیر ہوئی بیٹھی تھی، کوئی بھی تو نہیں تھا جو اسے سہارا دے کر چارپائی تک لے جاتا، اس کے وہ بیٹے جنہیں اس کے بڑھاپے کا سہارا بننا تھا، وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے، اور جسے ابھی اس کے سہارے کی ضرورت تھی، اس لیے مجبوراً اس کے پاس تھا، وہ بھی بے خبر سو رہا تھا۔

عظمت بی بی مجبور ہو کر آخری کوشش کے طور پر، روتی ہوئی پھر سے کرم دین کو پکارنے لگی، کرم دین کی کوشش تھی کہ کسی طرح ماں آوازیں دینا بند کر دے اور اسے جانا نہ پڑے، لیکن وہ اسے مسلسل آوازیں دیے جا رہی تھی، اس لیے اسے مجبوراً چارپائی چھوڑنا پڑی، وہ آنکھیں ملتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو اپنی ماں کو فرش پر بیٹھے ہوئے پایا۔

"یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو.....؟" ماں کو نیچے بیٹھے دیکھ کر کرم دین نے دریافت کیا۔

"مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا بچے....." عظمت بی بی

نے بیٹے کی آواز سن کر روتے ہوئے کہا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا..... چکر آنے سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا ہوگا.....اس لیے ایسا لگ رہا ہے" کرم دین نے بات کی اور پھر اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا "چلو تمہیں چارپائی پر بٹھا دوں۔"
کرم دین کے اٹھانے پر عظمت بی بی نے ہاتھوں سے ٹٹول کر اپنا دایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا اور گر جانے کے خوف سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔
"لو اب یہاں سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ..... کچھ دیر بعد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی" کرم دین نے ماں کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہا۔
"اچھا بچے، خدا تمہاری زبان مبارک کرے....." عظمت بی بی نے کمزور سی آواز میں بات کی اور کرم دین کے کہنے کے مطابق آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔
کرم دین ماں کو لٹا کر واپس اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا تھا، عظمت بی بی نے بیٹے کے کہنے پر آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر وہ جان چکی تھی کہ اس کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو چکی ہے، اسی لیے تو اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر بھی اس نے دل کی تسلی کے لیے آنکھیں بند کیے رکھیں، پھر تھوڑی ہی دیر بعد یہ جاننے کے لیے کہ اسے کچھ دکھائی دے رہا ہے یا نہیں، اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی، مگر اسے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔
جب عظمت بی بی کو کچھ نظر نہ آیا تو وہ یہ سوچ کر آنسو بہانے لگی کہ اگر اس کی آنکھوں کی بینائی واقعی چلی گئی ہے تو پھر کرم دین کا کیا بنے گا، وہ کس طرح زندگی گزار پائے گا، اس کے لیے کھانا کون پکائے گا، ان کے کپڑے کیسے دھلیں گے، اسے اپنے وہ بیٹے یاد آنے لگے، جو جب سے اسے چھوڑ کر گئے تھے، کبھی بھولے سے بھی لوٹ کر نہیں آئے تھے، وہ ماں، جس نے انہیں جنم دیا تھا اور انہیں پالنے کے لیے بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں، کم از کم کبھی ایک بار تو آ کر دیکھ لیتے کہ وہ کس حال میں ہے..... لیکن وہ لوٹ کر اس گندی بستی میں کیوں آتے، جہاں رہتے ہوئے ان کے بچوں کی صحت پر برا اثر پڑ جاتا، مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ اسی بستی کی گندی گلیوں میں رہتے ہوئے ہی پل بڑھ کر کسی قابل ہوئے تھے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں جنم دینے والی ماں اب بھی وہیں رہ رہی تھی، جہاں انہیں عید تہوار پر بھی آنا گوارہ نہیں تھا، وہ سوچنے لگی کہ کیا اتنے سالوں میں کبھی ایک بار بھی انہیں ماں اور بھائی کی یاد نہیں آئی تھی، کیا کبھی ان کی بیویوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر وہ کسی کی ماں ہیں تو ان کا خاوند بھی تو کسی کا بیٹا ہے، کیا اس کی ماں اس کے لیے نہیں تڑپتی ہوگی..... خیالات کا سلسلہ ایسا چلا کہ وہ جیسے جیسے سوچتی جاتی تھی، آنسوؤں کے بہاؤ میں تیزی آتی جاتی تھی۔
دن چڑھ آیا تھا، عظمت بی بی کے آنسو مسلسل جاری تھے، کبھی کبھی وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگتی کہ شاید اس کی بینائی لوٹ آئی ہو، لیکن جب اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تو وہ پھر سے رونے لگتی۔
کرم دین کچھ دنوں سے فارغ ہی پھر رہا تھا، اس نے کبھی کہیں ٹک کر کام نہیں کیا تھا، وہ بمشکل ہی کہیں سیٹ ہو پاتا تھا، کہیں سے مالکان نکال دیتے اور کہیں سے وہ خود چھوڑ آتا تھا۔ اس نے کہیں کام پر نہیں جانا تھا، اس لیے سکون سے اٹھا اور نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر کے حسبِ عادت ناشتہ کرنے کے لیے ماں کے

پاس پہنچ گیا۔
"لاؤ ماں جلدی سے ناشتہ دو....." کرم دین نے اپنی عادت کے مطابق کمرے میں آتے ہی بات کی۔
"میں صدقے جاؤں اپنے بچے کے..... بھوک لگی ہوگی....." عظمت بی بی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔
"ابھی کوئی کسر ہے ماں؟ اتنی دیر تو ہوگئی ہے۔"
"میں کتنی بدنصیب ہوں میرے بچے کو بھوک لگی ہے، اور میں اٹھ کر اسے کھانا بھی نہیں دے سکتی۔" عظمت بی بی نے روتے ہوئے کہا۔
"کیا بات ہے ماں! رو کیوں رہی ہو؟"
"مجھے کچھ نظر ہی نہیں آرہا۔"
"کمال ہے ماں! اس وقت سے ایسے ہی لیٹی ہو، اٹھ کر آنکھوں پہ پانی کے چھینٹے مار لیتی تو کب کی ٹھیک ہو چکی ہوتی۔"
"اچھا بچے یہ بھی کر کے دیکھ لیتی ہوں۔ تم کسی برتن میں مجھے پانی لا دو۔"
ماں کی بات سن کر کرم دین کچن سے جگ میں پانی بھر لایا اور عظمت بی بی ہاتھوں میں پانی ڈال کر اپنی آنکھوں پر چھینٹے مارنے لگی، جب تک پانی ختم نہ ہوا، کرم دین، ماں کے ہاتھوں پہ پانی ڈالتا رہا اور وہ چھینٹے مارتی رہی، پانی ختم ہو گیا تو عظمت بی بی دوپٹے کے پلو سے اپنے ہاتھ اور منہ صاف کرنے کے بعد آنکھوں کو جھپکنے لگی۔
"اب نظر آرہا ہے؟" کرم دین نے ماں کو آنکھیں جھپکاتے ہوئے دیکھ کر دریافت کیا۔
"کچھ بھی نظر نہیں آرہا..... بچے کچھ بھی نظر نہیں آرہا" عظمت بی بی یہ کہتے ہوئے پھر سے رونے لگی۔
"روتی کیوں ہو؟"
"روؤں نہیں تو کیا کروں؟"
"بس تم سکون سے لیٹ جاؤ..... میں بازار سے کچھ کھانے کے لیے بھی لے آتا ہوں اور ڈاکٹر کو بتا کر تمہارے لیے دوائی بھی لے آتا ہوں۔"
"ڈاکٹر تو بہت پیسے لے گا بچے! تم ایسا کرنا، حکیم جی سے بات کر کے گلاب کا عرق لے آنا، زیادہ پیسے بھی نہیں لگیں گے اور اللہ نے چاہا تو آنکھیں بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔"
"اچھا ماں جیسا تم کہتی ہو..... ویسا ہی کرتا ہوں۔"
"ایک منٹ ٹھہرو۔ تمہارے پاس پیسے بھی نہیں ہوں گے" یہ کہتے ہوئے عظمت بی بی اپنے دوپٹے کے کونے سے بندھی ہوئی گانٹھ ٹٹول کر کھولنے لگی اور پھر بولی "لو اس میں سے کچھ پیسے لے لو۔"
ماں کی بات سن کر کرم دین نے اس میں سے پچاس روپے لے کر جیب میں ڈال لیے اور باقی پیسوں کو اسی طرح گانٹھ باندھ کر ماں کے حوالے کرتا ہوا باہر چلا گیا۔
کچھ ہی دیر بعد کرم دین نان چنے اور ماں کی آنکھوں میں ڈالنے کے لیے عرق گلاب لے آیا، اس نے نان چنے والا شاپر کچن میں رکھا اور گلاب کے عرق والی بوتل لے کر کمرے میں آگیا..... "لو ماں تمہارے لیے گلاب کا عرق لے آیا ہوں" کمرے میں داخل ہوتے ہی کرم دین نے بات کی۔
"جیتے رہو میرے بچے۔"
"ماں! حکیم جی سے تمہارے لیے خالص عرق گلاب لایا ہوں۔ حکیم جی کہہ رہے تھے، دونوں آنکھوں میں دو تین دن تک، دن میں چار پانچ بار ڈالتے رہیں۔ آنکھیں موتیوں کی طرح صاف ہو جائیں گی۔"
"تمہیں بھوک لگی ہوگی..... پہلے ناشتہ کر لو، پھر

آنکھوں میں گلاب کا عرق ڈال دینا۔"

"بھوک تو تمہیں بھی لگی ہوگی ماں"

"میری خیر ہے بچے! پہلے تم کھالو، پھر میں بھی کھا لوں گی۔"

ماں کی بات سن کر کرم دین کچن میں چلا گیا، اس نے ایک نان اور کچھ چنے پلیٹ میں رکھ کر ماں کو لادیے اور خود کچن میں ہی کھڑا کھانے لگا، ناشتے کے بعد کرم دین واپس کمرے میں آیا تو ابھی تک عظمت بی بی نے بمشکل ایک دو لقمے ہی کھائے تھے، اسے کھانے میں بہت دشواری پیش آرہی تھی، اس وقت عظمت بی بی بے بسی کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دے رہی تھی، کرم دین کچھ دیر تک پاس کھڑا دیکھتا رہا، پھر اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے لقمے توڑ توڑ کر اسے کھلانے لگا۔

ناشتے کے بعد کرم دین نے ڈراپر سے ماں کی دونوں آنکھوں میں عرق گلاب ڈال دیا اور پھر اسے لٹاتے ہوئے بولا "لو ماں اب تم آرام سے لیٹو..... میں کہیں کسی کام کے لیے پتا کروں۔"

"ٹھیک ہے بچے..... تم بے فکر ہو کر جاؤ، ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں....." عظمت بی بی نے آنکھیں بند کیے ہوئے بات کی۔

کرم دین کئی دنوں سے بے کار تھا، اس لیے چاہتا تھا کہ کسی سے کام کے لیے کہے، وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ اگر اسے کوئی جاب ملے تو ایسی کہ جہاں سے اسے اچھی خاصی تنخواہ کے ساتھ گاڑی بھی ملے، اور اگر وقتی طور پر وہ گاڑی نہ دے سکتے ہوں تو کم از کم نئی موٹر سائیکل تو ضرور دیں۔ کرم دین نے بہت سی جگہوں پر قسمت آزمائی تھی، مگر چھوٹی موٹی ملازمت کے سوا، اس کی مرضی کے مطابق نہیں کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی تھی اور اب بھی اس کے استعمال میں وہی برسوں پرانی ٹوٹی پھوٹی زنگ آلود سائیکل تھی۔ کرم دین کا معمول تھا کہ جن دنوں وہ فارغ ہوتا، صبح ناشتہ کرکے گھر سے نکل جاتا اور پھر اپنی مرضی سے ہی رات کو کسی وقت لوٹ کر آتا۔

اس نے ملازمت کے لیے کئی جان پہچان والوں سے بات کی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا، وہ اپنی عادت کے مطابق لیٹ ہی آتا مگر یہ سوچ کر کہ ماں کو اس کی ضرورت ہوگی، وہ جلد ہی گھر واپس آگیا۔

کرم دین نے گھر کا دروازہ کھولا اور سائیکل ایک طرف کھڑی کرکے اپنی ماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا، وہ یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ کمرے میں اس کی ماں کی چارپائی کے اردگرد بہت سی محلے دار خواتین کھڑی تھیں۔

"کچھ تو خیال کیا کرو کرم دین، تمہاری ماں کو کچھ نظر نہیں آرہا، تم اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بجائے گھومتے پھر رہے ہو۔" کمرے کے قریب پہنچتے ہی کسی محلے دار خاتون کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس سے پہلے کہ کرم دین کوئی جواب دیتا، عظمت بی بی بول پڑی۔ "یہ بے چارہ تو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے کہہ رہا تھا، مگر میں نے ہی منع کر دیا تھا اور ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے حکیم جی سے گلاب کا عرق لانے کو کہا تھا۔"

"مگر بہن یہ آنکھوں کا معاملہ ہے۔ خالی گلاب کے عرق پہ نہ رہو۔" عظمت بی بی کی بات سن کر وہاں کھڑی ایک عورت نے سمجھایا۔

"ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں، ضرورت پڑی تو ڈاکٹر کے پاس بھی ضرور جائیں گے۔ بس ایک، دو دن گلاب کا عرق ڈال کر دیکھ لیں۔ امید تو ہے کہ اسی سے آرام آجائے گا۔ ورنہ کسی آنکھوں کے ہسپتال

لے جاؤں گا۔" کرم دین نے وضاحت کی۔

"پہلے کی اور بات تھی کرم دین، اب اسے تمہاری ضرورت ہوتی ہے، اس لیے زیادہ دیر گھر سے باہر نہ رہا کرو۔ آج تو چاچی خیری کے ذریعے ہمیں خبر مل گئی اور ہم چلی آئیں، ورنہ یہ بے چاری یونہی اکیلی لیٹی روتی رہتی۔" ایک اور محلے دار خاتون نے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے چاچی ایسا ہی ہوگا۔" کرم دین نے آہستہ سے بات کی۔

"اچھا بہن اب تم آرام کرو۔ ہم چلتی ہیں۔" ایک خاتون نے بات کی تو عظمت بی بی نے اپنا دایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کر شکریہ ادا کیا، پھر ایک ایک کرکے تمام خواتین وہاں سے چلی گئیں۔

"کچھ فرق پڑا ماں؟" کرم دین نے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"تم میری چھوڑو، آہستہ آہستہ فرق پڑ ہی جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہیں کام کا کچھ بنا؟"

"نہیں ماں! ابھی تو کچھ نہیں بنا"

"نماز پڑھا کرو بچے، خدا کو یاد رکھو گے تو وہ بھی تمہیں یاد رکھے گا۔"

"پڑھوں گا ماں، بس ذرا سستی ہو جاتی ہے اور تو کوئی مسئلہ نہیں"

"یہ تو ہم لوگوں کے بہانے ہوتے ہیں بچے۔ کوئی تمہاری طرح سستی کا بہانہ بناتا ہے اور کوئی اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا لیتا ہے"

"اچھا ماں! کل سے نماز پڑھنا شروع کردوں گا۔"

"کل کبھی نہیں آیا کرتی بچے۔ جو کام آج سے شروع کیا جاسکتا ہو، اسے کل پہ کیوں چھوڑنا۔"

"ٹھیک ہے ماں! جیسا تم کہتی ہو، ویسا ہی ہوگا اور کچھ.....؟"

"ماں کا کیا ہے بچے۔ وہ تو خوش ہو ہی جائے گی لیکن اصل خوشی اس میں ہے کہ ہم خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق زندگی بسر کریں تاکہ خدا اور اس کا پیارا نبی ہم سے راضی اور خوش ہو۔" عظمت بی بی بات کرتے کرتے رک گئی کیونکہ کوئی محلے دار خاتون اس کی خیریت جاننے کے لیے کمرے میں آکھڑی ہوئی تھی۔

خاتون کے آتے ہی کرم دین نے موقع غنیمت جانا اور جلدی سے وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عظمت بی بی کی عادت تھی کہ اسے جب بھی موقع ملتا، وہ کرم دین کو زمانے کی اونچ نیچ اور نماز ادا کرنے کے متعلق سمجھانے لگتی، جب تک عظمت بی بی، کرم دین کو سمجھاتی رہتی، وہ خاموشی سے سنتا رہتا، مگر اس نے کبھی کسی نصیحت پر عمل نہیں کیا تھا۔

☆☆☆☆☆

عظمت بی بی کا خیال تھا کہ آنکھوں میں عرقِ گلاب ڈالنے سے اس کی بینائی واپس آجائے گی، لیکن جب حکیم جی کی ہدایت کے مطابق دو دن تک آنکھوں میں گلاب کا عرق ڈالنے سے کچھ فرق نہ پڑا تو عظمت بی بی کی پریشانی بڑھنے لگی۔ کرم دین دوپہر کو ہی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا تھا، کچھ دیر بعد ہی اس کی آنکھ لگ گئی تھی، جب اس کی آنکھ کھلی تو باہر اندھیرا پھیل چکا تھا، اندھیرا دیکھ کر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور فوراً ہی چارپائی چھوڑتے ہوئے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر جلدی سے اپنی ماں کے پاس آگیا۔

"کیا بات ہے ماں! ..... کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟" ماں کو خاموش بیٹھے دیکھ کر کرم دین نے سوال کیا۔

"ہاں..... پریشانی کی بات تو ہے"

"کیا ہوا ماں؟"

"میرا خیال تھا کہ ایک دو دن آنکھوں میں گلاب کا عرق ڈالنے سے نظر آنے لگے گا مگر مجھے تو کچھ بھی فرق نہیں پڑا۔"

"میں نے کہا تو تھا۔ کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں لیکن تم نے ہی کہا تھا کہ حکیم سے گلاب کا عرق لا دو۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے میں یہ چاہتی تھی کہ ڈاکٹر کے پاس نہ ہی جانا پڑے اور حکیم سے گلاب کا عرق لے کر رستے میں ہی جان چھوٹ جائے۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"لگتا ہے کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔"

"میں تو کہتا ہوں ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے بہتر ہے کہ کسی آنکھوں کے ہسپتال میں چلتے ہیں۔"

"محلے کی عورتیں بھی یہی کہہ رہی تھیں۔"

"تم ان کی بات چھوڑو، یہ بتاؤ تمہاری اپنی مرضی کیا ہے؟"

"میرے خیال میں بھی یہی صحیح رہے گا۔ ہم کسی سرکاری ہسپتال میں چلتے ہیں۔ وہاں آنکھوں کے ڈاکٹر کو دکھاویں گے۔"

"ٹھیک ہے ماں! تم تیار رہنا۔ ہم کل صبح ہی کسی ہسپتال چلیں گے۔"

"اچھا بچے!" عظمت بی بی نے بیٹے کی بات سن کر آہستہ سے کہا۔

پروگرام کے مطابق کرم دین صبح سویرے ہی عظمت بی بی کو لے کر قریبی ہسپتال پہنچ گیا، وہ ڈاکٹروں کے آنے سے کافی دیر قبل ہی ہسپتال پہنچ گئے تھے، مگر بہت سے مریض ان سے بھی پہلے وہاں موجود تھے۔ کرم دین نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور ایک خالی بنچ دیکھ کر ماں کو اس پر بٹھا دیا، کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر صاحب کا معاون آ گیا، اس کے آتے ہی اپنی باری کے لیے ٹوکن لینے والوں کی قطار لگ گئی، کرم دین نے بھی ٹوکن لیا اور باری کے انتظار میں ماں کے پاس ہی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر صاحب بھی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے، ان کے آتے ہی اپنی باری کے حساب سے ایک ایک کر کے مریض ان کے پاس جانے لگے، جب عظمت بی بی کا نام پکارا گیا تو کرم دین اسے بازوؤں سے پکڑ کر ڈاکٹر کے کمرے میں لے گیا اور احتیاط سے ڈاکٹر کے پاس اسٹول پر بٹھا دیا۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا....."

بیٹھتے ہی عظمت بی بی نے بات کی، مگر ڈاکٹر اس کی بات پر توجہ دیے بغیر ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی عظمت بی بی کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے چیک کرنے لگا۔

"کب سے دکھائی نہیں دے رہا.....؟" آنکھوں کا معائنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"دو دن ہو گئے ہیں ڈاکٹر صاحب! میں صبح نماز کے لیے وضو کرنے اٹھی تھی کہ آنکھوں کے سامنے پہلے دھواں سا آیا پھر اندھیرا چھا گیا اور مجھے نظر آنا بند ہو گیا۔"

"اسی دن ہسپتال کیوں نہیں آئے.....؟"

"کوئی فکر کی بات ہے ڈاکٹر صاحب؟" کرم دین نے ڈاکٹر کا سوال سن کر ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

"ہاں.....تم لوگوں نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ جس روز یہ مسئلہ ہوا تھا، اسی روز آ جاتے تو کچھ بچت ہو جاتی، مگر اب دونوں آنکھوں پر جو کالا موتیا اترا ہے وہ آپریشن سے بھی صحیح نہیں ہو گا۔"

"اس کا کوئی حل تو ہو گا ڈاکٹر صاحب؟" ڈاکٹر کی بات سن کر عظمت بی بی میں تو ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ کچھ کہہ پاتی مگر کرم دین نے بمشکل سوال کیا۔

"اب صبر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر نے گن لہجے میں بات کی اور پھر کاغذ پر کچھ لکھ کر کرم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "یہ کچھ ڈراپس ہیں ان آنکھوں میں چار چار گھنٹے بعد ڈالتے رہیں۔"

کرم دین نے ڈاکٹر سے نسخہ لے کر جیب میں ڈال لیا اور بازو سے پکڑ کر ماں کو اٹھاتے ہوئے ...وشی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا باہر کی طرف چل پڑا۔

جب گلاب کا عرق ڈالنے سے فرق نہیں پڑا تھا تو ان اس بات کی تسلی تھی کہ ہسپتال سے آنکھوں کے ڈاکٹر سے دوائی لیتے ہی آنکھیں پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائیں گی، مگر وہاں سے سخت مایوسی ہوئی تھی، اس کے باوجود کرم دین نے ہمت نہ ہاری اور اسی وقت وہاں سے نکل کر دوسرے ہسپتال جا پہنچا، مگر وہاں سے بھی پہلے کی طرح مایوس کن جواب ملا، اس روز اس نے کئی ہسپتالوں کے چکر کاٹے مگر کہیں سے بھی روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دی، آخر کار شام ڈھلے وہ تھک ہار کر گھر لوٹ آئے۔ ہسپتال جانے سے پہلے امید کی جو کرن دکھائی دے رہی تھی، وہ ختم ہو کر رہ گئی تھی، اسی لیے وہ گھر پہنچے تو سخت مایوس کن حالت میں تھے، عظمت بی بی اور کرم دین، دونوں ہی اس سوچ میں تھے کہ اب گھر کس طرح چل پائے گا۔

عظمت بی بی کی بینائی جانے سے گھر کا نظام بکھر کر رہ گیا تھا، دو چار روز تک کوئی نہ کوئی محلے دار خاتون اظہار ہمدردی کے طور پر گھر کا کوئی نہ کوئی کام کر جاتی اور سالن بھی پکا کر رکھ جاتی، لیکن ایسا کب تک چل سکتا تھا، کوئی ہمسایہ چند دن کے لیے تو تعاون کر سکتا ہے، مگر ہمیشہ کے لیے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔

پہلے گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹانے اور پابندی سے ہر نماز وقت پر ادا کرنے سے عظمت بی بی کا وقت باآسانی کٹ جاتا تھا، اب اس طرح کی کوئی مصروفیت نہیں رہی تھی، کرم دین گھر میں موجود ہوتا تو وہ اس کی مدد سے وضو کر کے چارپائی پر ہی نماز ادا کر لیتی، ورنہ سارا سارا دن چارپائی پر لیٹے ہوئے گزرتا، فرصت کے لمحات میسر آنے لگے تو عظمت بی بی کو بیٹوں، بہوؤں اور پوتے پوتیوں کی یاد آنے لگی اور ان سے ملنے کے لیے دل تڑپنے لگا۔

"ایک بات کہوں کرم دین؟" عظمت بی بی نے موقع پا کر ڈرتے ڈرتے بات کی۔

"کیوں نہیں ماں! جو کہنا ہے کہو۔" کرم دین نے ماں کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ڈرتی ہوں، کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ"

"ایسا کیوں سوچتی ہو ماں! جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو.....ڈر کس بات کا.....؟"

"دراصل..... میں ..... میں چاہ رہی تھی..... کہ....."

"رک کیوں گئی ہو.....کہو ناں جو کہنا ہے"

"تمہارے بھائیوں سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔" عظمت بی بی نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

ماں کی بات سن کر کرم دین کو چپ سی لگ گئی تھی، عظمت بی بی کچھ دیر تک کرم دین کے جواب کا انتظار کرتی رہی، لیکن جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ پھر بول پڑی۔ "کیا بات ہے تم کوئی جواب کیوں نہیں دے رہے؟"

ماں کا سوال سن کر کرم دین نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور بولا "اب میں کیا کہوں ماں تمہاری بات ٹال بھی نہیں سکتا لیکن سوچ لو کہیں ایسا نہ ہو وہ یہ سمجھیں کہ اس موقع پر انہیں اس لیے بلایا ہے، تاکہ کچھ مدد حاصل کی جا سکے۔"

”وہ ایسا سوچتے ہیں تو سوچتے رہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک ماں اپنے بچوں سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں“

”تم فکر نہ کرو میں انہیں کل ہی پیغام بھجوادوں گا“

”اچھا بچے! خدا تمہیں خوش رکھے“ عظمت بی بی نے قریب بیٹھے بیٹے کے سر کو ٹٹول کر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ماں کی بات ختم ہوتے ہی کرم دین اٹھ کھڑا ہوا، وہاں سے جانے سے پہلے اس نے کمرے کی لائٹ بند کرکے زیرو کا بلب جلا دیا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عظمت بی بی کروٹ لے کر لیٹ گئی تھی، کمرے میں مکمل خاموشی تھی، جس کی وجہ سے کمرے میں لگے وال کلاک کی ٹک ٹک بھی صاف سنائی دے رہی تھی، گھڑی کی ٹک ٹک سے عظمت بی بی وقت کا حساب لگانے لگی، کتنے ہی ماہ و سال گزر گئے تھے اس کے بچوں کو گھر سے گئے، کیا اس دوران کبھی ایک بار بھی انہیں جنم دینے والی ماں کی یاد نہیں آئی تھی، شاید اب وہ ان کے لیے ایک فالتو سی چیز تھی جس سے انہیں کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

عظمت بی بی کروٹیں بدلتی رہی اور اپنے بچوں کے متعلق سوچتی رہی، آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر آج تک انہوں نے ماں کے پاس آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو کہیں واقعی وہ یہ نہ سوچ بیٹھیں کہ ضرور ماں کو کوئی ضرورت آن پڑی ہے، جو انہیں بلایا ہے۔ ایک ماں دیر تک بستر پر لیٹی اپنے بچوں سے ملنے کے لیے تڑپتے ہوئے بار بار پہلو بدلتی رہی، اسے کسی پل بھی چین نہیں آ رہا تھا، بے سکونی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، جب اسے اپنا بستر کانٹوں کی طرح چبھنے لگا تو مجبوراً وہ اٹھ بیٹھی اور چارپائی کے پائے سے لٹکی ہوئی تسبیح لے کر سرہانے سے ٹیک لگا کر تسبیح کرنے لگی، یوں رات اسی کیفیت میں کبھی سوتے کبھی جاگتے کٹ گئی۔

کرم دین اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا تھا، وہ ماں کے کہنے پر بھائیوں کو بلانے کے لیے ہاں تو کر آیا تھا، مگر لیٹتے ہی اس کا ذہن اس معاملے میں الجھ کر رہ گیا تھا، وہ ہر پہلو پر غور کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس موقعہ پر اگر اس کے بلانے پر اس کے بھائی وہاں آتے ہیں تو کیا وہ یہ نہیں سوچیں گے کہ انہیں جان بوجھ کر بلوایا گیا ہے تاکہ اس موقعہ پر بہانے سے وہ ان سے کچھ رقم حاصل کر سکیں، وہ دیر تک اس معاملے کو سلجھانے میں لگا رہا مگر پھر اس نے یہ سوچ کر اس معاملے پر مزید غور کرنا چھوڑ دیا کہ انہیں بلانے کی خواہش ماں کی ہے اور اگر ایک ماں اپنے بیٹوں سے ملنا چاہتی ہے تو اسے ضرور ملنا چاہئے، اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ خوامخواہ کے سوالات ذہن میں لائے۔

گو کہ بات بظاہر معمولی سی تھی مگر رات بھر ماں سو سکی، نہ بیٹا۔

”کیا بات ہے ماں! تمہاری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں؟“ صبح کرم دین نے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں بچے! بس رات کو آنکھ نہیں لگی۔ شاید اسی وجہ سے آنکھیں سوج گئی ہوں گی“ عظمت بی بی نے مختصر سا جواب دیا، لیکن اگر اس کی آنکھوں کی بینائی ختم نہ ہوئی ہوتی تو یہی سوال وہ اس سے بھی کرتی اور پوچھتی ”آنکھیں تو تمہاری بھی سوجی ہوئی ہیں کیا تم بھی رات بھر سو نہیں سکے؟“

ماں کی بات سن کر ابھی کرم دین کچھ بول نہیں پایا تھا کہ عظمت بی بی خود ہی بول پڑی۔ ”جانتے ہو میں رات بھر کیوں نہیں سو سکی؟“

”جانتا ہوں ماں بیٹوں نے جو ملنے آنا ہے پھر

تمہیں نیند کیسے آتی“

”کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن آج تک اگر بیٹے، ماں سے ملنے نہیں آ سکے تو ایک ماں نے بھی اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

لیکن کل تو تم انہیں بلانے کے لیے کہہ رہی تھی اور آج......“

”کل کی بات اور تھی...... میں جذبات میں بہہ گئی تھی...... مگر...... اب تم میری ایک بات یاد رکھنا۔ میں مر بھی جاؤں تو تم انہیں میرے مرنے کی بھی اطلاع مت کرنا، کیونکہ جو زندگی میں ماں کے پاس کبھی دو گھڑی آ کر نہیں بیٹھے، وہ مری ہوئی ماں کا منہ دیکھ کر بھی کیا کریں گے۔“

”خدا تمہیں زندگی دے ماں۔ ایسا کیوں کہتی۔؟“

”جیسے جیسے جانے کا وقت قریب آتا جاتا ہے اس طرح کی باتیں خود بخود منہ سے نکلنے لگتی ہیں بچے“

”ویسے بھی ماں، تمہارے وہ بیٹے پیسے والے امیر لوگ ہیں پھر بھلا وہ غریبوں کی اس بستی میں کیا لینے آئیں گے“

”امیر وہ نہیں تم ہو تمہارے پاس ماں ہے جو اُن کے پاس نہیں اور جانتے ہو ماں، خدا کا دیا ہوا وہ عظیم تحفہ ہے جو دولت سے خریدا نہیں جا سکتا۔“

”پھر بھی ماں! پیسہ بھی بہت ضروری ہے اس کے بغیر دنیا کا کوئی کام بھی تو نہیں ہوتا۔ اب یہی دیکھو ناں۔ آج ہمارے پاس بھی دولت ہوتی تو تم یوں بے بسی کے عالم میں چارپائی پر نہ لیٹی ہوتی۔ تمہارا بھی اچھے ڈاکٹروں سے علاج ہو رہا ہوتا۔“

”اوپر والے کا شکر ادا کرنا سیکھو بچے! اس نے جو نہیں دیا، اس کا شکوہ کرنے کی بجائے، اس کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرو، جو اس نے ہمیں دے رکھی ہیں“

عظمت بی بی کے پاس کرم دین کی ہر بات کا جواب موجود تھا، مگر جو وہ کہنا چاہ رہی تھی، کرم دین ماننے کو تیار نہیں تھا، اور جو کرم دین کہہ رہا تھا، وہ عظمت بی بی سننے کو تیار نہیں تھی، اس لیے کرم دین نے خاموشی اختیار کر لی۔

وقت گزرنے لگا، عظمت بی بی ایسی چارپائی پر پڑی کہ بہت سی بیماریاں ایک ایک کرکے اس پر سوار ہوتی گئیں۔ کرم دین کام کاج کے سلسلے میں سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا اور عظمت بی بی چارپائی پر پڑی رہتی، کبھی کسی روز کوئی بیماری زور کر جاتی تو وقتی طور پر ایک دو دن کسی ڈاکٹر یا حکیم سے دوا آ جاتی۔ کرم دین کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس کی ماں کو مکمل علاج کی ضرورت ہے، مگر اس کے لیے گھر چلانا مشکل ہو رہا تھا، علاج کے لیے رقم کہاں سے آتی، یوں بھی ایک آدھ بیماری ہوتی تو شاید اس کا علاج ہو بھی جاتا مگر عظمت بی بی کو ایک ساتھ کئی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا، آخر کار ایک روز وہ ان بیماریوں سے لڑتے لڑتے تھک کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔

وہ اس قدر نیک اور ملنسار خاتون تھی کہ اس کی موت نے سبھی کو رلا دیا، یوں بھی بستی کے لوگ آپس میں اس قدر جڑے ہوئے تھے کہ جیسے ہی کسی کے دکھ درد کے متعلق سنتے، فوراً وہاں پہنچ جاتے، عظمت بی بی کی فوتگی کے بارے میں مسجد میں اعلان ہوا تو اسی وقت روتی پیٹتی محلے دار خواتین ان کے ہاں پہنچ گئیں۔

عظمت بی بی نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا کفن تیار کر رکھا تھا، غسل کے بعد وہی کفن پہنا کر اسے چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا، محلے کے چند لڑکوں نے مل کر قبر بھی کھود دی تھی، مسجد میں جنازے کا اعلان کر دیا گیا تھا، جنازہ اٹھایا جانے والا تھا جب تین گاڑیاں

ان کے گھر کے سامنے آ کر رکیں، جن میں کرم دین کے تینوں بھائی اور ان کے بیوی بچے آئے تھے۔

کرم دین نے ماں کی خواہش اور حکم کے مطابق جان بوجھ کر بھائیوں کو اطلاع نہیں دی تھی، مگر کسی نہ کسی ذریعے سے انہیں اطلاع مل گئی تھی، صبح سے شام ہوگئی تھی، کرم دین کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہیں نکلا تھا مگر جیسے ہی اس کی نظر بھائیوں پر پڑی، وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ایک مدت بعد اس نے بھائیوں کو دیکھا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے لپٹ کر خوب روئے، مگر ایسا بھی نہ ہوسکا، کیونکہ وہ ماں کی موت کا سن کر شاید محض رسم دنیا نبھانے کے لیے چلے آئے تھے، ورنہ ان تینوں میں سے کسی ایک کی بھی آنکھ میں آنسو نہیں تھے، مگر ان تینوں کی بیویاں جب سے آئی تھیں، مسلسل روئے جارہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو نہیں تھمے تھے، ہوسکتا ہے یہ دنیا کو دکھانے کے لیے تھا یا اس وقت انہیں کسی اپنے کی موت یاد آگئی تھی یا پھر وہ پچھتاوے کے آنسو تھے، اسے جو بھی نام دیا جائے، مگر وہ رو رہی تھیں۔

چاروں بھائیوں نے مل کر ماں کے جنازے کو کندھوں پر اٹھالیا اور کلمہ شہادت کا ورد کرتے ہوئے قبرستان کی طرف چل پڑے، جنازے کے بعد جب سبھی ایک ایک کرکے وہاں سے چل دیے، تو کرم دین کا خیال تھا کہ اب اس کے بھائی بھی چلے جائیں گے، مگر ان میں سے کوئی بھی وہاں سے نہ گیا، لیکن اگلے روز رسم قل کے بعد دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور وہاں سے یوں چل دیے جیسے وہ جو ڈیوٹی پوری کرنے آئے تھے وہ پوری ہوگئی تھی، اب انہیں وہاں رہ کر کیا کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆

ماں کے سوا کرم دین کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، ماں کی موت نے اسے اور بھی تنہا کردیا تھا، جب تک وہ زندہ تھی، اسے کھانا کھلانے کے لیے کرم دین کو گھر آنا ہی پڑتا تھا، جب تک کرم دین گھر نہ پہنچتا، وہ انتظار میں بیٹھی رہتی اور کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ وہ انتظار کرتے کرتے کھانا کھائے بغیر ہی سوجاتی تھی۔ اب وہ دنیا میں نہیں رہی تھی، اس لیے کرم دین کے وقت پر گھر پہنچنے والی ذمہ داری ختم ہوگئی تھی، یوں بھی ماں کے مرنے کے بعد کئی روز تک گھر میں بیٹھے رہنے کے بعد جب وہ واپس اپنے کام پر گیا تو اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو ملازم رکھ لیا گیا تھا، اب اس نے معمول بنالیا تھا کہ دن بھر روزگار کی تلاش میں گزار دیتا اور پھر رات گئے تک کہیں نہ کہیں دوستوں کے پاس بیٹھا رہتا۔

وقت بے وقت گھر آنے کی وجہ سے کچھ ہی دنوں میں ہر جگہ ہر چیز پر مٹی کی تہیں چڑھ گئی تھیں، جب سے عظمت بی بی کی بینائی ختم ہوئی تھی، گھر کی صفائی کا کام صحیح طرح سے نہیں ہو پاتا تھا، پھر بھی عظمت بی بی کسی نہ کسی محلے دار خاتون سے کہہ کر کچھ دن کے وقفے سے گھر کی صفائی کروا لیا کرتی تھی، اب وہ سلسلہ بھی نہیں رہا تھا، عظمت بی بی کے فوت ہوجانے اور گھر میں کوئی دوسری خاتون نہ ہونے کی وجہ سے محلے کی خواتین نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔

مسلسل بے کار رہنے کی وجہ سے وقت گزارنا مشکل ہوتا جارہا تھا، محلے والوں میں سے کسی کو بھی اس بات کی قطعی پروا نہیں تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد کرم دین کے گھر میں روٹی بھی پکتی ہے یا پھر وہ بھوکا ہی سوجاتا ہے، چاچی خبری وہ واحد محلے دار خاتون تھی، جو تھوڑے تھوڑے دن کے وقفے سے کسی نہ کسی بہانے کچھ دیر کے لیے ضرور چکر لگا جاتی تھی، ایک روز وہ آئی تو کرم دین کو پریشان دیکھ کر اسے محلے کی مسجد

کے امام، میاں جی کے پاس جانے کا مشورہ دیا تاکہ وہ اس کے لیے کوئی تعویز دھاگہ کردیں۔

چاچی خبری کے منہ سے میاں جی کے پاس جانے کا سن کر کرم دین کو اپنے بچپن کا وہ واقعہ یاد آگیا جب اس نے انجانے میں میاں جی کی شان میں گستاخی کی تھی اور اس کی ماں نے ایسا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا، جس کی گونج اب تک اس کے کانوں میں باقی تھی، پھر ماں نے اسے پیار سے اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا تھا "وہ آل رسول ﷺ ہیں، ان کی عزت و احترام کرنا ہم پر لازم ہے، وہ اس بستی کے لیے بہت بڑی نعمت ہیں، ان کی وجہ سے یہاں بہت برکتیں ہیں، بچے! آئندہ کبھی بھی ان کے لیے اپنی زبان سے کوئی غلط لفظ نہ نکالنا......" اسے یاد تھا کہ اس روز اسے چپ کراتے ہوئے ماں خود بھی رو پڑی تھی۔

سال میں دو عیدوں کے علاوہ کرم دین نے کبھی مسجد کا رخ نہیں کیا تھا، اس لیے اسے میاں جی کے پاس جاتے ہوئے شرم محسوس ہورہی تھی، مگر چاچی خبری اس کے ایسے پیچھے پڑی کہ اسے میاں جی کے پاس جانا ہی پڑا، اس نے ہمت کرکے میاں جی کے پاس جانے کا پروگرام بنایا تھا اور انتہائی سوچ بچار کے بعد ان سے ملنے کا وہ وقت منتخب کیا تھا، جب ان کے پاس کوئی کم کم ہی آتا تھا۔

یوں تو گاہے بگاہے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موقعہ پر کرم دین کی ملاقات میاں جی سے ہوجایا کرتی تھی، مگر میاں جی کے حجرے میں اس نے پہلی بار قدم رکھا تھا، وہ اس بات سے خائف تھا کہ میاں جی یقیناً طرح طرح کے سوالات کریں گے، اس لیے وہ ہر طرح کے سوالات کے لیے تیار ہوکر حجرے میں داخل ہوا تھا، کرم دین کی سوچ کے مطابق میاں جی حجرے میں اکیلے ہی تھے، اس نے انہیں سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دینے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں انتہائی شفقت سے بولے۔ "آؤ بیٹھو کرم دین۔"

حجرے میں داخل ہوتے ہی بیٹھنے کا اشارہ پاکر، کرم دین خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گیا، میاں جی سفید کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے، وہ خاموشی سے بیٹھا انہیں لکھتے ہوئے بغور دیکھنے لگا، اس نے میاں جی کی تحریر پڑھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس قدر عجیب سی لکیریں کھینچ رہے تھے کہ اس کے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔

"کیسے آنا ہوا کرم دین......؟" میاں جی نے کاغذ قلم ایک طرف رکھا اور کرم دین کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"میاں جی! ماں زندہ تھی تو جیسے تیسے گھر کا نظام چل رہا تھا، مگر جب سے وہ فوت ہوئی ہے، گھر گھر ہی نہیں لگتا......"

"زندگی اور موت تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے تمہاری ماں کی جتنی زندگی تھی وہ گزار گئی لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو، کسی کے جانے سے دنیا کا نظام رک نہیں جاتا تمہیں بھی اپنا گھر کسی نہ کسی طرح چلانا ہوگا۔"

"اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں آپ ہمارے بڑے ہیں مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔"

کرم دین کی بات سن کر میاں جی کچھ سوچنے لگے اور پھر بولے "تم شادی کرلو۔"

"شادی؟" میاں جی کا مشورہ سن کر کرم دین نے حیران ہوکر دریافت کیا۔

"اس میں اس قدر حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟"

"میاں جی کہیں آپ مذاق تو نہیں کررہے؟

میرے گھر میں دو وقت کا کھانا مشکل سے پکتا ہے اور آپ شادی کا مشورہ دے رہے ہیں۔"

"میں نے تو کوئی مذاق نہیں کیا کرم دین! ہاں اگر تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو تو یہ اور بات ہے۔"

"مگر میاں جی! میں تو اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ مجھے کوئی تعویز لکھ دیں گے تاکہ میرے حالات بھی کچھ بہتر ہو جائیں۔"

"تعویز تو میں لکھ دیتا ہوں کرم دین! مگر نماز پڑھا کرو پھر دیکھنا اپنے آپ ہی تمہارے سارے کام ہوتے چلے جائیں گے اور نماز پڑھنے سے تمہیں اس قدر سکون ملے گا کہ سب دکھ بھول جاؤ گے۔" میاں جی نے کرم دین کو سمجھایا۔

"ٹھیک ہے میاں جی۔" کرم دین نے میاں جی کی بات سن کر نظریں جھکا کر کہا۔

میاں جی نے کاغذ قلم اٹھایا اور دو تعویز لکھ کر کرم دین کے حوالے کرتے ہوئے بولے "اس تعویز کو پلاسٹک کور چڑھا کر گھر میں لٹکا دو اور یہ تعویز چمڑے میں سلوا کر اپنے گلے میں ڈال لو۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

کرم دین نے تعویز لے کر احتیاط سے جیب میں ڈال لیے اور اٹھتے ہوئے میاں جی سے ہاتھ ملایا، پھر جیب سے پانچ روپے نکال کر میاں جی کے پاس پڑی ہوئی صندوقچی میں ڈال کر وہاں سے نکل آیا۔

اس نے راستے میں ہی ایک تعویز چمڑے میں سلوا کر گلے میں ڈال لیا تھا اور دوسرے پر پلاسٹک کور چڑھا کر گھر پہنچتے ہی ایک کیل پر ٹانگ دیا۔ وہ بہت خوش تھا اور یہ سوچ کر اسے دلی اطمینان ہو رہا تھا کہ میاں جی کے تعویز ضرور کام کر دکھائیں گے۔ میاں جی کے حجرے سے نکلتے ہوئے اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ باقاعدگی سے نماز ادا کیا کرے گا، مگر گھر پہنچنے تک اس کے ارادے اس کے ذہن سے نکل چکے تھے، بس یاد تھا تو اتنا کہ ایک تعویز اس کے گلے میں ہے اور دوسرا کیل سے لٹکا ہوا ہے، اب اسے فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

دن گزرنے لگے مگر میاں جی کے تعویزوں نے کرم دین کی سوچ کے مطابق کوئی کام نہ دکھایا۔ کرم دین کی بے کاری اور بے سکونی پہلے کی طرح اپنی جگہ موجود تھی، اس میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں آئی تھی، اس کے باوجود وہ اس انتظار میں تھا کہ شاید کسی روز قسمت اس پر مہربان ہو جائے، مگر جب ایسا کچھ نہ ہوا اور انتظار مایوسی میں بدلنے لگا تو کرم دین نے ایک بار پھر میاں جی کے پاس جانے کا پروگرام بنا لیا۔

وہ میاں جی کے ہاں پہنچا تو کچھ خواتین ان کے پاس موجود تھیں، وہ ایک طرف کونے میں لگ کر خاموشی سے بیٹھ گیا اور ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا، جب سبھی خواتین وہاں سے رخصت ہو گئیں تو کرم دین اپنی جگہ سے اٹھ کر میاں جی کے سامنے جا بیٹھا۔

"کیا بات ہے کرم دین! بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"

"پریشانی تو ہے میاں جی! آپ سے تعویز لے کر گیا تھا مگر حالات جوں کے توں ہیں۔"

"میں نے کہا تو تھا شادی کر لو۔" میاں جی نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں بات کی۔

بات کرتے ہوئے میاں جی کے چہرے پر کہیں ہلکی سی بھی مسکراہٹ دکھائی دے جاتی تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں لیکن ان کے چہرے سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔

"پہلے کچھ حالات تو بہتر ہو جائیں میاں جی پھر شادی بھی کر لوں گا۔" کرم دین نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"تم شادی کرو۔ حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔" میاں جی کی بات سن کر کرم دین خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا، ایک طرف پیٹ بھرنے کے لیے روٹی نہیں تھی، دوسری طرف میاں جی بضد تھے کہ شادی کر لو۔ مسجد سے گھر تک کا فاصلہ اسی معاملے کے متعلق سوچتے ہوئے ہی طے ہو گیا تھا۔ گھر پہنچ کر بھی اسے یہی سوچ گھیرے رہی، آخر کار انتہائی سوچ بچار کے بعد کرم دین نے فیصلہ کر لیا کہ میاں جی کے کہنے پر یہ کڑوا گھونٹ بھر کر بھی دیکھ لینا چاہیے۔

شادی کے لیے سب سے پہلے کسی مناسب لڑکی کی تلاش کا مرحلہ تھا، بھائی اور بھابیاں پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے، گھر میں کوئی دوسرا بڑا بھی نہیں تھا جو اس معاملے میں کہیں بات چلاتا، اس لیے دوستوں اور ملنے ملانے والوں سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اس معاملے میں رشتے کروانے والی کسی خاتون کی خدمات حاصل کی جائیں۔

جیسے ہی شادی کے لیے بات چیت شروع ہوئی، کرم دین کو فکر لگ گئی، گو کہ شادی کی تقریب انتہائی سادگی سے ہونا تھی، پھر بھی شادی کے انتظامات کے لیے کچھ نہ کچھ رقم تو پاس ہونی چاہیے تھی، اسے جہاں جیسی ملازمت ملی اس نے کر لی، تاکہ گھر میں بے کار بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کچھ آمدن گھر آئے۔

☆☆☆☆☆

ایک عرصے سے گھر کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے گھر کی بہت بری حالت ہو گئی تھی، رات کا وقت تھا اور اگلے روز چھٹی بھی تھی، کرم دین کو مکمل یقین تھا کہ اب وہاں کسی دوست یا ملنے ملانے والے کے آنے کا بھی کوئی چانس نہیں، اس نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور جھاڑو لے کر گھر کی صفائی کرنے لگا، صفائی کے بعد اس نے ایک کپڑا لیا اور مختلف چیزوں پر پڑی ہوئی مٹی صاف کی، پھر اس نے ادھر ادھر بکھری ہوئی اشیاء اٹھا کر اپنی اپنی جگہ رکھ دیں، اس کام سے فارغ ہونے میں اسے کافی وقت لگ گیا تھا لیکن گھر صاف ستھرا دکھائی دینے لگا تھا، کم از کم اب گھر اس قابل ضرور ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اچانک بھی وہاں آ جاتا تو اسے کسی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

رات کو دیر تک کام میں مصروف رہنے اور چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے وہ دیر تک سویا رہا، وہ ابھی اور بھی سونا چاہتا تھا، مگر دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر پہنچا تھا، دروازہ کھولا تو وہاں رشتے کروانے والی مہرین باجی کھڑی تھی۔

"خیر تو ہے..... آج اتنی صبح صبح آئی ہو......؟"

کرم دین نے مہرین باجی کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر سوال کیا۔

"آج لڑکی والے تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔ میں نے سوچا آج چھٹی کا دن ہے، تم کہیں باہر نہ نکل جاؤ اس لیے تمہیں صبح صبح ہی بتانے چلی آئی۔" مہرین باجی نے کرم دین کے پوچھنے پر اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"اگر ایسی بات تھی تو تم مجھے کل ہی بتا دیتیں۔"

"دراصل رات کو ان کا فون کافی لیٹ آیا اس لیے تمہیں اب بتانے آئی ہوں...... وہ تین چار افراد ہوں گے......اور میرا خیال ہے وہ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک پہنچ جائیں گے...... تم کھانے وغیرہ کا بندوبست کر لینا۔"

"تم بے فکر رہو سب انتظام ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے پھر میں چلتی ہوں، اب ان کے

ساتھ ہی آؤں گی۔'' مہرین باجی نے وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے بات کی اور وہاں سے روانہ ہو گئی۔

کرم دین کچھ دیر اور سونا چاہتا تھا، مگر مہمانوں کی آمد کا سن کر اس کی نیند اڑ گئی تھی، اس نے رات کو ہی صفائی کے بعد ادھر ادھر بکھری اور بے ترتیب پڑی ہوئی چیزوں کو اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھ دیا تھا، لیکن گھر میں آنے والے مہمانوں کی وجہ سے اس نے ایک بار پھر گھر کی ہلکی پھلکی صفائی کر دی، پھر منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر دھوبی سے استری کروانے کے لیے شلوار قمیض لی اور باہر نکل گیا۔

مہرین باجی کے جاتے ہی کرم دین نے مہمانوں کے لیے انتظامات کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی، اس نے اپنے ذہن میں یہ بات طے کر لی تھی کہ مہمانوں کے لیے کھانے پینے کی تمام اشیاء بازار سے پکی پکائی ہی لائی جائیں، مگر مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں کسی خاتون کا ہونا انتہائی ضروری تھا، اس کام کے لیے بھی کرم دین نے اپنے کسی دوست کی منت سماجت کر کے اس بات کے لیے راضی کر لیا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنی والدہ کے ساتھ اس کے گھر میں آ جائے تاکہ مہمانوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جا سکے اور اگر فوری طور پر بازار سے کچھ لانا پڑے تو اس کا دوست موجود ہو، وقت کم تھا اس لیے اس نے دھوبی کے پاس ہی کھڑے ہو کر اپنے کپڑے استری کروائے اور جلدی سے گھر لوٹ آیا۔

کچھ ہی دیر بعد وعدے کے مطابق کرم دین کا دوست اپنی والدہ کو لیے اس کے ہاں آ گیا، پھر تینوں نے باہمی مشورے سے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے پروگرام طے کر لیا۔ مہمانوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، اس لیے کرم دین نے اپنے دوست کو کچھ رقم دے کر بازار سے ضروری اشیاء لینے کے لیے بھیج دیا اور خود نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔

تمام انتظامات مکمل تھے، مہمانوں کی آمد کا انتظار تھا، تھوڑی ہی دیر بعد مہمان آ گئے، مہرین باجی سمیت پانچ مہمان آئے تھے، جن میں لڑکی کے والدین کے علاوہ لڑکی کا بڑا بھائی اور چھوٹی بہن شامل تھے۔ کرم دین نے مہمانوں کی آؤ بھگت اور خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس سے قبل جتنی بار بھی اسے دیکھنے کے لیے لوگ آئے تھے اس نے ان کی خدمت میں کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی، ہر بار کرم دین کو اچھی خاصی رقم خرچ کرنا پڑی تھی لیکن اب تک کوئی بھی رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ لوگ بھی نہ جانے پہلے آنے والے لوگوں کی طرح کیسے کیسے سوال کریں گے، لیکن اس بار مہرین باجی نے لڑکی والوں کو کرم دین کے متعلق اس قدر سبز باغ دکھائے تھے کہ وہ مکمل طور پر مطمئن ہو کر رخصت ہوئے تھے۔

☆☆☆☆☆

عائشہ نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، مگر وہ انتہائی سمجھدار تھی، وہ دلہن بن کر کرم دین کے ہاں آئی تو کچھ ہی دنوں میں اس کے متعلق اچھی طرح جان گئی تھی۔ عائشہ کا تعلق انتہائی شریف گھرانے سے تھا، اس کی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ کرم دین کے بارے میں کوئی بھی بات اپنے گھر والوں تک پہنچائے، اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور جیسا وقت گزرے گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کرم دین کے کردار میں کوئی خرابی نہیں تھی، اس میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ کہیں ٹک کر کام نہیں کرتا تھا، جس کی وجہ سے کئی کئی دن گھر میں بے کار بیٹھا رہتا تھا، وہ کہیں بھی ڈھنگ کا کام نہ کرنے

کے باوجود پلک جھپکنے سے پہلے امیر ترین شخص بن جانا چاہتا تھا، اس نے کئی پرائیویٹ اداروں میں ملازمت کی تھی، بہت سی فیکٹریوں میں نوکری کی، کئی پٹرول پمپوں پر کام کیا، آئس کریم کی کمپنی میں سیل مین رہا، غبارے بیچے، سبزی کی دکان کی اور نہ جانے کیا کیا کام کیا تھا، مگر ہر کام چھوڑنے کی ایک ہی وجہ تھی کہ وہ کام اس کے معیار کا نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

شادی کے بعد وہ چار بچوں کا باپ بن گیا تھا مگر اس نے خود کو نہیں بدلا تھا، اب بھی اس کی زندگی کا واحد مقصد دولت حاصل کرنا تھا۔ اس نے ایک معمولی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، جہاں قدم قدم پر محرومیاں اس کے ساتھ تھیں، وہ جیسے جیسے جوان ہوتا گیا مایوسیاں اور محرومیاں بھی اس کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی گئیں۔ غربت سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے زندگی میں بہت سے پاپڑ بیلے تھے مگر وہ غربت کی لکیر کو پار نہ کر سکا۔

اس روز وہ اسی سلسلے میں سفر پر نکلا تھا، دوران سفر اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو گئی، جو عملیات کا ماہر تھا اور ستاروں کی چال سے لے کر قسمت کا حال، محبت میں کامیابی، جادو ٹونے اور بانڈ پر پہلا انعام نکالنے تک ہر طرح کے کام کروانے کے لیے نہ صرف عملیات کرتا تھا بلکہ تعویذ دھاگہ بھی کرتا تھا۔

کرم دین اور بابا سائیں ایک ہی سیٹ پر بیٹھے سفر کر رہے تھے، سفر کافی لمبا تھا، کچھ دیر تک وہ دونوں ہی خاموش بیٹھے رہے مگر پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور مختلف موضوعات پر کھل کر بات ہونے لگی، یوں سفر کے دوران ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ جان گئے تھے۔ راستے میں کچھ دیر کے لیے گاڑی رکی تو دوسرے مسافروں کے ساتھ کرم دین اور بابا سائیں بھی نیچے اتر گئے، گاڑی سے اتر کر وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے، جہاں دونوں نے مل کر چائے پی، جس کا بل کرم دین نے ادا کیا، چائے کے دوران بھی دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

سفر پھر سے شروع ہوا تو بات کرتے کرتے بابا سائیں نے کرم دین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے ہاتھوں کی لکیروں کا جائزہ لینے لگا، بابا سائیں نے کرم دین کا ہاتھ دیکھ کر ایسے ایسے انکشافات کیے کہ کرم دین حیران رہ گیا اور بابا سائیں کے علم، تجربے اور ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا، جیسے جیسے بابا سائیں کرم دین کے ہاتھوں کی لکیریں پڑھتا گیا، بہت سی باتیں کھل کر سامنے آتی گئیں۔

بابا سائیں نے محض ہاتھ دیکھ کر کرم دین کی زندگی کے ایسے بہت سے راز بھی بتا دیے تھے جن کے بارے میں سوائے اس کے کوئی دوسرا نہیں جانتا تھا، سفر جاری رہا اور ان کی باتیں بھی چلتی رہیں، جب سفر ختم ہوا تو بابا سائیں کا وزیٹنگ کارڈ کرم دین کی جیب میں آ چکا تھا اور ملاقات کے وعدے بھی ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں سے ملاقات اتفاقیہ تھی مگر اس ملاقات نے کرم دین کی زندگی میں بھونچال برپا کر دیا تھا، اب اٹھتے بیٹھتے کرم دین کی آنکھوں کے سامنے بابا سائیں کی صورت گھومتی رہتی، وہ ان سے ملاقات کے لیے بے قرار رہنے لگا اور جب دل کسی بھی طرح قابو میں نہ رہا تو وہ بابا سائیں سے ملنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔

مختلف بسوں اور ویگنوں میں سفر کرتا ہوا کرم دین آخر کار بابا سائیں کے دفتر کے سامنے جا کھڑا ہوا، وہ باہر کھڑا اس بورڈ کو بغور پڑھنے لگا، جس پر بابا سائیں

کے عملیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا تھا، اس نے بورڈ پڑھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دفتر میں داخل ہوگیا۔

''بابا سائیں ہیں......؟'' دفتر میں داخل ہوتے ہی کرم دین نے فرنٹ ڈیسک پر بیٹھے بابا سائیں کے ملازم، اشرف سے دریافت کیا۔

''جی ہیں۔'' اشرف نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

''بس ان سے کہیں کرم دین آیا ہے۔''

کرم دین کی بات سن کر اشرف نے انٹرکام اٹھایا اور بابا سائیں کو اس کے آنے کی اطلاع دے دی، پھر بابا سائیں کی طرف سے اجازت ملتے ہی اشرف نے کرم دین کو ان کے کمرے میں بھجوا دیا، وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے دیکھتے ہی بابا سائیں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا۔

''آؤ کرم دین! یہاں بیٹھو۔'' بابا سائیں نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کرم دین کے بیٹھتے ہی بابا سائیں نے اشرف کو چائے اور ساتھ کچھ کھانے کے لیے لانے کو کہہ دیا تھا، تھوڑی ہی دیر بعد اشرف چائے اور بسکٹ لے آیا۔

''میں جانتا تھا۔ تم ضرور آؤ گے۔'' بابا سائیں نے کرم دین سے بات کی۔

''آپ سے وعدہ جو کیا تھا پھر کیسے نہ آتا۔''

''اپنا وعدہ کسے یاد رہتا ہے کرم دین۔''

''لیکن میں ان میں سے نہیں، جنہیں اپنا کیا ہوا وعدہ یاد نہیں رہتا۔''

''وعدہ نبھانا بھی کسی کسی کو ہی آتا ہے مجھے وہ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو اپنی کی ہوئی بات کو پورا کرتے ہیں اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم بھی انہی میں سے ہو۔''

''یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے بابا سائیں ورنہ مجھے تو آپ سے ملنے آنا ہی تھا۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم آئے......ورنہ راستے میں بہت سے مسافر ملتے ہیں اور سفر کے بعد یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ دوران سفر کسی سے ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔''

''ویسے تو آپ سے ملنے آنا ہی تھا، مگر سچ پوچھیں تو مجھے آپ کے پاس میری مجبوریاں کھینچ لائی ہیں۔''

''گھبراتے کیوں ہو کھل کر بات کرو۔''

''بات کرنے ہی تو آیا ہوں۔''

''مسئلہ کیا ہے کرم دین! تم جو کہنا چاہتے ہو بے دھڑک کہو۔''

''بات یہ ہے بابا سائیں۔ میں غربت کی ایسی دلدل میں پھنسا ہوا ہوں کہ کسی بھی طرح نکل نہیں پا رہا۔''

''میں اس سلسلے میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''دراصل جب آپ سے ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا لگا جیسے میری ہر مشکل، ہر الجھن کا حل مل گیا ہو۔''

''اللہ پہ بھروسہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بابا سائیں! آپ مجھے کوئی ایسا علم بتادیں، جس کے پڑھنے سے میں ہر وہ چیز حاصل کرسکوں جس کی مجھے خواہش ہے۔''

''نماز پڑھا کرو کرم دین! پھر دیکھنا تمہارے سب کام سیدھے ہو جائیں گے۔''

''نمازیں پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے بابا سائیں! میں نے بے نمازیوں کو بہت آگے جاتے دیکھا ہے اور پانچوں وقت کی نماز پڑھنے والوں کو دو

وقت کی روٹی کے لیے بھی ترستے ہوئے دیکھا ہے۔ میری ماں بھی بہت نمازیں پڑھا کرتی تھی، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے زندگی میں اسے کبھی سکھ کا سانس لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''تم تو خوامخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ ذرا سوچو تو سہی، خدا بھلا ان کو کیسے بھول سکتا ہے جو اسے یاد رکھتے ہوں۔ میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں، لیکن میں تمہارے خیالات سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ اس لیے تم جاؤ اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو، خدا بہتری فرمائے گا۔''

کرم دین کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولا ''اچھا بابا سائیں! فی الحال تو میں آپ کے کہنے سے جا رہا ہوں لیکن اگلی بار آیا تو آپ کو میرے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔''

''یہ تم سے میرا وعدہ رہا۔ اگلی بار آؤ گے تو میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔''

کرم دین نہ جانے دل میں کیا کیا خواب سجائے بابا سائیں کے پاس گیا تھا لیکن انہوں نے اس کی سوچ کے مطابق جواب نہیں دیا تھا، اس کا خیال تھا کہ بابا سائیں نے اسے ٹال دیا ہے مگر اس کے باوجود اسے مکمل یقین تھا کہ اس کی تمام پریشانیوں کا حل صرف اور صرف بابا سائیں کے پاس ہے۔

☆☆☆☆☆

سر پہ بازو رکھ کر لیٹے ہوئے گھنٹوں سوچتے رہنا کرم دین کی پرانی عادت تھی، جس سے عائشہ بخوبی واقف تھی، وہ جب سے بیاہ کر کرم دین کے گھر آئی تھی، اس نے اسے اسی کیفیت میں دیکھا تھا، وہ جب بھی اسے ایسی حالت میں دیکھتی تو اکثر اسے اس طرح سوچتے رہنے سے منع کرتے ہوئے سمجھاتی کہ اس طرح سوچتے رہنے سے بہتر ہے کہ وہ کوئی ڈھنگ کا کام کرلے، جس سے کچھ حاصل تو ہو، مگر وہ ہمیشہ سنی ان سنی کر دیتا اور اپنی اس عادت کو بدلنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کرتا اور ہر پل خدا سے شکوے گلے اس کی زبان پر رہتے۔

''تمہاری حالت دیکھ کر لگتا ہے، جس بابا سائیں کے پاس تم گئے تھے، وہاں سے کچھ حاصل نہیں ہوا......'' عائشہ نے کرم دین کو مایوسی کی حالت میں لیٹے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''تم دیکھنا تو سہی......بابا سائیں میری ہر مشکل کو کیسے حل کرتے ہیں، وہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ وہ مجھے سفر کے دوران مل گئے اور ان سے کچھ تعلق بن گیا، ورنہ لوگ تو ہزاروں روپے دے کر منت سماجت کے ساتھ ان سے اپنا کام کرواتے ہیں......'' کرم دین نے بابا سائیں کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر ادا کرنا سیکھو کرم دین! اوپر والے نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا، ہمیں اولاد جیسی نعمت سے نوازا، رہنے کو چھت دی، پیٹ بھر کر دو وقت کی روٹی بھی مل جاتی ہے اور بھلا کیا چاہیئے۔''

''تم ہمیشہ غریبوں والی ہی باتیں کرتی رہو گی کھانے پینے اور رہائش کے علاوہ اور بھی بہت سی خواہشات ہوتی ہیں۔''

''مگر وہ خواہشات محنت کرنے سے پوری ہوتی ہیں۔ تمہاری طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے نہیں۔''

''اب جاؤ اپنا کام کرو میرا دماغ مت چاٹو۔''

''کام کی بات کرو تو کھانے کو دوڑتے ہو......لیکن ......اتنا یاد رکھنا تمہاری طرح چارپائی پر پڑے رہنے سے کبھی کوئی خوشی، کوئی سکھ حاصل نہیں ہوتا۔'' عائشہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور کرم دین پھر سے سر

پہ بازو رکھے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگا۔

کرم دین نے انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی، اس نے زندگی میں کبھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا تھا، مگر اس کے باوجود کسی بھی طرح کسی بھی راستے سے امیر بننے کی خواہش اس کے اندر موجود تھی، جس کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ ابھی بابا سائیں سے مل کر آئے اسے چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک بار پھر ان سے ملنے کی خواہش نے انگڑائی لے لی، بابا سائیں سے ملاقات کا ذہن میں آنا تھا کہ وہ بے چین ہو گیا اور پھر دل ہی دل میں ان سے ملنے کا پروگرام بنالیا۔

☆☆☆☆☆

اشرف ابھی دفتر کی صفائی کر رہا تھا جب کرم دین ہاتھ میں دیسی گھی کا ڈبا لیے بابا سائیں سے ملاقات کے لیے جا حاضر ہوا۔

"خیر تو ہے کرم دین...... آج صبح صبح ہی آ گئے؟" اشرف نے کرم دین کو دیکھ کر سوال کیا۔

"جب دل میں کسی سے ملنے کی لگن ہو تو وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔"

"لیکن ہمارا دفتر تو اپنے ٹائم پر ہی کھلتا ہے، اور بابا سائیں نے بھی اپنے آنے کا وقت مقرر کر رکھا ہے"

"یہاں تمہارے پاس بیٹھ کر انتظار تو کیا جا سکتا ہے ناں؟" کرم دین نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بات کی۔

"میرے پاس تو جب تک چاہو بیٹھو...... مگر...... بابا سائیں سے تمہیں مل پاؤ گے۔"

"کیوں؟" کرم دین نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"کیونکہ آج بابا سائیں اپنے اسلام آباد والے دفتر میں بیٹھیں گے۔"

"یہ تو میرے ذہن میں ہی نہیں رہا۔ بس بابا سائیں سے ملنے کو دل کیا اور چلا آیا۔" بات کرتے ہوئے کرم دین اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چل دیئے؟" اسے اٹھتے دیکھ کر اشرف بول پڑا۔

"بابا سائیں نے تو آنا نہیں، پھر یہاں بیٹھے رہنے سے کیا حاصل؟"

"دیکھ لو کرم دین! اگر بابا سائیں نہیں تو میں تو ہوں کچھ دیر کے لیے ہم غریبوں کے پاس بھی بیٹھ جاؤ۔ میں جانتا ہوں بابا سائیں کے ساتھ تمہارے بہت اچھے تعلقات ہیں مگر ہم بھی اتنے برے نہیں۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو...... کہاں بابا سائیں اور کہاں میں۔"

"میں جھوٹ تو نہیں بول رہا کرم دین! پچھلی بار جب تم آئے تھے تو تمہارے جانے کے بعد بابا سائیں دیر تک تمہاری ہی باتیں کرتے رہے تھے۔"

"یہ تو ان کی مہربانی ہے۔ ورنہ میں کسی قابل کہاں۔"

"اچھا اب کہاں جا رہے ہو؟ جب بابا سائیں سے ملنے آئے ہو تو پھر مل کر ہی جانا۔"

"جب انہوں نے آنا ہی نہیں تو یہاں بیٹھ کر بھی کیا کرنا۔"

"مایوس کیوں ہوتے ہو۔ میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا تم سکون سے بیٹھو بابا سائیں آتے ہی ہوں گے۔"

اشرف کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر کرم دین کو ایک زوردار جھٹکا لگا...... "واقعی......؟"

"ہاں......" اشرف نے مسکراتے ہوئے کرم دین کو دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔"

"فکر نہ کرو بابا سائیں کے آتے ہی تمہاری جان میں جان آجائے گی۔"

اشرف ابھی بات کر رہا تھا کہ بابا سائیں بھی وہاں پہنچ گئے، بابا سائیں کو دیکھتے ہی کرم دین نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگائے اور پھر انہیں عقیدت سے چوما۔

"آؤ...... اندر آجاؤ......" بابا سائیں نے کرم دین کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اور پھر اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "ہمارا مہمان آیا ہے بھئی، اس کے لیے کوئی چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔"

"جی بابا سائیں ابھی لاتا ہوں۔" اشرف نے آہستہ سے جواب دیا۔

وہ دونوں کمرے میں آ بیٹھے تھے، بیٹھتے ہی کرم دین نے دیسی گھی والا ڈبہ نکال کر بابا سائیں کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے کرم دین؟" بابا سائیں نے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں دیسی گھی ہے بابا سائیں۔"

"اس کا کیا کروں؟"

"یہ آپ کے لیے لایا ہوں۔"

"کیا تم نے بھینسیں رکھی ہوئی ہیں؟"

"میرے پاس بھینسیں تو نہیں ہیں بابا سائیں! بس کہیں سے گھی مل گیا تو آپ کے لیے لے آیا۔"

"مگر میرے لیے کیوں لائے ہو؟ اپنے بچوں کو کھلاؤ۔ یہ سب ان کا حق ہے۔"

"ان کا حق اپنی جگہ بابا سائیں...... مگر آپ ان سے پہلے ہیں...... آپ اسے سوغات سمجھ کر ہی رکھ لیجیے......"

"آج تو میں یہ رکھ لیتا ہوں...... مگر آئندہ اس طرح کی کوئی دوسری چیز نہ لانا" بابا سائیں نے دیسی گھی والا ڈبہ اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

اس دوران کرم دین اپنی سیٹ سے اٹھ کر بابا سائیں کے پاس آ کھڑا ہوا تھا، اسے دیکھتے ہی بابا سائیں بول پڑے "کیا بات ہے کرم دین! تم یہاں کیوں آ کھڑے ہوئے؟"

"مجھے کچھ دیر کے لیے اپنے قدموں میں بیٹھا رہنے دیں بابا سائیں......" یہ کہتے ہوئے کرم دین بابا سائیں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو کرم دین......؟" بابا سائیں نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"شاید اسے آپ گستاخی سمجھیں لیکن آج میں ان قدموں سے اس وقت تک نہیں اٹھوں گا، جب تک آپ مجھے کچھ عطا نہیں کر دیتے۔"

"یہ کیا بچوں والی حرکت ہے کرم دین! تم یہاں سے اٹھو اور میرے سامنے بیٹھ کر بات کرو۔" بابا سائیں نے کرم دین کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

بابا سائیں کی بات کرم دین کی عقل میں آ گئی تھی، اس لیے وہ خاموشی سے واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور انتظار کرنے لگا کہ اب بابا سائیں کیا کہتے ہیں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ بابا سائیں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "کرم دین! میری بات غور سے سنو آج اگر میں کچھ ہوں تو اس کے پیچھے میری سالوں کی محنت اور ریاضت شامل ہے اور یہ تم جان ہی گئے ہو گے کہ اگر میرے پاس کچھ ہے تو لوگ میرے پاس آتے ہیں لیکن میری ایک بات یاد رکھنا، میں وہ سب بانٹتا نہیں پھرتا مگر تم نہ جانے کیوں کسی ضدی بچے کی طرح ایک ہی بات کے پیچھے پڑے ہوئے ہو، جبکہ میں تمہیں ایک بار نہیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ تم گھر جاؤ، اپنے بیوی بچوں کے لیے محنت کرو اور روزی کماؤ۔"

"میں بہت سی امیدیں لیے آپ کے پاس آیا ہوں بابا سائیں! اس قدر مایوس تو نہ کیجیے۔"

"جانتے ہو جتنی دیر سے تم یہاں میرے پاس بیٹھے ہو، اتنی دیر میں تو میں یہاں آنے والوں سے ہزاروں روپے نکلوا لیتا ہوں۔"

"آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ ایک بار حکم تو کریں، میں پیسے دینے کو بھی تیار ہوں۔"

"کرم دین کچھ تم سے تعلق ایسا بن گیا ہے کہ میں تم سے پیسے بھی نہیں لے سکتا۔"

"پھر کچھ نظر کرم فرما دیجیے۔"

کرم دین کی بات سن کر بابا سائیں نے ایک لمبی سانس لی اور بولے "اچھا آج تو میں تمہاری ضد مان کر کچھ کرتا ہوں لیکن آئندہ اس معاملے میں مجھے کبھی تنگ مت کرنا......"

"جی بابا سائیں ایسا ہی ہوگا......" کرم دین نے کسی اچھے بچے کی طرح گردن جھکا کر کہا۔

بابا سائیں نے میز کا دراز کھولا اور ایک سفید کاغذ نکال کر اس پر کچھ لکھنے لگے، کرم دین کی نظریں مسلسل اسی کاغذ پر لگی ہوئی تھیں جس پر بابا سائیں کچھ تحریر کر رہے تھے، بابا سائیں نے کاغذ پر کچھ کلمات لکھے اور وہ کاغذ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے "اس پر کچھ کلمات لکھے ہیں اگر کوئی بھینس یا گائے دودھ نہ دیتی ہو یا کم دیتی ہو، یہ گیارہ بار پڑھ کر کسی بھی چیز پر پھونک مار کر اس بھینس یا گائے کو کھلاؤ گے تو جو دودھ نہیں دیتی ہوگی وہ دودھ دینے لگے گی اور جو دودھ کم دیتی ہوگی وہ پہلے سے کہیں زیادہ دودھ دینے لگے گی۔ بس لوگ خوش ہو کر کچھ نہ کچھ دے جایا کریں گے، اسی کو بہت سمجھنا اور زیادہ لالچ نہ کرنا۔"

☆☆☆☆☆

کرم دین کو کسی نے کبھی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لیے وہ جس کسی سے بھی دم کرنے کی بات کرتا، وہ ہنس دیتا، اور تو اور عائشہ بھی یہ بات سن کر اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکی تھی، کیونکہ ان سب کی نظر میں کوئی نمازی، پرہیزگار یا مولوی تو اس طرح کے کام کرتا اچھا بھی لگتا ہے مگر کرم دین جیسا بے دین اور بے نمازی کیا کسی چیز کا دم کرتا۔

بستی میں اس طرح کی بھینسیں تو کئی گھروں میں تھیں جو دودھ کم دیتی تھیں، جس کی وجہ سے وہ لوگ پریشان بھی تھے، وہ ڈاکٹر سے دوائی لانے کے علاوہ کئی دیسی ٹوٹکے بھی آزماتے اور میاں جی سے پیڑے پر دم کروا کر بھی بھینس کو کھلاتے تھے۔ بستی کے لوگ کسی بھی طرح اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ وہ کرم دین سے اپنی بھینس یا گائے کے لیے کسی چیز پر دم کروائیں، کرم دین نے اس مشکل میں مبتلا کئی لوگوں سے بات کی مگر انہوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا تھا۔

کرم دین اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا کہ اس نے اللہ داد کے بیٹے مبارک کو پلیٹ میں آٹے کا پیڑہ لیے وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا، پہلے تو وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اچانک کچھ سوچ کر اسے آواز دی۔ "کہاں جا رہے ہو مبارک؟"

"میاں جی سے آٹے کا پیڑہ دم کروانے جا رہا ہوں۔"

"بھینس کو کھلانا ہے؟" کرم دین نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی دریافت کیا۔

"ہاں! وہ دودھ بہت کم دیتی ہے ناں...... میاں جی سے دم کروا کر یہ آٹے کا پیڑہ کھلائیں گے تو وہ دودھ زیادہ دینے لگے گی۔"

"یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں......"

"تم اور دم؟" مبارک نے ہنستے ہوئے سوال کیا، پھر خود ہی بولا "نہ بھئی نہ...... میں تو میاں جی کے پاس ہی جاؤں گا۔"

"تمہاری مرضی ہے بھئی۔"

مبارک نے کرم دین کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مسجد کی طرف چل پڑا، کرم دین خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا اور اندر ہی اندر یہ سوچ کر کڑھتا رہا "میاں جی کے پاس ایسا کیا ہے جو لوگ انہی کے پاس جاتے ہیں، جب میں بھی یہ دم کرنا جانتا ہوں تو لوگ مجھ سے دم کیوں نہیں کرواتے۔"

کرم دین وہیں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا، مبارک کو گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ واپس آتا دکھائی دیا، قریب آتے ہی کرم دین نے اسے پھر روک لیا اور بولا "ہاں بھئی دم کروا لائے؟"

"میاں جی ملے ہی نہیں......"

"تو لاؤ پھر آج مجھ سے ہی پھونک مروا لو......"

کرم دین کی بات سن کر مبارک کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر پلیٹ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "چلو آج تم بھی اپنا شوق پورا کر لو...... ویسے بھی میاں جی کہیں گئے ہوئے ہیں، شاید ایک دو دن بعد ہی لوٹیں۔"

کچھ دیر پہلے تک کرم دین انتہائی پراعتماد تھا مگر جیسے ہی مبارک نے آٹے کے پیڑے والی پلیٹ اس کے ہاتھوں میں پکڑائی، اس پر عجیب سا خوف طاری ہو گیا، اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی ہلکی سی لرزش محسوس ہونے لگی اور دل کسی انجانے ڈر سے تیز تیز دھڑکنے لگا، کیونکہ اس کے لیے یہ آزمائش کی گھڑی تھی، آج بہت صبر اور انتظار کے بعد اسے ایک موقع میسر آ گیا تھا، یہی وہ لمحے تھے جن سے اس کے آنے والے دنوں کا تعین ہونا تھا، کامیابی کی صورت میں اس کے لیے بہت سے دروازے کھل جانے تھے جبکہ ناکامی کی صورت میں اس پر سبھی راستے بند ہو سکتے تھے۔

کرم دین نے ایک دو لمبی لمبی سانسیں لیں اور پھر خود کو کنٹرول کرتے ہوئے مکمل یقین کے ساتھ بابا سائیں کے بتائے ہوئے کلمات پڑھ کر آٹے کے پیڑے پر پھونکنے لگا اور مبارک بغور اس کا جائزہ لیتا رہا، وہ دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ اس نے تو جان بوجھ کر محض کرم دین کا مذاق اڑانے کے لیے آٹے کے پیڑے والی پلیٹ اس کے حوالے کی تھی مگر وہ کچھ پڑھ کر پیڑے پر اس طرح پھونکیں مار رہا تھا جیسے اسی کے دم سے بھینس نے دودھ دینے لگ جانا ہے، کرم دین نے تسلی سے بابا سائیں کے بتائے ہوئے کلمات پڑھ کر پیڑے پر پھونکے اور پلیٹ مبارک کے حوالے کر دی۔

مبارک کی مرضی نہ تھی کہ وہ کرم دین سے بھینس کے لیے پیڑہ دم کروائے مگر اس نے کرم دین کا مذاق اڑانے کے لیے ایسا کیا تھا اور وہ اپنے ارادے میں کامیاب بھی ہوا تھا، اسی لیے گھر پہنچنے تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرتی رہی، گھر پہنچ کر مبارک نے آٹے والی پلیٹ اپنی ماں کے حوالے کی اور خود دوسرے کاموں میں لگ گیا۔

مبارک کو علم تھا کہ ابھی میاں جی ایک دو روز تک نہیں آئیں گے، مگر اس نے گھر میں کسی کو بھی یہ بات نہ بتائی اور نہ ہی کرم دین سے پیڑہ دم کروا کر لانے کا ذکر کیا، دم کیا ہوا آٹے کا پیڑہ بھینس کو کھلا دیا گیا تھا، لیکن بھینس نے حسب معمول دودھ تھوڑا ہی دیا تھا، اگلے روز مبارک نے اپنی ماں سے کہہ کر بھینس کو کھلانے کے لیے آٹے کا پیڑہ تیار کروایا اور یہ کہہ کر گھر سے نکل پڑا کہ وہ میاں جی سے دم کروا لائے۔

کرم دین نے پہلی بار بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کلمات پڑھ کر پیڑے پر

پھونکیں ماری تھیں اور رات بھر یہ جاننے کے لیے بے چین رہا کہ اس کے دم نے کیا اثر کیا۔

آٹے کے پیڑے والی پلیٹ ہاتھوں میں لیے مبارک گھر سے نکل پڑا، کرم دین اپنے گھر کے سامنے ہی کھڑا تھا، اسے دیکھتے ہی اپنے پروگرام کے مطابق مبارک اس کی طرف بڑھنے لگا، مبارک کو ہاتھوں میں آٹے کے پیڑے والی پلیٹ لیے اپنی طرف آتا دیکھ کر کرم دین کے دل میں ہونے والی ہلکی ہلکی سی دھک دھک ڈھول کی طرح تیز تیز بجنے لگی تھی، وہ سوچنے لگا کہ ابھی کل تو وہ بلانے کے باوجود بھی نہیں آرہا تھا مگر آج وہ خود ہی اس کی طرف چلا آرہا تھا۔

"کیوں بھئی مبارک! کیسا رہا میرا دم؟" مبارک کے قریب آتے ہی دھڑکتے دل کے ساتھ کرم دین نے دریافت کیا۔

"تمہارے دم نے تو کمال کر دیا۔" مبارک نے کرم دین کی جھوٹی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

مبارک کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نے کرم دین کا حوصلہ بڑھا دیا، اس لیے وہ خوش ہو کر بولا "دیکھ لو تم تو مان ہی نہیں رہے تھے..... یہ تو میں نے ہی زبردستی پیڑے پر دم کر دیا، ورنہ تم تو واپس جا رہے تھے۔"

"میں غلطی پر تھا لیکن تمہارے دم میں تو واقعی بہت اثر ہے، اسی لیے تو ابا نے آج پھر تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

"آج میں پھر تمہیں پیڑہ دم کر کے دیتا ہوں اگر پیڑے نے اپنا کام نہ کر دکھایا تو پھر کہنا۔" کرم دین نے بات کی اور مبارک سے پلیٹ لے کر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کلمات پڑھ کر پیڑے پر پھونکنے لگا۔

کرم دین سے دم کروا کر مبارک نے گھر کی راہ لی اور گھر پہنچتے ہی پلیٹ اپنی ماں کے ہاتھوں میں تھما کر، یہ بتائے بغیر کہ وہ میاں جی سے دم کروا لایا ہے یا نہیں، ادھر ادھر ہو گیا۔

مبارک کی ماں نے پیڑہ اٹھایا اور بھینس کو کھلا دیا۔

شام ہوئی تو اللہ داد نے بالٹی میں صاف پانی لے کر بھینس کے تھن اچھی طرح سے دھوئے اور پھر تھن دھونے کے بعد جو پانی بچ گیا تھا اسے گرا کر خدا کو یاد کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھ کر دودھ نکالنے لگا، جیسے جیسے دودھ سے بالٹی بھرتی جاتی تھی، اللہ داد کی خوشی بڑھتی جاتی تھی، ایک عرصے کے بعد بھینس کے تھنوں سے اتنا دودھ نکل رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ دودھ کے لیے بالٹی کافی ہو گی، مگر حیرانی کی بات تھی کہ جس تیزی سے دودھ سے بالٹی بھر رہی تھی وہ بالٹی چھوٹی پڑ رہی تھی۔

"دودھ کے لیے کوئی برتن لے کر آنا....." اللہ داد نے اونچی آواز میں کہا۔

"ابھی تو بالٹی لے کر گئے ہو....." اللہ داد کی بیوی فاطمہ نے وہیں سے آواز لگائی۔

"وہ بالٹی میرے پاس ہے۔ تم جلدی سے کوئی دوسرا برتن لے کر آؤ۔"

خاوند کی بات سن کر فاطمہ نے کچن سے بالٹی اٹھائی اور فوراً اس کے پاس پہنچ گئی، اللہ داد نے دودھ سے بھری بالٹی اسے تھما دی اور اس سے دوسری بالٹی لے کر دودھ نکالنے لگا۔

"یہ..... یہ سارا اسی بھینس کا دودھ ہے.....؟" دودھ سے بھری بالٹی دیکھ کر فاطمہ نے سوال کیا۔

"تو اور کیا..... یہ دودھ میں کہیں اور سے لایا ہوں.....؟"

"لگتا ہے میاں جی کا دم اثر کر گیا..... ورنہ ہم نے اس کے علاج کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔"

باتوں کے دوران ہی اللہ داد نے دودھ دھونے کا کام مکمل کر لیا تھا، پہلی بھری ہوئی بالٹی کے بعد آدھی بالٹی دودھ اور نکل آیا تھا، اللہ داد نے اٹھتے ہوئے خوش ہو کر بھینس کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور دو تین تھپکیاں بھی دیں، وہ دونوں ہی بہت خوش تھے، دونوں کے ہاتھوں میں دودھ کی بالٹیاں پکڑی ہوئی تھیں اور باتیں کرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"یہ والا دودھ میاں جی کو بھجوا دینا....." اللہ داد نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دودھ کی بالٹی کو چولہے کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

"مبارک آتا ہے تو میں بھجوا دوں گی....."

فاطمہ نے پتیلی میں دودھ ڈال کر گرم کرنے کے لیے چولہے پر رکھ دیا تھا، اس نے بہت دنوں کے بعد اتنا دودھ دیکھا تھا، اس لیے بار بار ماشاء اللہ، ماشاء اللہ کہتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے امی!..... آج بہت خوش نظر آ رہی ہو؟" مبارک نے ماں کو خوش دیکھ کر سوال کیا۔

"ادھر دیکھو....." دودھ والی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دودھ دکھاتے ہوئے فاطمہ نے کہا۔

"اتنا دودھ؟" مبارک نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"یہی نہیں یہ بھی ہے....." فاطمہ نے دودھ والی بالٹی سے کپڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مگر اتنا دودھ کہاں سے آیا؟" مبارک کی حیرانی ابھی تک برقرار تھی۔

"بس اللہ نے کرم کر دیا اور تم خود ہی تو میاں جی سے آٹے کا پیڑہ دم کروا کر لائے تھے۔"

ماں کی بات سن کر مبارک کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور بولا "مگر میاں جی تو کل ملے تھے نہ آج..... وہ تو ایک دو دن کے لیے کسی دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر دم کس سے کروا کر لائے تھے؟"

"کرم دین سے۔"

"کرم دین سے دم کروا کر لائے تھے؟" فاطمہ نے حیران ہو کر دریافت کیا اور پھر ساتھ ہی پوچھنے لگی "وہ کب سے دم کرنے لگا؟"

"یہ تو پتا نہیں امی لیکن کل جب میں میاں جی کے نہ ملنے کی وجہ سے واپس آ رہا تھا تو کرم دین اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا، اس نے مجھے بلا لیا اور پیڑے پر دم کر دیا، لیکن آج میں اسے محض بیوقوف بنانے کے لیے خود آٹے کا پیڑہ لے کر اس کے پاس گیا تھا۔"

فاطمہ غور سے مبارک کی بات سنتی رہی اور پھر بولی "اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھینس کے لیے آٹے پر میاں جی نے نہیں کرم دین نے دم کیا تھا۔"

"ہاں امی! میں سچ کہہ رہا ہوں"

مبارک کی بات سن کر فاطمہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی "یہ بالٹی میں دودھ میاں جی کے لیے رکھا تھا، تم ایسا کرو یہ کرم دین کو دے آؤ۔"

فاطمہ کی بات کے دوران اللہ داد بھی وہاں آ گیا تھا مگر اس نے پوری بات نہیں سنی تھی۔

"یہ کرم دین کو دودھ کس لیے بھجوانا ہے؟" اللہ داد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تمہیں پتا ہے یہ جو بھینس نے اتنا دودھ دیا ہے ناں۔ یہ کرم دین کے دم کی وجہ سے ہوا ہے۔" فاطمہ نے تمام تر تفصیل اللہ داد کے سامنے بیان کر دی۔

کرم دین کے متعلق باتیں سن کر اللہ داد حیران تھا، مگر اس نے بھی جلدی سے بیوی کی بات کی تائید کر دی اور بولا "اگر ایسا ہے تو پھر اس دودھ پر اسی کا حق بنتا ہے۔"

اپنے والدین کی بات سن کر مبارک نے دودھ والی بالٹی اٹھائی اور اسے کپڑے سے ڈھک کر کرم دین کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ دو بار محض کرم دین کا مذاق اڑانے اور اس کو بیوقوف بنانے کی خاطر گیا تھا، مگر اب دودھ کی بالٹی ہاتھوں میں تھامے کرم دین کے متعلق سوچتا ہوا جا رہا تھا، مبارک نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی تو کچھ ہی دیر بعد کرم دین نے ہی دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے مبارک...... کہیں پھر پیڑہ دم کروانے تو نہیں آئے؟'' مبارک پر نظر پڑتے ہی کرم دین نے سوال کیا۔

''تمہارے لیے دودھ لایا ہوں۔'' مبارک نے دودھ والی بالٹی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تمہاری بھینس نے خوب دودھ دیا ہے۔'' کرم دین نے مبارک سے دودھ کی بالٹی پکڑتے ہوئے بات کی۔

''ہاں! اتنا دودھ دیا ہے کہ امی اور ابا کو تو اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب تمہارے دم کی وجہ سے ہوا ہے''

''ویسے مان تو تم بھی نہیں رہے تھے۔''

''کل کی بات اور تھی مگر آج تو میں خود آیا تھا ناں۔''

کرم دین اور بھی بہت سی باتیں کرنا چاہ رہا تھا، لیکن ساتھ ہی اسے اس بات کی بھی بے چینی لگی ہوئی تھی کہ وہ عائشہ کو بھی جلدی سے بتا دے کہ وہ تو مانتی نہیں تھی، مگر اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ محض اس کے دم کی وجہ سے بھینس کے دودھ میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

''اچھا تم ایک منٹ ٹھہرو۔ میں دودھ اندر دے آؤں اور تمہیں بالٹی بھی لا دوں۔'' کرم دین نے اندر جاتے ہوئے مبارک کو کہا۔

''ٹھیک ہے میں یہیں کھڑا ہوں۔'' مبارک نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

کرم دین نے جلدی سے دروازہ کھولا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہو گیا...... ''یہ لو دودھ......'' کرم دین نے عائشہ کے سامنے دودھ کی بالٹی لہراتے ہوئے کہا۔

''یہ کہاں سے آیا ہے؟'' عائشہ نے حیران کن لہجے میں دریافت کیا۔

''یہ اللہ داد کا بیٹا مبارک لایا ہے۔''

''مگر کس لیے؟''

''تم تو نہیں مانتی تھی ناں...... مگر دیکھ لو یہ صرف میرے دم کی وجہ سے ہوا ہے کہ ان کی بھینس نے زیادہ دودھ دیا''

''یہ نہ کہو کہ تمہارے دم کی وجہ سے کیونکہ یہ اللہ کے کلام کی برکت سے ہوا ہے۔'' عائشہ نے کرم دین کو سمجھایا۔

''اچھا اچھا...... اپنی باتیں اپنے پاس رکھو اور دودھ کسی پتیلی میں ڈال کر بالٹی واپس دو...... مبارک باہر ہی کھڑا ہے''

عائشہ نے خاموشی سے بالٹی پکڑی اور دودھ پتیلی میں ڈال کر بالٹی اچھی طرح دھو کر کرم دین کو پکڑا دی۔

''یہ لو بالٹی، اور دیکھو اگر پھر کبھی ایسا کوئی مسئلہ ہو تو آ جانا۔ اب میاں جی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔'' باہر آتے ہی کرم دین نے مبارک کو بالٹی پکڑاتے ہوئے کہا۔

''اب تم جو ہو میاں جی کے پاس کیا لینے جانا ہے۔'' مبارک نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

کرم دین اپنی پہلی کامیابی پر اس بچے کی طرح خوش تھا جو پہلی بار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چلنا شروع کرتا ہے، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بستی کی ساری ہی بھینسیں دودھ دینا چھوڑ دیں اور لوگ دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئیں، وہ دم کر کے آٹے کے پیڑے انہیں دے جس کی وجہ سے ان کی بھینسیں زیادہ دودھ دینے لگیں اور یوں ہر طرف اس کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگے۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کا خیال تھا کہ اب دیکھتے ہی دیکھتے گھر گھر اس کے چرچے ہونے لگیں گے، مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا، اللہ داد اور مبارک کی وجہ سے کچھ لوگوں کے کانوں میں اس بات کی بھنک ضرور پڑ گئی تھی کہ کرم دین بھی بھینس یا گائے کے لیے پیڑے پر دم کر کے دینے لگا ہے، لیکن کسی نے اتنا زیادہ نوٹس نہیں لیا تھا۔ اب بھی اگر کسی کو اس قسم کا کوئی مسئلہ محسوس ہوتا، وہ سیدھا میاں جی کے پاس ہی جاتا تھا، کبھی کبھی کسی سے سن سنا کر یا میاں جی کی غیر موجودگی میں کوئی ایک آدھ بندہ کرم دین کے پاس بھی چلا آتا، مگر اس کے عوض اگر کسی کی بھینس پہلے سے زیادہ دودھ دینے لگتی تو محض چند گڑویاں دودھ دے جاتا ورنہ کئی بار وہ بھی نہیں ہوتا تھا، جو تھوڑی بہت آمدن ہونے لگی تھی وہ انتظامیہ کے حکم پر بھینسوں کو شہری حدود سے باہر نکالنے کی وجہ سے کم ہوتے ہوتے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

کرم دین نے جو بڑے بڑے خواب دیکھے تھے وہ چکنا چور ہونے لگے تھے اور وہ پھر سے مایوسی کی طرف بڑھنے لگا، وہ ان لوگوں میں سے تھا جو راتوں رات امارت کی سبھی سیڑھیاں پھلانگ کر دولت مند بننا چاہتے ہیں، اس کے لیے وہ نہ تو محنت کرتے ہیں نہ ہی انتظار اور صبر۔ کرم دین بھی آنکھ جھپکنے سے پہلے اپنے سامنے دولت کے انبار لگے دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے ایک بار پھر بابا سائیں کے پاس جانے کا پروگرام بنا لیا۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں کی طرف سے اخبار میں دیا جانے والا پرائز بانڈ پر پہلا انعام پانے کا اشتہار پڑھ کر بہت سے لوگ بابا سائیں کے پاس آ پہنچتے تھے، اشتہار پڑھ کر فرحان کے دل میں بھی پرائز بانڈ پر پہلا انعام حاصل کرنے کی خواہش نے انگڑائی لی تھی اور وہ پچاس ہزار روپے لے کر بابا سائیں کے دفتر پہنچا تھا، اس سے پہلے بھی کچھ لوگ بابا سائیں کے پاس آئے بیٹھے تھے، اس لیے اشرف نے اسے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا تھا، اشرف کے کہنے پر وہ بھی اپنی باری کے انتظار میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

فرحان کے بیٹھتے ہی اشرف، بابا سائیں کے متعلق باتیں کرنے لگا اور ان کی کرامات کا ذکر کرتے ہوئے ایسے ایسے واقعات سنانے لگا، جب محض ان کی وجہ سے لوگوں کا پہلا انعام نکلا تھا اور پھر کس طرح لوگوں نے خوش ہو کر بابا سائیں کی خدمت کی تھی، اشرف باتیں سناتا رہا اور فرحان شوق اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد جو لوگ بابا سائیں کے پاس بیٹھے تھے، وہ کمرے سے نکل آئے، ان کے جانے کے بعد اشرف بابا سائیں کے کمرے میں گیا اور اس کے آنے کی اطلاع دے کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور اسے بابا سائیں کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو بابا سائیں نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کا استقبال کیا اور پھر اس کے بیٹھنے پر پیار سے بولے...... ''جی فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میں پرائز بانڈ کے سلسلے میں آیا ہوں۔'' فرحان نے بات کی۔

''لائیں پرائز بانڈ دیں۔''

"ابھی میں پرائز بانڈ تو نہیں لایا۔"

"کوئی بات نہیں آپ کیش دے دیں میں ابھی منگوا دیتا ہوں اگر آپ خود بانڈ خرید کر لانا چاہیں تو پھر بھی ٹھیک ہے۔"

"پہلا انعام تو نکلے گا ناں؟" فرحان نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

فرحان کی بات سن کر بابا سائیں مکمل اعتماد سے بولے "میں پہلا انعام نکلنے کی گارنٹی دیتا ہوں، اسی لیے لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ میں دوسرے لوگوں کی طرح یہ بھی نہیں کہتا کہ اس نمبر کا بانڈ خرید لو پھر انعام نکلے گا، اور نہ ہی اس کام کے لیے میں کوئی اضافی رقم ہی وصول کرتا ہوں۔"

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بانڈ خرید لاؤں؟" بابا سائیں کی بات سن کر فرحان نے اجازت طلب کی۔

بابا سائیں نے اس کی اس بات پر کوئی اعتراض نہ کیا، کیونکہ وہ ایسا کرنے کے لیے خود بھی کہہ چکے تھے۔

فرحان کو پرائز بانڈ خرید کر لانے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی، پرائز بانڈ کی خریداری کے دوران ہی اس نے اپنے طور پر تمام تر منصوبہ بندی کر لی تھی، جب وہ بابا سائیں کے کمرے میں داخل ہوا تو انعامی بانڈ اس کے ہاتھ میں تھے۔

"ہاں بھئی لے آئے بانڈ....." بابا سائیں نے اس کے آنے پر دریافت کیا۔

"جی لے آیا ہوں.....لیکن کیا یہ ممکن ہے۔ آپ نے جو عمل کرنا ہے.....وہ.....وہ ان کی فوٹو کاپیوں پر کر دیں....." فرحان نے رک رک کر بات کی۔

فرحان کی بات سن کر بابا سائیں کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے....."لائیں بانڈ مجھے دیں، میں ان کی فوٹو کاپیاں کروا دوں۔"

فرحان کے کہنے پر بابا سائیں بانڈز کی فوٹو کاپیوں پر عملیات کرنے کے لیے باآسانی تیار ہو گئے تھے اور اس سے بانڈ مانگ رہے تھے تا کہ وہ اشرف کو بھجوا کر ان کی فوٹو کاپیاں کروا لیں۔ فرحان اس بات پر بھی ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ فوٹو کاپیاں کروانے کے دوران ہی کوئی گڑبڑ نہ کر دیں، اس لیے ڈرتے ہوئے بولا "اگر آپ برا نہ منائیں.....تو.....بانڈز کی کاپیاں.....میں خود کروا لاؤں......"

"لگتا ہے آپ کے ذہن میں کہیں نہ کہیں کوئی شک ضرور ہے۔"

"نہیں نہیں ...... ایسی کوئی بات نہیں....." فرحان نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"دیکھو برخوردار! آپ کے دل میں ذرا سا بھی کہیں کوئی ڈر یا خوف ہے تو اسی طرح کریں جس طرح آپ کی تسلی ہو اگر آپ بانڈز کی کاپیاں خود کروا کر لانا چاہتے ہیں تو خود کروا لائیں، تا کہ جب آپ یہاں سے جائیں تو پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ مطمئن ہو کر جائیں......" بابا سائیں اس قدر اعتماد کے ساتھ بات کر رہے تھے کہ ان کی ہر بات سے سچائی جھلک رہی تھی، اس کے باوجود فرحان بانڈز کی کاپیاں خود کروا کر لانا چاہتا تھا، اس لیے بابا سائیں کی بات سنتے ہی فوراً بولا "خدا گواہ ہے بابا سائیں......میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ کاپیاں کروا لائیں۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

اجازت ملتے ہی فرحان اٹھا اور بانڈز کی کاپیاں کروا کر بابا سائیں کے حوالے کر دیں، بانڈز کی کاپیاں لے کر بابا سائیں نے اچھی طرح ان پر دھاگہ لپیٹا اور دراز میں رکھ دیں، پھر فرحان سے بانڈ بھی لے لیے اور ان پر بھی اچھی طرح دھاگہ لپیٹنے کے بعد انہیں لفافے میں ڈال کر اپنے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولے "میں نے فوٹو کاپیاں اپنے پاس رکھ لی ہیں۔ آج سے پہلے میں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ فوٹو کاپیوں پر عملیات کیے ہوں لیکن محض آپ کے اطمینان کے لیے ایسا کر رہا ہوں۔" باتوں کے دوران ہی بابا سائیں نے میز کی دراز میں سے جائے نماز نکال لی تھی اور فرحان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے......"یہ نیچے بچھا لیں اور سچے دل کے ساتھ پہلے انعام کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کریں۔"

فرحان نے بابا سائیں کے کہنے کے مطابق جائے نماز بچھایا اور اس پر بیٹھ کر دعا کی، دعا کے بعد پرائز بانڈ والا لفافہ فرحان کے حوالے کر دیا گیا، ساتھ ہی اسے ایک کاغذ بھی تھما دیا گیا، جس پر تمام ضروری ہدایات درج تھیں، جن کے مطابق پرائز بانڈ والا لفافہ قرعہ اندازی والے دن ہی کھولنا تھا اور انعام نکلنے پر انعام کا دسواں حصہ بابا سائیں کو ادا کرنا تھا، فرحان نے وہیں کھڑے کھڑے سرسری سی نظر اس ہدایت نامے پر ڈالی اور اسے احتیاط سے جیب میں ڈال کر بابا سائیں سے اجازت لیتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆☆

فرحان نے بابا سائیں سے دم کروا کر پرائز بانڈ الماری میں لا کر رکھ دیے تھے، مگر وہ مطمئن نہیں تھا، وہ دن بھر بے چین رہا اور اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات جگہ پاتے رہے، اس نے اپنے گھر والوں سے بھی یہ بات چھپائی تھی اس لیے کسی سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رات ہوئی تو اس نے بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنے کے لیے جائے نماز بچھائی اور نفل ادا کرنے کے لیے نیت باندھ لی، نفل ادا کرنے کے بعد وہ تسبیح لے کر بابا سائیں کے بتائے ہوئے الفاظ پڑھ کر تسبیح کا ایک ایک دانہ گرانے لگا، اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنے سے اسے دلی اطمینان ہوا تو وہ یہ عمل جاری رکھے گا، لیکن اگر اس کے دل کی کھٹک دور نہ ہوئی تو وہ اس عمل سے باز رہے گا۔

فرحان نوافل اور تسبیح سے فارغ ہو چکا تھا مگر اس کے خدشات ابھی تک اپنی جگہ تھے، اس نے بہتر یہی سمجھا کہ مزید وقت ضائع کیے بغیر الماری میں پڑے ہوئے لفافے کو کھول کر بانڈ چیک کر لیے جائیں، وہ جلدی سے الماری کی طرف بڑھا اور لفافہ پکڑ کر چارپائی پر آ بیٹھا، لفافہ کھولتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہوتی گئی، لیکن جیسے ہی لفافہ کھلا، ایک لمحے کے لیے اس کے دل کی دھڑکن تھم گئی تھی، کیونکہ اس کے تمام تر خدشات صحیح ثابت ہوئے تھے، لفافے میں بانڈز کی جگہ دھاگے میں لپٹے ہوئے بانڈ کے سائز کے ادھ جلے کاغذ موجود تھے، یہ دیکھ کر اس کا سر چکرا کر رہ گیا تھا مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا، اس نے خود کو بستر پر گرا دیا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں مگر نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔

سورج نکل آیا تھا اور ہر طرف روشنی پھیل چکی تھی، فرحان نے اپنی موٹر سائیکل لی اور کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل پڑا، گھر سے نکلتے ہوئے اس نے پرائز بانڈ والا لفافہ شاپر میں ڈال کر موٹر سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا لیا تھا، بابا سائیں کے پاس جانے سے پہلے اس نے اپنے انتہائی قریبی دوست کو تمام واقعات سنائے تھے اور اسے اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھا کر بابا سائیں کے دفتر کی جانب چل پڑا تھا۔

دونوں دوست بابا سائیں کے دفتر پہنچے تو آٹھ بج

چکے تھے، مگر ابھی دفتر بند تھا، انہوں نے دفتر کے سامنے ہی موٹر سائیکل کھڑی کر دی اور دفتر کھلنے کا انتظار کرنے لگے، کچھ ہی دیر بعد اشرف وہاں آ پہنچا اور دفتر کے تالے کھولنے لگا، اسے دیکھتے ہی وہ دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس جا پہنچے، ابھی وہ تالے کھول ہی رہا تھا کہ فرحان نے اس کے کندھے پر ہاتھ جا رکھا، اشرف نے جلدی سے گردن گھما کر دیکھا اور انہیں اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر حیران ہو گیا، فرحان وہیں کھڑے کھڑے تمام باتیں کر دینا چاہتا تھا مگر اشرف نے اسے ایسا نہ کرنے دیا اور انہیں ساتھ لیے دفتر میں داخل ہو گیا، فرحان کے صبح سویرے دفتر آنے پر اشرف تمام بات سمجھ چکا تھا، لیکن پھر بھی اس نے انہیں اپنے سامنے بٹھا لیا اور باتیں کرنے لگا۔

"خیر تو ہے...... اتنی صبح صبح کیسے آنا ہوا......؟"

"اسے دیکھو......" اشرف کی بات سن کر فرحان نے بانڈز والا لفافہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اشرف نے لفافہ اٹھایا اور اس کے اندر جھانک کر بولا "تمہیں پرائز بانڈ والا لفافہ کھول کر دیکھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی، کیونکہ ہدایات والے کاغذ پر صاف صاف درج ہے کہ جو شخص قرعہ اندازی سے پہلے لفافے کو کھول کر دیکھے گا، وہ نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا۔"

"میں ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھا اس لیے لفافہ کھول کر دیکھنا ہی تھا۔"

"اس طرح کے واقعات تو یہاں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اس لیے بہتر یہی ہے کہ سب کچھ بھول جاؤ اور صبر شکر کر کے اپنے گھر جا بیٹھو کیونکہ یہاں سے تمہیں کچھ ملنے والا نہیں" اشرف نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن جو میرا نقصان ہوا ہے وہ کون پورا کرے گا؟"

"اس بارے میں تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا......"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اس قدر صفائی سے لٹ جاؤں گا"

"اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ کسی طرح تمہیں تمہاری رقم مل جائے گی تو ایسا ممکن نہیں۔"

"آج ہم تمہیں ناممکن کو ممکن بنا کر دکھائیں گے۔ ذرا تمہارے بابا سائیں کو آ لینے دو پھر جو کچھ یہاں ہوگا وہ تم بھی دیکھنا" فرحان نے تیز لہجے میں بات کی، اسی دوران بابا سائیں بھی پہنچ گئے۔

بابا سائیں نے فرحان اور اس کے ساتھی کو اشرف کے ساتھ الجھتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر وہ انجان بن کر وہاں رکے بغیر اپنے کمرے میں جا بیٹھے تھے، ان کے کمرے میں جاتے ہی فرحان اور اس کا ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ بابا سائیں سے اپنی رقم کے بارے میں بات کر سکیں، انہیں بابا سائیں کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر اشرف جلدی سے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا "تم یہیں ٹھہرو پہلے میں بابا سائیں کے ساتھ بات کر لوں۔"

"تمہاری ایسی کی تیسی......" فرحان نے یہ کہتے ہوئے اوپر تلے دو زوردار مکے اشرف کے منہ پر دے مارے۔

اشرف کے منہ پر جو مکے پڑے تھے ان کی وجہ سے اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا، وہ سہم کر ایک طرف ہو گیا اور پھر اسے انہیں روکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بابا سائیں حالات کی نزاکت کو سمجھ چکے تھے، پھر بھی ان دونوں کے کمرے میں داخل ہونے پر مسکراتے

ہوئے بولے "آیئے آیئے تشریف رکھیے۔"

"اپنی یہ جھوٹی مسکراہٹ اپنے پاس رکھو اور ہمیں ہماری رقم دو۔" فرحان نے بانڈز والا لفافہ بابا سائیں کے سامنے میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہوا کیا ہے برخوردار......؟ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے......" بابا سائیں نے انتہائی دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

"اتنے انجان مت بنو فراڈ بھی کرتے ہو اور بھولے بھی بنتے ہو۔"

"کہیں آپ نے یہ لفافہ کھول کر تو نہیں دیکھ لیا؟"

"ہاں کھولا تھا...... تبھی تو تمہارے فراڈ کا پتا چلا۔"

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اس لیے تو تمام عملیات الٹے پڑ گئے میں نے آپ کو ہدایات نامہ دیا تھا اس پر تمام باتیں لکھی ہوئی تھیں اس پر واضح الفاظ میں تحریر ہے کہ قرعہ اندازی سے قبل اس لفافے کو کھولنے والا اپنے نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا تم نے ایسا کیا ہے تو نقصان بھی خود ہی بھگتو۔"

"بس...... بابا سائیں تقریر بہت ہو گئی...... اب سیدھی طرح یہ بتاؤ، ہماری رقم واپس کرتے ہو یا نہیں......؟"

"میرے پاس کونسی رقم ہے جو میں واپس کروں......" بابا سائیں نے انتہائی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

بابا سائیں کی بات سنتے ہی دونوں دوست بجلی کی سی تیزی سے بابا سائیں کے سر پر پہنچ گئے، دونوں نے بابا سائیں کو گردن سے دبوچ کر اوپر اٹھاتے ہوئے زمین پر پٹخ دیا اور ان پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش برسانے لگے۔

☆☆☆☆☆

کرم دین بابا سائیں سے ملنے گھر سے نکلا تو اس کے ایک ہاتھ میں کالے رنگ کا خوب پلا ہوا بکرا پکڑا ہوا تھا، جو اس نے منہ مانگی رقم ادا کر کے ایک روز قبل ہی خریدا تھا، جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا، جس میں باداموں والی برفی تھی جو اس نے خاص طور پر بابا سائیں کے لیے تیار کروائی تھی۔ بابا سائیں کے ہاں پہنچ کر اس نے بکرا دفتر کے باہر ہی ایک طرف باندھ دیا اور خود مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لیے اندر داخل ہو گیا۔

دفتر میں قدم رکھتے ہی عجیب سی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں، وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اشرف اپنے کاؤنٹر پر موجود نہیں تھا، عجیب چیخ و پکار ہو رہی تھی، آوازیں بابا سائیں کے کمرے سے آ رہی تھیں، اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹھائی کا ڈبہ وہیں پھینکا اور تیزی سے بابا سائیں کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہاں اس کے لیے ناقابل یقین سماں تھا، دو نوجوان مل کر لاتوں اور گھونسوں سے بابا سائیں کی پٹائی کر رہے تھے، انہوں نے مار مار کر بابا سائیں کا برا حال کر رکھا تھا، بابا سائیں مار کھاتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کر رہے تھے، بابا سائیں کی حالت اس بکرے کی سی ہو رہی تھی جسے کچھ لوگ پکڑ کر ذبح کر رہے ہوں اور وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے بھیں بھیں کر رہا ہو۔

کرم دین سے بابا سائیں کی حالت دیکھی نہ گئی اور اس نے بابا سائیں کی پٹائی کیے جانے کا سبب جانے بغیر ان دونوں میں سے ایک کو پکڑ کر پوری طاقت سے ایک طرف اچھال دیا، پھر دوسرے کو گریبان سے پکڑ کر اس کے منہ پر کئی گھونسے رسید کر دیے، بابا سائیں کو پٹتا دیکھ کر کرم دین پر عجیب سی وحشت طاری ہو گئی تھی، اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ اس کا مارا

ہوا گھونسا کسے کہاں لگ رہا تھا، وہ کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر ان دونوں کی پٹائی کیے جا رہا تھا۔

فرحان اور اس کا ساتھی کچھ دیر پہلے تک تسلی سے بابا سائیں کی ٹھکائی کر رہے تھے، مگر کرم دین کے اچانک حملے سے وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے، انہیں پکڑنے کے لیے کرم دین ان کے پیچھے دوڑا مگر وہ پھرتی سے جان چھڑا کر نکل گئے، وہ کوشش کرتا تو ان میں سے کسی ایک کو با آسانی دبوچ سکتا تھا مگر اسے بابا سائیں کی فکر تھی جنہیں وہ کمرے میں تڑپتا ہوا چھوڑ آیا تھا۔

کرم دین کمرے میں واپس آیا تو بابا سائیں فرش پر گرے پڑے تھے اور درد سے کراہ رہے تھے، بابا سائیں نے ایک ہاتھ اپنے دل پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے گلے کو دبا کر پکڑ رکھا تھا، وہ بولنے کی کوشش کر رہے تھے مگر آواز ان کے حلق سے نہیں نکل پا رہی تھی، وہ کرم دین سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر کہہ نہیں پا رہے تھے، بابا سائیں کی آنکھوں سے بے بسی صاف دکھائی دے رہی تھی اور ان کے چہرے پر تکلیف کی شدت کے آثار نمایاں تھے۔

کرم دین سے بابا سائیں کی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی، وہ جان چکا تھا کہ ان کی جو حالت ہو رہی ہے وہ محض چوٹوں کی وجہ سے نہیں تھی، انہیں ساتھ ہی ساتھ کوئی اور تکلیف بھی ہو رہی تھی، جو وہ بتا نہیں پا رہے تھے، اس نے اپنا پورا زور لگا کر بابا سائیں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا اور جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر لے آیا، کرم دین نے پانی کا گلاس بابا سائیں کی طرف بڑھاتے ہوئے پینے کو کہا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پانی پلانے سے منع کر دیا۔

بابا سائیں کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں اور وہ سانس لینے میں بہت تکلیف محسوس کر رہے تھے، کرم دین نے کچھ سوچے سمجھے بغیر انہیں اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور جلدی سے باہر کی طرف چل پڑا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک ٹیکسی والے کو رکنے کا اشارہ کر دیا تھا، کرم دین نے بابا سائیں کو بازوؤں پہ اٹھا رکھا تھا، ٹیکسی والا گاڑی روک کر باہر نکل آیا اور جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا، کرم دین نے ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے بابا سائیں کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا، پھر خود بھی بیٹھ گیا اور بابا سائیں کا سر اپنی ٹانگوں پر رکھ لیا۔

کرم دین کے کہنے پر ٹیکسی والے نے انہیں قریبی ہسپتال پہنچا دیا تھا اور گاڑی ایمرجنسی کے سامنے لا کھڑی کی تھی، بابا سائیں کو سٹریچر پر لٹا کر فوری طور پر ایمرجنسی میں پہنچا دیا گیا تھا، ان کی حالت دیکھتے ہی وارڈ میں موجود ڈاکٹر انہی کی طرف دوڑ پڑے تھے، فوری طور پر بابا سائیں کو آکسیجن لگا دی گئی تھی تاکہ انہیں سانس لینے میں آسانی ہو سکے۔

ڈاکٹر، بابا سائیں کا مکمل معائنہ کر رہے تھے اس لیے کرم دین کو تسلی تھی مگر اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھا، ڈاکٹروں نے کرم دین کو بابا سائیں کے پاس ٹھہرنے نہیں دیا تھا لیکن اس کی نظریں مسلسل انہی پر ہی لگی ہوئی تھیں، وہ جب سے بابا سائیں کو اسپتال لایا تھا، تب سے ایک پل کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد بابا سائیں کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی اس لیے انہیں ایمرجنسی سے آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا، کرم دین سائے کی طرح بابا سائیں کے ساتھ ساتھ تھا، وارڈ میں آ کر دوائیوں کے اثر سے بابا سائیں کی آنکھ لگ گئی تھی، وہ سو رہے تھے، کرم دین پاس ہی بنچ پر بیٹھا تھا، اس کی نگاہیں مسلسل بابا سائیں کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، گو کہ اب ان کے چہرے سے کسی قسم کی تکلیف کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر اس کے باوجود کرم دین بے سکونی کی سی حالت میں تھا، آخر کار اس سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر وارڈ میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے......؟" ڈاکٹر نے پاس کھڑے کرم دین کو دیکھ کر سوال کیا۔

"وہ...... ڈاکٹر صاحب...... بابا سائیں ٹھیک تو ہیں...... وہ باتیں کیوں نہیں کر رہے......؟"

"ابھی وہ سو رہے ہیں، جب اٹھیں گے تو باتیں بھی کر لیں گے۔" ڈاکٹر نے کرم دین کی طرف دیکھے بغیر کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے جواب دیا۔

ڈاکٹر کے جواب سے کرم دین کی پوری طرح تسلی نہیں ہوئی تھی، اس لیے بولا "لیکن وہ کب تک سوئے رہیں گے؟"

"تم فکر کیوں کرتے ہو...... وہ جتنا سوئیں گے ان کے لیے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"فکر کی تو بات نہیں ہے ناں ڈاکٹر صاحب۔"

"شکر کرو وہ بچ گئے ہیں...... جانتے ہو انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔"

"ہارٹ اٹیک ہوا تھا بابا سائیں کو......؟" کرم دین نے لاعلمی میں دریافت کیا۔

"تمہارے کیا لگتے ہیں وہ؟"

ڈاکٹر کے اس سوال پر کرم دین پریشان ہو گیا تھا، فوری طور پر اسے اپنے اور بابا سائیں کے رشتے کی سمجھ نہ آئی پھر بولا "وہ...... وہ...... وہ جی میرے بہت کچھ ہیں۔"

"اچھا چلو تم اپنی جگہ بیٹھو، فکر کی کوئی بات نہیں بس تھوڑی دیر میں خود ہی اٹھ جائیں گے تم انہیں نہ اٹھانا"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔" کرم دین نے ڈاکٹر کو مختصر سا جواب دیا اور واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا، اور بیٹھتے ہی پھر سے بابا سائیں کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ لی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد بابا سائیں نے آنکھیں کھول دیں، ان کی آنکھیں کھلتے ہی کرم دین ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بسم اللہ...... بسم اللہ...... شکر ہے...... شکر ہے میرے بابا سائیں نے آنکھیں کھولیں...... اب کیسی طبیعت ہے سرکار......؟"

"میں ٹھیک ہوں کرم دین! مگر آج تم وقت پر نہ آتے تو پھر نہ جانے کیا ہو جاتا......"

"لیکن سرکار وہ کون لوگ تھے جو اس قدر بے دردی سے وحشیوں کی طرح آپ کو مار رہے تھے؟"

ایک لمحے کے لیے کرم دین کے سوال نے بابا سائیں کو پریشان کر دیا تھا، پھر وہ سوچنے لگے کہ کرم دین کو تمام تفصیل سے آگاہ کرنا مناسب نہیں، اس لیے بات گول مول کرنے کے لیے بولے "میں تو انہیں جانتا نہیں...... بس وہ لوگ اچانک دفتر میں گھس آئے، میرے پاس جو رقم تھی ان کے کہنے پر وہ بھی میں نے انہیں دے دی تھی مگر اس کے باوجود وہ مجھ پر حملہ آور ہو گئے کہ ابھی اور بھی بہت کچھ ہے مگر میں انہیں دے نہیں رہا۔"

"سرکار ایک بار مجھے ان کے بارے میں پتا چل جائے، پھر دیکھیں میں ان کا کیا حشر کرتا ہوں" کرم دین نے بابا سائیں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے جذباتی ہو کر کہا۔

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا...... اب تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔"

"پریشانی کی بات تو ہے سرکار...... کوئی میرے ہوتے ہوئے آپ پر ہاتھ اٹھاتا تو ایک طرف میلی آنکھ

سے بھی دیکھ جائے تو پھر لعنت ہے میری زندگی پر۔"
کرم دین جذباتی ہو رہا تھا، بابا سائیں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور تسلی دیتے ہوئے بولے "بس کرم دین اس بات کو یہیں ختم کر دو اور ڈاکٹر سے پوچھو کہ ہمیں یہاں سے کب فارغ کر دیں گے۔"
کرم دین کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر بابا سائیں کے کہنے پر خاموش ہو گیا اور "اچھا سرکار میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں" کہتا ہوا ڈاکٹر کی طرف چل پڑا۔
"ڈاکٹر صاحب!......"
"ہوں...... کیا مسئلہ ہے......؟" ڈاکٹر نے اپنے پاس کھڑے کرم دین کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"ڈاکٹر صاحب!...... بابا سائیں کہہ رہے ہیں کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ انہیں چھٹی دے دیں۔"
"ابھی ایک دو دن انہیں یہیں رہنا پڑے گا"
"مگر اب تو وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"
"ڈاکٹر تم ہو یا میں؟"
"ڈاکٹر تو آپ ہی ہیں...... مگر...... وہ......" اس سے آگے کرم دین کچھ اور نہ بول سکا کیونکہ اس کے بولنے پر ڈاکٹر صاحب اسے غصے سے دیکھنے لگے تھے، اس لیے خاموشی سے واپس بابا سائیں کے پاس آ گیا۔
"کیا کہہ رہا ہے ڈاکٹر......؟" بابا سائیں نے کرم دین کو قریب پا کر دریافت کیا۔
"وہ کہہ رہے ہیں ایک دو روز بعد چھٹی ملے گی۔"
"تم نے ان سے کہنا تھا کہ اب مریض بالکل ٹھیک ہے۔"
"میں نے کہا تھا سرکار...... مگر ڈاکٹر صاحب ناراض ہونے لگے، اس لیے واپس آ گیا"
"کرم دین آج اشرف بھی نہیں آیا...... دفتر یونہی کھلا پڑا ہوگا...... کہیں کوئی اور نقصان نہ ہو جائے...... ویسے بھی اب میں ٹھیک ہوں...... تم ڈاکٹر کو بلاؤ، میں خود بات کرتا ہوں۔"
کرم دین ڈاکٹر کے پاس جانے سے گھبرا رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اگر اب اس نے ڈاکٹر سے چھٹی کی بات کی تو اسے ڈانٹ پڑ جائے گی، مگر وہ بابا سائیں کے حکم کو بھی نہیں ٹال سکتا تھا، اس لیے ہمت کر کے ایک بار پھر ڈاکٹر کے پاس جا کھڑا ہوا تھا مگر اسے بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا، اس لیے خاموش تھا۔
ڈاکٹر نے اسے کھڑے دیکھا تو خود ہی بول پڑے "اب کیا بات ہے۔"
"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب...... وہ...... وہ...... بابا سائیں بلا رہے تھے آپ کو۔"
"اچھا تم چلو میں آتا ہوں۔"
اس ڈر سے کہ کہیں ڈاکٹر صاحب اسے ڈانٹنے نہ لگیں، کرم دین جلدی سے وہاں سے چل پڑا اور واپس بابا سائیں کے پاس آ کھڑا ہوا۔
"اب کیا کہہ رہا ہے ڈاکٹر؟" کرم دین کے واپس آنے پر بابا سائیں نے سوال کیا۔
"ڈاکٹر صاحب ابھی آ جاتے ہیں سرکار۔"
کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر بابا سائیں کے پاس آ گیا اور آتے ہی ان کی فائل دیکھنے لگا۔
"ڈاکٹر صاحب مجھے چھٹی دے دیں۔" بابا سائیں نے ڈاکٹر سے کہا۔
"ابھی آپ کو ایک دو روز اور یہیں رہنا پڑے گا۔"
"نہیں ڈاکٹر صاحب مجھے جانا ہے۔"
"ٹھیک ہے...... اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو لکھ کر دے دیں، تا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہہ سکوں کہ آپ اپنی مرضی سے گئے ہیں۔"
"میں لکھ دیتا ہوں ڈاکٹر صاحب! بس آپ چھٹی دے دیں۔" بابا سائیں بضد تھے کہ انہیں ہسپتال

سے فارغ کر دیا جائے، اس لیے ڈاکٹر خاموشی سے وہاں سے نکل کر اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور کچھ ہی دیر بعد بابا سائیں کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں ہسپتال سے واپس اپنے کمرے میں کرسی پر آ بیٹھے تھے، جھگڑے کے دوران کمرے کی جو چیزیں الٹ پلٹ گئی تھیں وہ ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں، کرم دین بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا، وہ زمین پر گری ہوئی مختلف اشیاء اٹھا کر میز پر رکھ رہا تھا کہ اسی دوران اس کی نظر اس کتاب پر پڑی جو کافی پرانی لگ رہی تھی، اس کی جلد پر کتاب کا نام بھی تحریر تھا، کتاب دیکھتے ہی کرم دین کے دل میں خیال آیا کہ یقیناً یہ کتاب بہت قیمتی اور فائدہ مند ہوگی، اس نے جان بوجھ کر کتاب وہیں پڑی رہنے دی اور دیگر اشیاء اٹھاتا رہا، کرم دین وہ کتاب وہاں سے چرا لینا چاہتا تھا مگر بابا سائیں کی نظریں مسلسل اسی پر تھیں، اس لیے وہ ایسا نہیں کر پا رہا تھا۔
کرم دین کا دماغ اس کتاب کے متعلق تیزی سے کام کر رہا تھا مگر اسے کامیابی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے، اچانک بابا سائیں اپنی سیٹ سے اٹھے اور اس کی طرف بڑھنے لگے، کرم دین کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا، بابا سائیں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ یہی سمجھا کہ انہیں شک ہو گیا ہے اور وہ کتاب اٹھانے خود اپنی سیٹ سے اٹھے ہیں، بابا سائیں کے قدم جیسے جیسے اس کی طرف بڑھ رہے تھے اس کے دل کی رفتار میں اسی قدر تیزی آتی جا رہی تھی لیکن جیسا کرم دین سوچ رہا تھا ویسا نہیں تھا، دراصل بابا سائیں باتھ روم میں جانے کے لیے اٹھے تھے، وہ جیسے ہی اس کے پاس سے گزر کر باتھ روم کی طرف بڑھے کرم دین کی جان میں جان آ گئی۔
اب کرم دین کی نظریں بابا سائیں کا پیچھا کر رہی تھیں، جونہی انہوں نے باتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا، وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور کتاب باہر صوفے کے پیچھے چھپا کر جلدی سے واپس کمرے میں آ گیا، وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ اس نے کتاب کو ٹھکانے لگا دیا تھا، اب وہ جاتے ہوئے وہاں سے باآسانی کتاب اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے اس بات کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں بابا سائیں اس کتاب کے متعلق پوچھ نہ لیں، بابا سائیں کے باتھ روم سے واپس آنے تک کرم دین اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔
"آج جو احسان تم نے مجھ پر کیا ہے میں وہ زندگی بھر بھلا نہیں پاؤں گا" بابا سائیں نے باتھ روم سے واپس آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"آپ احسان کی بات کرتے ہیں بابا سائیں! مجھے تو اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں ان لوگوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا، جنہوں نے آپ کو اس قدر اذیت پہنچائی۔"
"اچھا کرم دین! اب اس بات کو یہیں چھوڑ دو اور بھول جاؤ کہ کبھی کچھ ہوا تھا بلکہ اس بات کا ذکر کبھی اشرف سے بھی نہ کرنا۔"
"جیسا آپ کہتے ہیں بابا سائیں ویسا ہی ہوگا۔" کرم دین یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا اور باہر سے مٹھائی کا ڈبہ اٹھا لایا جو وہ خاص طور پر بابا سائیں کے لیے لے کر آیا تھا "یہ آپ کے لیے ہے بابا سائیں" کرم دین نے مٹھائی کا ڈبہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا ہے کرم دین......؟"
"باداموں والی برفی ہے سرکار، یہ میں نے خاص طور پر آپ کے لیے تیار کروائی تھی اور ہاں سرکار باہر ایک بکرا بھی بندھا ہے"

”یہ سب کیوں لائے ہو کرم دین؟“

”یہ تو کچھ بھی نہیں سرکار اگر میرے پاس کچھ اور ہوتا تو وہ بھی لا کر آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا“

”بہت کچھ ملے گا تمہیں کرم دین! اتنا کچھ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”مگر کب ملے گا سرکار؟“ کرم دین نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

”کرم دین سچ پوچھو تو اب تک میں تمہیں اور لوگوں کی طرح ٹرخاتا ہی آیا ہوں، کیونکہ تمہاری طرح کے بہت سے جنونی میرے پاس آتے ہیں، مگر میں انہیں اسی طرح ٹال دیتا ہوں لیکن آج تم نے مجھ پر جو احسان کر دیا ہے۔ اب میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ میں بھی تمہارے لیے کچھ کروں۔“

”میں نے تو سرکار آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا لیکن اگر آپ کچھ مہربانی فرما دیں گے تو یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا“

”ٹھیک ہے کرم دین میں تمہیں کچھ عملیات سکھا دیتا ہوں، لیکن یہ یاد رکھنا...... تمہیں ملے گا تو بہت کچھ مگر اس میں تمہیں کچھ مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں۔“

”مجھے دولت چاہیے سرکار! صرف دولت...... اور دولت کے لیے میں سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔“

”میرے پاس بہت سے علم ہیں...... رشتوں کی بندش، شادی میں رکاوٹ، لڑکیوں کی شادیوں کے حل، اولاد کا نہ ہونا یا ہو کر مر جانا، اولاد کی نافرمانی، گھریلو جھگڑے، جادو ٹونہ، دشمن کو زیر کرنا، امتحان میں کامیابی، انعامی چانس، شوہر کو راہ راست پر لانا، جادو کا کاٹ کالے علم سے کس طرح کیا جاتا ہے، اور اس کے علاوہ جنتو کا علم، منتو کا علم، سفلی کا علم، گدیلوں کا علم، شانتی دیوی کا علم، لکشمی دیوی کا علم، کالی دیوی کا علم، پرتل دیوی کا علم، کالی ماتا کا علم، ہنومان کا علم، بھوت پریت کا علم، پریوں کا علم، جنات کا علم......“ بابا سائیں یہ کہتے ہوئے سانس لینے کے لیے رکے اور پھر بولے ”اور بھی بہت سے علم ہیں جو میں جانتا ہوں تم بتاؤ کون سا علم سیکھنا چاہتے ہو؟“

”سارے ہی سکھا دیں سرکار......“ کرم دین نے کسی بچے کی طرح اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”یہ سارے تو ممکن نہیں ہاں ان میں سے کچھ ایسے علم بتا دیتا ہوں جو تمہارے کام آئیں گے اور آگے چل کر تمہیں ان سے فائدہ بھی ہوگا۔“

”سرکار جب مہربانی کرنے ہی لگے ہیں تو دل کھول کر کریں پتا تو چلے کہ بابا سائیں کسی پر مہربان ہوئے تھے۔“

کرم دین کی بات سن کر بابا سائیں دیر تک کچھ سوچتے رہے، پھر اندر ہی اندر کچھ بڑبڑاتے رہے، بعد میں خلا میں گھورتے ہوئے کسی سے باتیں کرنے لگے، پھر کرم دین کو اپنے پاس بٹھا لیا اور کاغذ قلم نکال کر کچھ لکھنے لگے، بابا سائیں ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر ایک طرف رکھ دیتے پھر دوسرے کاغذ پر لکھنے لگتے، اسی طرح انہوں نے کئی کاغذات پر کچھ لکھا اور پھر انہیں تہہ کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ بابا سائیں کچھ لکھنے میں مصروف تھے اور کرم دین ان کا بغور جائزہ لے رہا تھا، کچھ دیر اسی کیفیت میں گزر گئی پھر بابا سائیں نے کرم دین کو تمام کاغذات کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور تمام عملیات سمجھانے کے بعد ضروری ہدایات دے کر اسے رخصت کر دیا۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں نے کرم دین کو جو عملیات بتائے تھے، اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ تمام عملیات ایک ساتھ کر ڈالے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اپنی تمام تر خواہشات

پوری کر لے، لیکن بابا سائیں نے اس بات کی سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ ایک کے بعد دوسرا عمل کرے، اگر بابا سائیں نے نصیحت نہ کی ہوتی تو شاید وہ ویسا ہی کرتا، جیسا اس کا دل چاہ رہا تھا۔

گھر پہنچ کر جب کرم دین نے بابا سائیں کے ساتھ ہونے والی تمام تر گفتگو اور ان کے بتائے ہوئے عملیات کے بارے میں عائشہ سے ذکر کیا تو وہ اپنی عادت کے مطابق کرم دین کو سمجھانے لگی، مگر کرم دین نے جس طرح کی مشکلات برداشت کرنے اور صبر آزما گھڑیوں کے بعد کسی طرح بابا سائیں سے عملیات حاصل کیے تھے وہ کس طرح عائشہ کی بات مان سکتا تھا، اس نے عائشہ کی ایک نہ سنی اور اسے بری طرح جھڑک دیا۔

عملیات کی جو کتاب بابا سائیں کے ہاں سے کرم دین کے ہاتھ لگی تھی، وہ اس نے آتے ہی چھپا کر رکھ دی تھی، وہ کتاب اس کے لیے ایسا خزانہ تھی کہ جس کسی کی بھی نظر اس پر پڑ جاتی، وہ اسے چرا کر لے جاتا، ایک دو روز تک کرم دین نے جہاں کتاب رکھی تھی وہیں پڑی رہنے دی، وہ جلد از جلد اس کتاب کو پڑھ کر اس کے متعلق سب کچھ جان لینا چاہتا تھا لیکن اس کے دل میں کھٹکا سا تھا۔

رات کا وقت تھا عائشہ اور بچے سکون سے سو رہے تھے، وہ خاموشی سے اٹھا اور زیرو کے بلب کی روشنی میں ہی کسی قسم کا شور کیے بغیر کمرے سے نکل گیا، پھر اس نے چپکے سے کتاب اٹھائی اور دوسرے کمرے میں جا کر اسے اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا، کتاب کی شکل میں اس کی منزل اس کے سامنے تھی اور وہ اسے بغور دیکھے جا رہا تھا، گو کہ بابا سائیں نے بھی کچھ انتہائی اہم عملیات کرم دین کو بتائے تھے مگر کتاب کی موجودگی میں اب وہ اسے معمولی اور غیر اہم لگنے لگے تھے۔

کتاب کافی موٹی تھی، لیکن وہ ایک ہی رات میں ساری کی ساری پڑھ لینا چاہتا تھا، اس نے ابھی چند اوراق ہی پڑھے تھے کہ اس کے پورے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور وہ کانپنے لگا، ایسی حالت میں وہ کسی بھی طرح کتاب نہیں پڑھ سکتا تھا، اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو مضبوط کرنے لگا، اس عمل نے اسے کافی تقویت بخشی تھی، اس لیے وہ چند منٹ تک یہی عمل دہراتا رہا، تھوڑی ہی دیر بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ اب وہ بلا خوف سکون سے بیٹھ کر کتاب پڑھ سکتا ہے، اس نے دیوار سے ٹیک لگا لی اور کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا، کتاب طرح طرح کے عملیات سے بھری پڑی تھی، اس کی نظریں ایسے عملیات کی تلاش میں تھیں جن کے ذریعے وہ اپنے ان مقاصد میں باآسانی کامیاب ہو جاتا، جن کے بارے میں اس نے سوچ رکھا تھا۔

رات گزرتی جا رہی تھی، اس نے اپنے مطلب کے کئی صفحات ایک کونے سے موڑ دیے تھے، وہ صبح ہونے سے پہلے اس کام سے فارغ ہو جانا چاہتا تھا، اس لیے وہ مزید تیزی سے اوراق پلٹنے اور مطلوبہ صفحات پر نشانی لگانے لگا، اس نے ابتدائی طور پر بہت سے عملیات پر نشان لگا لیے تھے، بعد میں وہ سکون سے بیٹھ کر ان میں سے چند ایسے عملیات منتخب کرنا چاہتا تھا، جو اس کے کام کے تھے، ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے کرنے سے اسے بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا، مگر وہ ہر طرح کے خطرات سے کھیلنے کے لیے تیار تھا۔

کرم دین کتاب میں اس قدر کھویا رہا کہ اسے رات گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا، جب مختلف

مساجد سے فجر کی اذان کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں تو اس نے جہاں سے کتاب اٹھائی تھی وہیں چھپادی اور خود چپکے سے واپس اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گیا۔ رات بیت گئی تھی، اس کی بیوی اور بچے ابھی تک سکون سے سو رہے تھے جبکہ کرم دین نے ایک پل کے لیے بھی آنکھ بند نہیں کی تھی، اب وہ کچھ دیر کے لیے سو جانا چاہتا تھا، اس نے لیٹتے ہی آنکھیں بند کرلیں، مگر اس کا ذہن کتاب میں الجھ کر رہ گیا، کتاب کے متعلق سوچنے کے عمل میں وہ اس قدر الجھا کہ پھر سو نہ سکا اور کچھ دیر بعد جب عائشہ اور بچے اٹھے تو اس نے بھی چارپائی چھوڑ دی۔

رات بھر جاگتے رہنے سے کرم دین سستی کا شکار تھا، اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اور وہ ادھر ادھر لڑھکتا پھر رہا تھا، وہ اس کیفیت سے نکلنے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا، تاکہ نہا کر فریش ہو سکے، کرم دین کی عادت تھی کہ وہ نہانے میں زیادہ وقت نہیں لگاتا تھا مگر اس روز وہ دیر تک سر پہ پانی ڈالتا رہا، نہانے کے بعد کرم دین نے ناشتہ کیا، پیٹ بھرتے ہی نیند اس پر غالب آگئی اور وہ چارپائی پر لیٹ گیا، پھر کچھ دیر بعد ہی اس کے خراٹوں سے کمرہ گونجنے لگا۔

☆☆☆☆☆

کمرے میں بلب روشن تھا اور باہر گھپ اندھیرا تھا، آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی، لوگ گہری نیند میں تھے اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، کرم دین کی بیوی اور بچے کمرے میں سوئے ہوئے تھے اور وہ الگ کمرے میں تنہا بیٹھا عملیات کی کتاب میں الجھا ہوا تھا، اچانک کوئی سایہ اس کے سامنے سے گزرتا ہوا دکھائی دیا، کمرے میں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا، اس لیے وہ حیران تھا کہ وہ سایہ کس کا تھا، اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا، اس نے سائے کو اپنا وہم سمجھا اور پھر سے کتاب پر نظریں جمادیں۔

چند لمحوں بعد کرم دین کو پھر سے کمرے میں کچھ سائے محسوس ہوئے جو آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے، کرم دین نے ایک جھٹکے کے ساتھ گردن اوپر اٹھائی تو یہ دیکھ کر اس کے جسم میں کپکپی طاری ہوگئی کہ کچھ عجیب سی شکلوں والے لوگ اس کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ ڈر کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر انہوں نے بجلی کی تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ ان میں سے کسی نے اسے گردن، کسی نے بالوں اور کسی نے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا، قریب تھا کہ وہ چیر پھاڑ کر اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے، اس نے اپنے جسم کی پوری طاقت کا استعمال کرتے ہوئے خود کو ان سے چھڑانے کی کوشش کی تھی، اس کوشش میں کتاب اس کے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر گر پڑی۔

کتاب کے گرتے ہی وہ لوگ اسے چھوڑ کر کتاب پر جھپٹ پڑے، اب کرم دین آزاد تھا اور چاہتا تو جان بچا کر وہاں سے بھاگ سکتا تھا، مگر اب اس کی جان سے بھی قیمتی چیز عجیب مخلوق کے رحم و کرم پر تھی، وہ جس طرح چھینا جھپٹی کر رہے تھے اس سے کتاب پھٹ بھی سکتی تھی یا پھر ان میں سے کوئی ایک، کتاب چھین کر لے جا بھی سکتا تھا، جو اسے کسی بھی صورت میں قبول نہیں تھا، اس نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر ان کے اوپر ہی چھلانگ لگادی، کرم دین کی یہ حرکت انہیں انتہائی ناگوار گزری تھی اس لیے ان میں سے ایک نے ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے اسے دور اچھال دیا تھا، وہ ایک بار پھر ہمت کر کے اٹھا اور پوری طاقت کے ساتھ ان کی طرف دوڑا، مگر اس کے ان تک پہنچنے سے پہلے ہی کتاب کے کئی ٹکڑے ہو کر

مختلف ہاتھوں میں تقسیم ہو چکے تھے، کتاب کی یہ حالت دیکھ کر کرم دین رونے لگا تھا مگر اسی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے خود کو چارپائی پر لیٹا ہوا پایا۔

یہ جان کر کہ اس نے ابھی جو کچھ دیکھا وہ سب ایک خواب تھا، کرم دین کی جان میں جان آگئی تھی، مگر اسے پھر بھی تسلی نہ ہوئی، اس نے جلدی سے چارپائی چھوڑ دی اور فوراً اس جگہ پہنچا جہاں اس نے کتاب چھپا رکھی تھی، کتاب کو اپنی جگہ پا کر اسے اطمینان نصیب ہوا تھا مگر وہ وہاں سے واپس آنے کی بجائے اسی کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا، تھوڑی ہی دیر بعد اس نے اس بات کا فیصلہ کرلیا تھا کہ اس سے پہلے کہ کوئی حقیقت میں وہ نایاب کتاب اس سے چھین کر لے جائے، اسے بلاتاخیر عملیات کا آغاز کر دینا چاہیے۔

وہ پلک جھپکنے سے پہلے کتاب میں دیے ہوئے عملیات مکمل کرلینا چاہتا تھا مگر کسی انجانے خوف نے اسے گھیر رکھا تھا، جس کی وجہ سے وہ انتہائی پریشان تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ عملیات کیے جائیں جن کے لیے بابا سائیں نے اجازت دی تھی۔

کرم دین نے عائشہ سے کہہ کر وہ کمرہ خالی کروا لیا جو گھر کے ایک کونے میں واقع تھا، جب صفائی ہو گئی تو کرم دین نے فرش پر چٹائی بچھا کر اس پر سفید چادر بچھادی اور کمرے میں جگہ جگہ اگربتیاں جلادیں، اس طرح اس نے سورج غروب ہونے سے قبل ہی اپنی تمام تیاری مکمل کر لی تھی، عائشہ تمام باتوں سے آگاہ تھی جبکہ کرم دین کے بچے حیران تھے کہ آج ان کے گھر میں یہ سب کیا ہو رہا تھا، شام ہوتے ہی کرم دین نے عائشہ کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور کمرے میں جا گھسا۔

چلہ کاٹنے کے لیے کرم دین نے گھر کے کونے میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے کا انتخاب کیا تھا، اس نے جس عمل سے ابتدا کی تھی اس کا دورانیہ کم سے کم سات دن تھا اور اس میں کسی قسم کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا، چند آیات کی تسبیح کرتے ہوئے مقررہ تعداد پوری کرنا تھی، جس چلے کو پورا کرنے کے لیے چھ سات دن درکار تھے، اسے مکمل کرنے کے لیے کرم دین نے دن رات ایک کر دیا اور صرف تین دن میں تسبیحوں کی مقررہ تعداد پوری کرلی۔

اب کرم دین کے شب و روز اسی کوٹھری نما کمرے میں گزرنے لگے تھے، عائشہ کرم دین کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق تینوں وقت کا کھانا کمرے کے دروازے پر رکھ آتی اور دروازے پر ہلکی سی دستک کر دیتی تاکہ کرم دین کو معلوم ہو جائے کہ وہاں کھانا رکھ دیا گیا ہے، اس نے کرم دین کو کبھی کھانا اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ جب بھی کھانا رکھنے جاتی وہاں پہلے والے خالی برتن کمرے سے باہر پڑے ہوتے، وہ انہیں اٹھالاتی اور کھانا وہاں رکھ آتی۔

جب سے کرم دین نے خود کو کمرے میں قید کیا تھا، عائشہ نے اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کب کمرے سے نکل کر باہر آتا تھا اور کب حاجات سے فارغ ہونے کے بعد وضو کر کے کمرے میں جا گھستا تھا۔ شام ہوتے ہی عائشہ تمام کام نمٹا کر اپنے کمرے میں جا لیٹتی تھی، وہ دونوں چھوٹے بچوں کو سینے سے چمٹا کر لیٹ جاتی اور دونوں بڑے بچوں کو پاس ہی دوسری چارپائی پر لٹا کر احتیاط سے کنڈی لگالیتی، جب تک اس کی آنکھ نہ لگ جاتی، اسے ڈر محسوس ہوتا رہتا، پھر وہ خود کو تسلی دے لیتی کہ اس کا شوہر اسی گھر میں موجود ہے، فکر کی کیا ضرورت ہے، یہ سوچ کر اسے کچھ حوصلہ مل جاتا اور سکون سے سو جاتی۔

وہ روز کی طرح بچوں کو ساتھ چمٹائے سو رہی تھی

کہ کمرے کے دروازے کی کنڈی کھٹکنے لگی، دروازہ کھٹکنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، وہ اس خیال سے خاموشی سے لیٹی رہی کہ شاید یہ اس کا وہم ہو، مگر یہ وہم نہیں تھا، کنڈی کھٹکنے کی آواز پھر سے اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی، وہ یہ سوچ کر کہ یہ کرم دین ہی ہوگا، آواز دینے سے کہیں بچوں کی آنکھ نہ کھل جائے، آہستہ سے چارپائی سے اٹھی اور کنڈی کھول دی۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے بدن کو چھوتا ہوا گزر گیا، دروازے پر کوئی بھی موجود نہ تھا، اس نے اپنی تسلی کے لیے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر اسے کہیں کوئی دکھائی نہ دیا، اس لیے اس نے اپنا وہم جان کر کنڈی بند کردی، مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے دروازہ بند کرتے ہوئے کوئی ہیولا سا کمرے میں داخل ہوا تھا، اسے ہیولا بھی ایک وہم لگا تھا مگر اس نے کمرے کا بلب جلا کر اپنی تسلی کرلی اور پھر خاموشی سے اپنی چارپائی پر لیٹ گئی، کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا مگر پھر بھی اسے ڈر محسوس ہونے لگا تھا، اس لیے اس نے اپنے دونوں بچوں کو کھینچ کر زور سے اپنے سینے سے لگالیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆☆☆

پچھلی رات کی طرح آج بھی وہ ڈر کر اٹھ بیٹھی تھی، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا، اس لیے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی، گو کہ کمرے میں کوئی غیر معمولی چیز دیکھنے میں نہیں آرہی تھی مگر اس کے باوجود اس کا خوف بڑھتا جارہا تھا، بچے سو رہے تھے لائٹ جلانے سے ان کی آنکھ کھل سکتی تھی لیکن لائٹ جلائے بغیر تسلی بھی نہیں ہوسکتی تھی، وہ خوف کی وجہ سے بری طرح کانپ رہی تھی، مگر اس کے باوجود اس نے ہمت کی اور ڈرتے ڈرتے کمرے کا بلب جلا دیا، اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی بلب روشن ہوگا کوئی اسے دبوچ لے گا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا، کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی، دروازے کی کنڈی لگی ہوئی تھی اور کسی بھی جگہ سے ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ کوئی کمرے سے باہر گیا ہو یا کمرے میں آیا ہو۔

ایک رات قبل بھی وہ اسی کیفیت سے گزری تھی اور آج پھر وہ ڈر رہی تھی، کرم دین کمرے میں لیٹا ہوتا تھا تو اس قسم کا کوئی بھی ڈر یا خوف اس پر کبھی طاری نہیں ہوا تھا اور وہ ہمیشہ بے خوف ہو کر سوئی تھی۔ اب کرم دین نہ جانے کن راستوں پر چل نکلا تھا کہ اس کی ہر رات پریشانی میں گزر رہی تھی، اس نے اچھی طرح تسلی کرلی اور واپس اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گئی، بلب جلنے سے بھی بچوں نے کروٹ بدلی تھی مگر پھر سکون سے سو گئے تھے، کمرے میں روشنی ہونے کے باوجود بچے سکون سے سوئے ہوئے تھے اس لیے اس نے بلب جلتا رہنے دیا تھا، وہ کچھ دیر تک مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی جس کی وجہ سے اسے کافی حد تک سکون محسوس ہونے لگا، پھر کچھ ہی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

کرم دین کے گھر سے نہ نکلنے کی وجہ سے محلے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگی تھیں، جہاں محلے کے چند افراد اکٹھے ہوتے وہیں اس کے متعلق بات ہونے لگتی، کرم دین کے بارے میں ایسی ایسی کہانیاں جنم لینے لگی تھیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، عائشہ یوں بھی خاموش طبیعت کی مالک تھی، نہ اس نے کسی سے کوئی بات کی تھی اور نہ ہی کسی نے اس سے کرم دین کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

''کرم دین کہیں گیا ہوا ہے کیا؟'' چاچی خیری نے

عائشہ سے رازداری کے ساتھ دریافت کیا۔

''اس نے کہاں جانا ہے چاچی...... یہیں ہے وہ......'' عائشہ نے مختصر سا جواب دیا۔

عائشہ کے جواب سے چاچی کی تسلی نہیں ہوئی تھی، اس لیے تفصیل جاننے کے لیے اس نے ایک اور سوال کر ڈالا...... ''مگر ہے کہاں؟ باہر کہیں نظر تو نہیں آیا۔''

''کہیں نہیں گیا چاچی گھر میں ہی ہے۔''

''لیکن اتنے دنوں سے گھر میں پڑا کیا کر رہا ہے وہ؟'' چاچی نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''چاچی تم تو جانتی ہی ہو...... میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا وہ ہے تو گھر میں ہی، مگر اس نے کسی کو بتانے سے منع کیا ہوا ہے...... اصل میں پچھلے کچھ دنوں سے وہ کمرے میں بیٹھا کچھ چلے کر رہا ہے۔'' عائشہ نے چاچی کے سوال کی اچھی طرح وضاحت کی۔

''مگر یہ اور کتنے دن تک یوں کمرے میں گھسا بیٹھا رہے گا؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی کرم دین کی عادت سے تو تم اچھی طرح واقف ہو، وہ اپنے کاموں میں کسی اور کی مداخلت کہاں برداشت کرتا ہے۔''

''ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو......'' یہ کہتے ہوئے چاچی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر آہستہ سے بولی۔ ''مجھے کرم دین کی فکر ہو رہی تھی، اس لیے چلی آئی، ورنہ تم جانتی ہی ہو، میں کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتی۔''

چاچی نے بات کرتے ہوئے برقعہ سنبھالا اور برقعے کو جھاڑ کر پہنتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں چاچی نے بہت سی معلومات اکٹھی کرلی تھیں، اس لیے اب وہ ان معلومات کو مرچ مسالا لگا کر محلے کے ہر گھر میں پہنچا دینا چاہتی تھی، عائشہ کے گھر سے نکل کر اس نے اپنے گھر جانے کی بجائے ایسے گھروں کا رخ کیا تھا جہاں بات کرنے کا اس لیے بھی بہت مزا آتا تھا کہ وہ لوگ نہ صرف پوری توجہ سے بات سنتے تھے بلکہ اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافوں کے ساتھ جلد از جلد دوسروں تک پہنچا دیتے تھے۔

بستی والوں کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ کرم دین بستی میں دکھائی کیوں نہیں دیتا تھا مگر اب انہیں اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی فکر لگ گئی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھا کس قسم کے عملیات کر رہا تھا اور وہ جو عملیات کر رہا تھا، اس میں اسے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

کتنے ہی دن گزر گئے تھے عائشہ نے کرم دین کی شکل نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی وہ اس سے کوئی بات ہی کر پائی تھی، اسے دیکھنے اور بات کرنے کو عائشہ کا دل تو بہت چاہ رہا تھا مگر کرم دین نے سختی سے منع کر رکھا تھا اس لیے وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی، وہ شام ہوتے ہی کرم دین کا کھانا اس کے کمرے کے دروازے پر رکھ آتی اور پھر بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی اور بچوں کو لے کر کمرے میں جا لیٹتی۔

وہ روز کی طرح کرم دین کے لیے کھانا رکھتے ہوئے خالی برتن اٹھا کر واپس آنے لگی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ خالی برتنوں کے اوپر ہی کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی رکھا ہوا تھا، اس نے جلدی سے برتن زمین پر رکھ دیے اور کاغذ کے ٹکڑے کو کھول کر دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھنے لگی۔ یہ کرم دین کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی تحریر تھی جس میں اس نے صرف اتنا لکھا تھا

''میں نے اپنا پہلا وظیفہ مکمل کرلیا ہے''۔

عائشہ نے کرم دین کا رقعہ لپیٹ کر ہاتھ میں سنبھال لیا اور برتن اٹھا کر واپس کمرے میں آگئی، وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے کون سا وظیفہ مکمل کیا تھا لیکن وہ اس بات پر ہی خوش تھی کہ کرم دین نے کاغذ

کے ٹکڑے پر لکھے ہوئے چند لفظوں کے ذریعے اس سے بات کی ہے، اس نے لیٹتے ہی اپنے چھوٹے بیٹے کو سینے سے چمٹالیا اور کرم دین کے متعلق سوچتے ہوئے سوگئی۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ جس بچے کو اس نے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا، وہ تڑپنے لگا، عائشہ نے یہ سوچ کر کہ وہ سوتے ہوئے ڈر گیا ہوگا، اسے اچھی طرح اپنے سینے سے لگالیا مگر بچہ اس بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا جسے قربان کیا جارہا ہو، وہ بچے کو سینے سے چمٹائے لیٹی رہی مگر اس کا تڑپنا بند نہیں ہوا تھا۔

جیسے ہی عائشہ کا ہاتھ بچے کی گردن پر لگا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے گرم گرم پانی جیسی کوئی چیز اس کے ہاتھوں سے لگی ہو، ایک لمحے کے لیے اسے کچھ سمجھ نہ لگی، پھر یہ جاننے کے لیے کہ اس کے ہاتھوں سے کیا چیز لگی تھی اس نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلادی، بلب روشن ہوتے ہی جیسے ہی اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی تو ہاتھوں میں لگا خون دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور وہ بچے کی حالت دیکھنے کے لیے تیزی سے اس کی طرف دوڑی، بچے کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی، اس کی گردن سے بہت سا خون نکل کر چارپائی پر بچھی ہوئی چادر کو سرخ کرچکا تھا، اور مزید خون اس کی گردن سے بہہ رہا تھا۔

عائشہ نے بچے کو اپنی بانہوں میں اٹھالیا اور دروازہ کھول کر کرم دین کے کمرے کی طرف دوڑ لگادی، کمرے کا بلب جلنے اور عائشہ کے چیخنے سے وہاں سوئے ہوئے تینوں بچے بھی اٹھ بیٹھے تھے اور انہوں نے بھائی کو اپنی بانہوں میں اٹھائے ماں کو جاتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا، اس لیے وہ بھی ماں کے پیچھے ہی دوڑ پڑے۔

رات کی تاریکی میں اپنے کمرے سے نکل کر گھر کے دوسرے کونے میں جانا عائشہ کے لیے کسی بھی صورت میں ممکن نہیں تھا، لیکن معصوم بیٹے کی محبت نے اس کے دل کے سبھی خوف اور ڈر ختم کرکے رکھ دیے تھے، دوسرے بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑے چلے آرہے تھے، ان کے قدموں کی آواز عائشہ کے کانوں میں پڑرہی تھی، وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ بچے بھی اس کے پیچھے دوڑے چلے آرہے ہیں مگر اس کے باوجود اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ اس کے پیچھے کون ہے۔

ماں کو اپنے بچے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس کی گردن سے مسلسل خون بہہ رہا تھا، بچے کی گردن سے بہنے والے خون نے عائشہ کو تڑپا رکھا تھا، کرم دین کے کمرے کے سامنے پہنچتے ہی عائشہ نے پورے زور سے دروازہ پیٹ ڈالا، اس نے دروازے کو اس قدر زور سے پیٹا تھا کہ اس کی آواز دور دور تک گئی تھی، مگر کمرے کے اندر مکمل خاموشی تھی، عائشہ نے انتظار کیے بغیر پھر سے دروازہ پیٹا لیکن کرم دین کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

وہ دروازے پر مسلسل زور زور سے ہاتھ مار رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی کلائیوں میں پہنی ہوئی چوڑیاں بھی ٹوٹ کر زمین پر بکھر رہی تھیں، کچھ دیر بعد بچے بھی ماں کے ساتھ مل کر دروازہ پیٹنے لگے، کرم دین اس وقت کمرے میں بیٹھا عملیات کررہا تھا، اس لیے وہ جان بوجھ کر خاموش تھا کیونکہ اس کے بولنے سے اس کے عملیات میں خلل پڑسکتا تھا، مگر جب دروازے پر ہونے والی ٹھک ٹھک کا سلسلہ ختم نہ ہوا اور ساتھ ہی عائشہ کے رونے اور اسے کوسنے کی آوازیں بھی شامل ہونے لگیں تو اس نے انتہائی غصے کے عالم میں مجبوراً دروازہ کھول دیا۔

"کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے، جو اس وقت یہاں شور مچا رکھا ہے......؟" دروازہ کھلتے ہی کرم دین برس پڑا۔

"ایک ماں کے لیے تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی ہے۔"

"میں نے تم سے کہا بھی تھا...... خواہ کچھ بھی ہو جائے مجھے مت بلانا۔"

"معاملہ اولاد کا نہ ہوتا تو شاید میں بھی تمہیں کبھی تنگ نہ کرتی۔"

"ایسا کیا ہوگیا ہے؟"

"یہ دیکھو...... اس کی گردن سے خون بہہ رہا ہے جیسے کسی نے اس کی گردن ہی کاٹ دی ہو......" عائشہ نے روتے ہوئے بات کی اور بانہوں میں لیا ہوا بچہ آگے کردیا۔

کرم دین نے ابھی تک کمرے کا بلب نہیں جلایا تھا، صحن میں بھی اندھیرا ہی تھا، یوں وہ سبھی اندھیرے میں کھڑے باتیں کررہے تھے اور ان کو ایک دوسرے کے سائے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

"اسے اندر لے آؤ......" کرم دین نے بلب کا سوئچ دباتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی کمرے میں جلنے والے بلب کی روشنی بچے پر پڑی تو عائشہ کی چیخ نکل گئی...... "میرے بچے کا سر کہاں گیا......؟" عائشہ نے چیختے ہوئے کہا۔

عائشہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بچے کا سر تن سے جدا ہوچکا تھا، اس نے تو محض گردن سے نکلنے والا خون دیکھا تھا اور اسی لمحے وہ اسے بانہوں میں اٹھا کر دوڑ پڑی تھی، اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ بچے کا دھڑ اٹھا لائی تھی یا اگر اٹھاتے وقت سر تن کے ساتھ تھا تو وہ کہیں راستے میں ہی گرا آئی تھی، وہ پریشانی کے عالم میں محض یہ سوچ کر دوڑ پڑی تھی کہ کسی طرح کرم دین سے کہہ کر اس کی پٹی کروائی جاسکے، اسے کیا معلوم

نو پارکنگ

❁ مت جاؤ جہاں برائیاں جنم لیتی ہیں۔
❁ مت ملو ان سے جو صرف مطلب کے وقت ملتے ہیں۔
❁ مت چلو ان لوگوں کے ساتھ جو راستے میں دغا دیتے ہیں۔
❁ مت کھیلو ایسا کھیل جس میں رسوائیاں ہوں۔
❁ مت چنو ایسے پھول جو زندگی کو برباد کرتے ہیں۔
❁ مت سنو ایسی باتیں جو زندگی منتشر کردیں۔

(صبائیہ)

تھا کہ وہ اتنی دیر سے اپنے بچے کی لاش اٹھائے کھڑی تھی۔ اس نے بغیر سر کے بچے کی لاش کو اس قدر زور سے سینے سے چمٹالیا کہ اگر اس کی گرفت ذرا سی بھی کمزور ہوئی تو کہیں کوئی اس سے لاش ہی نہ چھین لے، وہ دھاڑیں مار رہی تھی، اسے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے تھے، اتنے میں کرم دین کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"یہ سب کیا ہے عائشہ؟"

"یہ ہمارے بچے کی لاش ہے کرم دین اور یہ سب تمہارے عملیات کا نتیجہ ہے۔"

"زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں، ورنہ ابھی تھوڑی ہی دیر میں محلے کے لوگ یہاں آجمع ہوں گے میرے ساتھ چلو اور پہلے اس کا کٹا ہوا سر تلاش کرو۔" کرم دین ابھی بات کررہا تھا کہ بجلی چلی گئی "اسے بھی ابھی بند ہونا تھا۔" کرم دین نے غصے سے کہا اور وہاں سے ٹارچ اٹھائی اور اسے جلا کر چلتے ہوئے بولا "آؤ جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔"

ہاتھ میں ٹارچ لیے کرم دین آگے آگے تھا اور بچے کی سرکٹی لاش کندھے سے لگائے عائشہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، دوسرے بچے بھی ڈرے سہمے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے تھے، وہ بھی اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں کچھ دیر پہلے تک وہ سو رہے تھے، ٹارچ کی روشنی میں بچے کی گردن سے نکلنے والی خون کی لکیر صاف دکھائی دے رہی تھی، وہ کمرے کے دروازے پر آپہنچے تھے مگر انہیں کہیں بھی بچے کا کٹا ہوا سر دکھائی نہیں دیا تھا۔

عائشہ اور بچے کرم دین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کمرے کے دروازے تک تو آگئے تھے مگر اب دروازہ کھول کر اندر جانے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی، کرم دین نے ہاتھ کے زور سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیل دیا، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا لیکن جس کونے میں بھی ٹارچ کی روشنی پڑتی وہ جگہ صاف دکھائی دینے لگتی تھی، جیسے ہی ٹارچ کی لائٹ اس چارپائی پر پڑی جہاں عائشہ بچے کے ساتھ لیٹی تھی، بستر کی چادر خون سے سرخ ہو رہی تھی اور وہیں بچے کا کٹا ہوا سر پڑا تھا۔

''اسے کہیں تم نے تو......؟'' کرم دین نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

عائشہ، کرم دین کی ادھوری بات کا مطلب بھی پوری طرح سمجھ گئی تھی، اس لیے فوراً چیخی ''میں تو کیا۔ دنیا کی کوئی بھی ماں اتنی ظالم نہیں ہوسکتی، جو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے پھول جیسے بچے کا سر تن سے جدا کر دے ہو نہ ہو یہ سب تمہارے وظیفوں اور عملیات کی وجہ سے ہوا ہے، کیونکہ ڈر تو ہمیں کچھ روز پہلے سے ہی لگنے لگا تھا''

کرم دین کو پہلے سے ہی بتا دیا گیا تھا کہ جیسے جیسے اس کے عملیات پورے ہوتے جائیں گے، اسے کسی بھی قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لیے اس نے اس بات کو مزید کریدنے کی بجائے بہتر یہی جانا کہ خاموشی اختیار کر لی جائے اور اس سے پہلے کہ محلے دار وہاں آدھمکیں، ہر چیز سے اس بات کے نشان مٹا دیے جائیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ بچے کو کسی وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا، عائشہ سہم کر ایک طرف چارپائی پر بیٹھ گئی تھی، بچے بھی ڈر اور خوف کے مارے اس سے چمٹ گئے تھے، کچھ ہی دیر بعد لائٹ بھی آگئی اور کمرہ روشن ہو گیا۔

روشنی ہوتے ہی کرم دین جلدی سے بستر کی چادر تبدیل کرنے لگا، اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے صحن میں بننے والی خون کی لکیر کو بھی اچھی طرح صاف کر دیا، یوں تھوڑی ہی دیر میں وہ تمام ثبوت مٹا دیے گئے جن سے بچے کے بارے میں کسی قسم کا سوال اٹھ سکتا تھا، بچے کو بے دردی سے قتل کیے جانے پر عائشہ مکمل طور پر وہشت زدہ تھی جبکہ کرم دین پر سکون تھا، کیونکہ وہ بابا سائیں کی بتائی ہوئی باتوں کی وجہ سے مطمئن تھا اور بچے کے قتل کی صورت میں نقصان ہونے کو اپنی کامیابی کی نشانی سمجھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

عائشہ کے حلق سے نکلنے والی چیخیں محلے والوں کے کانوں میں رات کو ہی پڑ گئی تھیں، اس لیے وہ صبح ہوتے ہی ان چیخوں کا سبب جاننے کے لیے کرم دین کے ہاں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ کرم دین کے ہاں آنے والوں میں چاچی خبری سب سے پہلے پہنچی تھی، عائشہ کے چیخنے کی آوازیں رات کو ہی اس کے کانوں میں پڑ گئی تھیں اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی وقت کرم دین کے ہاں جا کر چیخوں کا سبب جان لے، لیکن کچھ رات کی تاریکی اور کچھ بہو کے ڈر نے اسے ایسا کرنے سے روک کے رکھا تھا، مگر جیسے ہی صبح ہوئی اس نے برقعہ اٹھایا اور کرم دین کے ہاں پہنچ گئی۔

محلے کے لوگ ایک دوسرے سے اس قدر جڑے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے کی ذرا سی تکلیف کا سن کر بھی فوراً پہنچ جاتے، کرم دین نے عائشہ کو خاموش کروا دیا تھا، ورنہ وہ ایک دو بار اور چیختی تو محلے کے لوگ اسی وقت اپنے اپنے بستر چھوڑ کر وہاں آجمع ہوتے، مگر جس کسی کے کانوں میں بھی چیخوں کی آواز پڑی تھی وہ خیریت جاننے کے لیے آگیا تھا، کرم دین کے ہاں آنے والوں کی زیادہ تعداد مردوں کی تھی، چاچی خبری نے آتے ہوئے کچھ اور خواتین کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

''خیر تو تھی عائشہ! رات کو تمہارے چیخنے کی آوازیں کیوں آ رہی تھیں؟'' چاچی خبری نے برقعہ اتار کر ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے سوال کیا۔

عائشہ جواب تک سر جھکائے چارپائی پر بیٹھی تھی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اسے روتے ہوئے دیکھ کر چاچی خبری تڑپ اٹھی اور جلدی سے اس کے پاس جا بیٹھی پھر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ''کیا ہوا میری بچی تو اس طرح کیوں رو رہی ہے؟''

''میرا عامر مر گیا چاچی۔'' عائشہ نے روتے ہوئے بتایا۔

''ہائے ...... ہائے ...... ہائے ...... یہ کیسے ہو گیا؟'' چاچی نے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے دریافت کیا۔

''رات کو اچھا بھلا سویا تھا چاچی ......بس ایک دو بار خون کی الٹیاں کیں اور پھر کچھ دیر میں ہی میرے ہاتھوں میں ٹھنڈا ہو گیا۔''

عائشہ کی بات سن کر محلے کی عورتیں رونے پیٹنے لگی تھیں، کچھ ہی دیر بعد محلے میں بچے کی موت کی خبر پہنچ

گئی تھی، بچے کی موت کا اعلان مسجد میں بھی کروادیا گیا تھا مگر اعلان سے پہلے ہی دور و نزدیک یہ خبر پھیل چکی تھی۔

بچے کے غسل سے لے کر کفن دفن تک کے تمام معاملات کرم دین نے خود اپنے ہاتھوں انجام دیے تھے، کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں کسی وجہ سے بچے کی موت کی اصل حقیقت محلے والوں کی نظر میں نہ آ جائے، جب تک بچے کو قبر میں اتار کر اس کی قبر نہ بنا دی گئی، اس وقت تک کرم دین پریشان رہا مگر جب تمام معاملات بخیر و خوبی انجام پا گئے تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔

☆☆☆☆☆

بچے کی موت نے کرم دین کے سارے پروگرام خاک میں ملا دیے تھے، وہ جلد از جلد تمام وظائف اور عملیات ختم کر کے اپنا چلہ پورا کرنا چاہتا تھا، مگر بچے کی وجہ سے اسے اپنے عملیات ادھورے چھوڑ کر اٹھنا پڑا تھا، اس نے بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ذرا سی کامیابی حاصل کر لی تھی مگر اب اسے پھر سے عملیات کا آغاز کرنا تھا لیکن عائشہ اسے ایسا کرنے سے منع کر رہی تھی۔ کرم دین کو یہ کہاں برداشت تھا کہ کوئی بھی اس کی کامیابیوں کی راہ میں روڑے اٹکائے، وہ کچھ روز تک انتہائی نرمی سے عائشہ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر جب بات بنتی دکھائی نہ دی تو سختی پر اتر آیا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا...... تم یہ مت سوچو کہ میں اپنے ارادوں سے باز آ جاؤں گا کیونکہ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا اور ویسے بھی اگر کسی ڈر یا خوف کی وجہ سے مجھے یہ کام نہ کرنا ہوتا تو میں یہ سلسلہ شروع ہی نہ کرتا۔'' کرم دین نے عائشہ کو سمجھاتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ان چیزوں سے تمہیں کیا ملے گا کرم دین؟ ایک بچہ تو ہم گنوا بیٹھے ہیں اور میں بھی کسی نہ کسی طرح صبر کر چکی ہوں اب تو اپنے ارادوں سے باز آ جاؤ۔''

''عائشہ! میری ایک بات یاد رکھنا...... مجھے دولت چاہیے۔ میں گھٹ گھٹ کر بہت جی لیا، اب اور جیا نہیں جاتا۔''

عائشہ جان چکی تھی کہ اب کرم دین کسی بھی طرح اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ زبردستی اس سے اپنی بات منوا پائے گی، پھر بھی اسے سمجھانے لگی ''کرم دین اگر تم یہ سب کرنا ہی چاہتے ہو تو چلو ایسا کر لو، اسی کمرے کے کسی کونے میں چادر تان کر بیٹھ جاؤ ہم میں سے کوئی بھی تمہیں تنگ نہیں کرے گا، کم از کم اس طرح ہمیں تسلی رہے گی کہ تم ہمارے پاس ہی ہو۔''

''عائشہ! اپنے مشورے بس یہیں ختم کرو اور اسی کمرے کی جھاڑ پونچھ کر دو میں آج ہی سے اپنا کام شروع کر دینا چاہتا ہوں۔'' کرم دین نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

کرم دین کا دوٹوک فیصلہ سن کر عائشہ خاموش ہو گئی اور اس کی ہدایات کے مطابق کمرے کی صفائی کے بعد وہاں بچھی ہوئی چادریں وغیرہ تبدیل کر دیں۔

(جاری ہے)

